Title - ~~Am~~ AMEER KHUSRO

Creator - Mohd. Waheed Mirza.

Publisher - Hindustani Academy (Allahabad)

Date - 1929

Pages - 344

Subjects - Tazkira Shora - Farsi - Ameer Khu Khusro, Ameer - Sawaneh.

امیر خسرو

طوطی ہند حضرت امیر خسرو دہلوی کے حالات زندگی
اور ان کی تصانیف پر ایک تنقیدی نظر
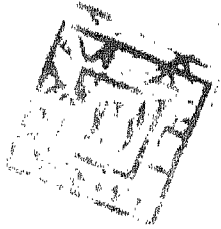
از :

محمد وحید مرزا
صدر شعبۂ عربی و تہذیب و تمدن اسلامی ،
جامعۂ لکھنؤ

الہ آباد :
ہندستانی اکیڈیمی یو - پی
۱۹۴۹ء

Published by
THE HINDUSTANI ACADEMY, U. P.
ALLAHABAD.

~~Price Rs.~~ 3

Printed at
THE MODERN PRINTING WORKS,
ALLAHABAD.

فہرست مضامین

صفحہ

حصۂ دوم : تصنیفات

فہرست کتب

دیباچہ

ایک سال سے کچھ زائد عرصہ ہوا کہ ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کی طرف سے یہ فرمائش کی گئی تھی کہ میں امیر خسرو پر اردو میں ایک کتاب لکھوں، چونکہ میں اِس سے پہلے امیر خسرو پر ایک تصنیف انگریزی میں کر چکا تھا، جسے سنہ ۱۹۲۹ع میں میں نے لنڈن یونیورسٹی کی پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کی، اس لئے اِس مضمون پر دوبارہ کچھ لکھنا ایک حد تک تحصیل حاصل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ایک طرف تو ارباب ہندستانی اکیڈیمی کا پاس خاطر ملحوظ تھا اور دوسری طرف یہ خیال باعث ترغیب ہوا کہ میری انگریزی تصنیف تک بعض اہل ذوق کی رسائی نہیں ہوسکتی، اِس کے علاوہ اگرچہ اردو میں اس سے پہلے احمد سعید صاحب مارہروی امیر خسرو پر ایک کتاب "حیات خسرو" کے نام سے لکھ چکے تھے اور مولانا شبلی نعمانی نے بھی ایک چھوٹا سا

مقالہ" "بیان خسرو" کے نام سے شائع کیا تھا اور یہ دونوں تصنیفیں اپنی جگہ یقیناً بہت قابل قدر بھی ہیں' لیکن اِن میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور بعض واقعات کے بیان کرنے میں نادانستہ طور پر سہو ہوگیا ہے' لہذا واقعی اِس کی ضرورت تھی کہ کوئی ایسی کتاب اردو میں لکھی جائے جس میں تمام حالات اور واقعات کو پوری تحقیق اور احتیاط کے ساتھ پیش کیا جائے - اسی لیے ہندوستانی اکیڈیمی کی دعوت کو لبیک کہتے ہوئے میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کر دی جو آج پایۂ تکمیل کو پہنچ کر اہل علم کے پیش نظر ہے -

یہ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں میں نے اپنی انگریزی تصنیف سے بہت کچھ مدد لی ہے - لیکن اسے انگریزی تصنیف کا ایک روکھا پھیکا ترجمہ نہ سمجھنا چاہیے - واقعات اور حقائق زیادہ تر وہی ہیں لیکن ترتیب اور اسلوب بیان جداگانہ ہے - تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں زیادہ اِختصار سے کام لیا گیا ہے اور خسرو کے منثور اور منظوم کلام کے نمونے زیادہ دیے گئے ہیں - انگریزی تصنیف کے متن اور حاشیے میں جو باتیں براہ راست خسرو سے متعلق نہ تھیں اُنہیں زیادہ تر اِس کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے' لیکن یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی ضروری بات نہ رہ جائے - غرض یہ کہ اختصار کے ساتھ جامعیت کو نباہنے کی کوشش کی ہے - اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی یا ناکامی ہوئی' اس کا فیصلہ اصحاب ذوق و نظر ہی کر سکتے ہیں - اپنی گوناگوں خامیوں کا مجھے پورا احساس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی قارئوں سے درگزر اور چشم پوشی کی امید بھی ہے - اسی طرح کتاب کی زبان کو جہاں تک ہوسکا

سادہ اور عام فہم رکھا گیا ہے تاکہ ہر طبقے کے لوگ اس سے فائدہ اُٹھاسکیں اور اگر کہیں اس عام اصول سے انحراف پایا جاتا ہے تو اُس کی وجہ محض یہ ہے کہ بعض مضامین میں سادگی کے ساتھ ادبی رنگ قائم رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو جاتا ہے، جسے وہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہیں اردو میں کسی علمی موضوع پر کچھ لکھنے کا اتفاق ہوا ہو -

انسانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں سیکڑوں نام ایسے افراد کے ملیں گے جنھوں نے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں شہرت حاصل کی اور جنھوں نے اپنی شخصیت اور ذاتی قابلیت کی مدد سے اپنا نام ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا - ان میں سے کوئی تو حکومت اور سیاست کے میدان میں گوے سبقت لے گیا، کسی نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مشعل نبوت روشن کر کے اپنے نام کو چار دانگ عالم میں چمکا دیا، اور کسی نے علم اور فن کے چشمے سے سیراب ہوکر حیات جاوید حاصل کی - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان مشہور اور معروف ہستیوں میں ایسے افراد کم نظر آئیں گے جنہیں قبول عام حاصل ہوا اور جن کا نام محض تاریخ کے اوراق پر نہیں لکھا گیا بلکہ انسانوں کے دلوں پر نقش ہو کر نسلاً بعد نسل زندہ رہا، جن کی شخصیت نہ صرف زمانے کی قید سے آزاد تھی بلکہ کسی ایک دائرے میں محدود بھی نہ تھی، جن کے جاننے والے اور جن کے مداح ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں، اور جن کا ذکر ہر

ادنیٰ اور اعلیٰ کی زبان پر جاری ہے - اِس عام مقبولیت کے اسباب کا تجزیہ کوئی آسان کام نہیں، اس لیے کہ یہ متفرق حالات اور واقعات کا نتیجہ ہوتی ہے جن کا عرصہ گزر جانے کے بعد سراغ ملنا دشوار ہو جاتا ہے' لیکن اگر ہم اس قسم کے آدمیوں کی زندگی پر ایک گہری نظر ڈالیں تو ایک چیز ہمیں اُن میں ضرور مشترک نظر آئے گی اور وہ یہ ہے کہ اُن کی سر گرمی' خواہ وہ زیادہ‌تر زندگی کے ایک شعبے ہی سے متعلق کیوں نہ رہی ہو' محض اُسی شعبہ تک محدود نہ تھی بلکہ زندگی کے متعدد شعبوں پر حاوی تھی - اُن کی فطرتی قابلیت میں ہمہ‌گیری اور ان کی طبیعت میں ایک ایسی نیرنگی تھی جو صرف تلون مزاج پر مبنی نہ تھی بلکہ جس کا سرچشمہ انسان کی وہ کوشش ناتمام تھی جو اُسے زندگی کے اسرار کی تہ تک پہنچنے پر ابھارتی ہے اور اُس میں اس جامعیت کی خواہش پیدا کرتی ہے جو دراصل انسانوں سے ایک بالاتر ہستی یعنی ذات باری تعالیٰ ہی میں نمودار ہو سکتی ہے' لیکن جس کی ہلکی سی جھلک انسان میں بھی' جسے خدا نے دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا اور جس کو اُس نے خود اپنی ہی صورت میں خلق کیا' نظر آسکتی ہے -

اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ ایک غیرمطمئن دل اور ایک بے چین طبیعت رکھتے تھے' وہ فرسودہ روشوں اور پامال راہوں پر قدیم اور موروثی روایتوں کے مطابق گامزن رہنے سے قانع نہ ہو سکتے تھے' اور جدت پسند دماغ کسی نئی طرح اور کسی انوکھی وضع کی تلاش میں رہتا تھا' اور آخرکار اسی شوق جامعیت اور جذبۂ ایجاد کے بل پر

وہ اپنے ہم‌عصر انسانوں ہی پر نہیں، بلکہ ہر زمانے کے آدمیوں پر فوقیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگر بالفرض ان میں سے کسی کو قسمت نے مسند حکومت پر بٹھایا اور تاج سلطنت سے سر افراز کیا تو اس نے حکومت کی کایا پلٹ دی، اس نے نہ صرف رعایا کی فلاح اور آسائش کے لیے نئے قاعدے اور نرالے ڈھنگ اختیار کئے بلکہ اپنے آپ کو اور انسانوں کا سا ایک انسان سمجھ کر اُن کمالات اور ستودہ صفات کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جو اس کے منصب بادشاہت سے براہ راست متعلق نہ تھیں، اُس نے علم اور ہنر کو خود حاصل کیا اور ارباب علم کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی، وہ اپنی رعایا کا سچا دوست بن کر اُن کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ یا اگر اُسے قسام ازل سے شمشیر سپہ‌گری اور سپر دلاوری ملی تو اُس نے اپنی ہمت کا منتہاے نظر محض دشمنوں کی صفوں کو اپنے بےباک حملوں سے زیر و زبر کرنا اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے اپنے گرزگراں کو بلند کرنا خیال نہ کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حلم اور بردباری، سخاوت اور ایثار کی اچھی خصلتوں کو بھی اپنا شعار بنایا، اور فن سپہ‌گری کے وہ طریقے اختیار کئے جو اُس سے پہلے موجود نہ تھے، اور اگر بالفرض خدا کی طرف سے اسے مشتری کا طیلسان یا کلک عطارد عطا ہوئی تو اس کے نرم اور نازک ہاتھ صرف خامۂ مشک فشاں سے صفحۂ کاغذ پر گل‌کاری نہ کر سکتے تھے بلکہ تیغ اصفہانی کے جوہر سے چہرۂ زمین کو بھی گل‌گوں بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انگریزی کی ایک مثل کے مطابق یہ صحیح ہے کہ تنوع

کمال کا منافی ہے، لیکن یہ مثل عام قابلیت اور اوسط درجے کی استعداد رکھنے والے انسانوں پر ہی صادق آتی ہے۔ صدیوں میں افلاک کی گردش دوام سے کوئی نہ کوئی ایسی جامع شخصیت پیدا ہو ہی جاتی ہے جو اس عام قاعدے سے بالاتر ہوتی ہے، اور یہی امتیاز اُس صاحب کمال کے لیے عالمگیر شہرت اور ابدی ناموری کا باعث بن جاتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک امیر خسرو بھی تھے۔

خسرو کا شمار عام طور پر شعراء کی صف میں ہوتا ہے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان کی زیادہ تر توجہ شاعری ہی کی طرف رہی، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ صرف شاعر نہ تھے۔ اُن کا امیر کا خطاب ہی صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُنہیں شاہی ملازمت بھی حاصل تھی اور جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے اسی وجہ سے وہ ایک سے زیادہ فوجی مہموں میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی پر انقلاب زندگی میں سات بادشاہوں کو یکے بعد دیگرے دہلی کے تخت پر بیٹھتے دیکھا تھا اور ان میں سے چار بادشاہوں کے دربار میں اُن کی رسائی نہ صرف بحیثیت ایک مدح گو شاعر کے بلکہ ایک بذلہ سنج ندیم اور خوش بیان مصاحب کے بھی رہی۔ اس کے علاوہ اپنی آخر عمر میں حضرت نظام الدین اولیا سے با قاعدہ بیعت کے بعد اُن میں تصوف اور درویشی کا وہ جذبہ جو موجود تو ہمیشہ ہی سے تھا لیکن بعض اور رجحانوں سے دبا ہوا تھا، نمایاں ہوگیا اور اپنے پیر و مرشد سے اُنہیں وہ خصوصیت حاصل ہو گئی جو اور کسی ارادت مند کو نصیب نہ ہوئی

ہوں - یہ تعلق جہاں بہت حد تک امیر خسرو کے کلام کے مقبول خاطر ہونے کا باعث بنا وہاں اُس نے اُن کی شخصیت میں تقدس کا ایک خاص رنگ بھی پیدا کر دیا اور اس طرح شاعری اور امیری کے ساتھ ولایت بھی اُن کا طرۂ امتیاز بن گئی - موسیقی اور شاعری کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر موسیقی داں بھی ہو، مگر امیر خسرو نے موسیقی میں ایسی مہارت پیدا کی کہ کئی نئی طرزیں ایجاد کیں، اور عام روایت کے مطابق، معروف ساز ''ستار'' بھی انھی کی ذہانت طبع سے وجود میں آیا - تحصیل علم میں بھی وہ اپنے کسی ہمعصر سے پیچھے نہیں رہے، بلکہ زباندانی میں تو شائد ہی کوئی اُس زمانے میں اُن کا مقابلہ کر سکتا ہو اِس لیے کہ وہ فارسی کے علاوہ ترکی، عربی، ہندی، سنسکرت اور ہندوستان کی اور کئی زبانوں سے واقف تھے اور بعض ایسے علوم بھی جو عوام کے لیے ایک راز سربستہ رہے ہیں، مثلاً نجوم، رمل اور سحر وغیرہ، وہ بھی اُن کی ہمہ گیر توجہ سے نہ بچ سکے - لیکن میرے خیال میں جو چیز امیر خسرو کے نام کو سب سے زیادہ عام بنانے کا باعث ہوئی وہ اُن کی ظرافت طبع، اُن کی حاضر جوابی اور اُن کی قوت مطابقت تھی - وہ جدھر کا رخ کرتے تھے لوگ اُن کی آؤبھگت کرتے تھے اِس لیے کہ وہ سوسائٹی کے جس طبقے میں بھی چلے جاتے تھے اپنے آپ کو اُسی طبقے کے افراد کی ذہنیت کے مطابق بنا سکتے تھے، اگر بادشاہ کے دربار میں شعر و شاعری کی بحثوں میں حصہ لیتے تھے تو اپنے پیر کی مجلس میں فقر اور تصوف، فلسفے اور حکمت کے دقائق کی موشگافی

کرتے تھے، اگر مولویوں اور پنڈتوں سے مذہب اور دھرم کے مسائل پر مناظرہ کرسکتے تھے تو سیدھے سادھے شہریوں اور اُجڈ دیہاتیوں کو خوش کرنے کے لیے پہیلیاں، مکرنیاں، چھند اور دوھے بھی برجستہ کہہ سکتے تھے، خالق باری کی تصنیف کا موقع یا پنگھٹ پر چار سہیلیوں کی فرمائش پر ایک بیت میں کھیر، چرخے، کتے اور ڈھول کو موزونیت سے بیان کرنے کا قصہ جس طرح مولانا آزاد کی کتاب "آب حیات" میں نقل ہوا ہے (۱) ممکن ہے کہ کسی نا قابل اعتماد روایت پر مبنی ہو، لیکن امیرخسرو کے متعلق اس قسم کی روایتوں کا عوام میں رائج رہنا بجائے خود ان کی شخصیت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے اور ہمارے نظریے کا شاہد - امیرخسرو کی یہ صفت اور صلاحیت ہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی جنھیں کبھی ان کے فارسی کلام کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا اگر ملے بھی تو وہ اس کلام کو سمجھنے یا اس کی خوبیوں کی قدر کرنے سے قاصر ہیں، ان کے نام سے واقف ہیں اور ان کی عظمت کے معترف، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سوائے شیخ سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو اور جس کا نام بچے بچے کی زبان پر ہو - اسی لیے امیرخسرو کے سوانح حیات کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اُن کے کردار کے ان سب پہلوؤں کو مد نظر رکھنا چاہیے کیونکہ بغیر اس کے ہم اُن کی اصل عظمت اور غیر معمولی ذہانت کو پوری طرح سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے - چنانچہ آئندہ صفحات کے لکھنے

(۱)۔۔۔آب حیات (ص ۶۵ - ۷۱) -

میں میں نے ان تمام امور کا حتی الامکان خیال رکھا ہے اور خسرو کی ہر خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے' اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکا اُن کے حالات زندگی کے بیان کرنے میں خود ان کی اپنی تصانیف سے مدد لی ہے اور اگر کہیں بعض حالات اور واقعات کی تفصیل یا توضیح کے لئے اور کتابوں کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ التزام رکھا ہے کہ یا تو خسرو کے ہم عصر مصنفین کی تحریروں سے مدد لی جائے یا بعد کے زمانے کے ایسے لکھنے والوں کی تصانیف سے جن کے بیانات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے - خسرو جہاں اور لحاظ سے خوش قسمت تھے وہاں اس معاملے میں بھی خوش نصیب رہے کہ ان کی زیادہ تر تصانیف خود ان کے اپنے ہاتھوں اُن کی زندگی میں مدون ہوگئی تھیں اور ان میں سے بعض تصانیف کے دیباچوں میں انھوں نے اپنے متعلق بہت سی بیش قیمت معلومات آئندہ نسلوں کے لئے مہیا کر دی ہیں' یہی وجہ ہے کہ خسرو کی زندگی کے متعلق آج جتنی واقفیت ہمیں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی اُن کے کسی اور ہم عصر کے متعلق معلوم نہیں ہوسکتا بلکہ ان میں سے بعض کا تو ہم صرف نام ہی جانتے ہیں حالانکہ بظاہر اپنے زمانے میں وہ لوگ بھی خاصی شہرت اور اہمیت رکھتے تھے - یہاں تک کہ خواجہ حسن سجزی کے حالات زندگی بھی' سوائے چند جزئیات کے' اب تک ہمیں معلوم نہ ہوسکے' اگرچہ اُن کا ایک دیوان دستبرد زمانہ سے محفوظ رہا اور ہمارے پاس موجود ہے -

۲۶ مئی ۱۹۴۵ع — محمد وحید مرزا

مقدمہ

ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتداء' ہندوستانی اور ایرانی شاعری کا موازنہ

ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعلق مختلف نقادوں کا مختلف خیال رہا ہے - یورپ کے زیادہ تر مستشرقین' جن میں پروفیسر براؤن خاص طور پر قابل ذکر ہیں' یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں جو شاعری ہندی نژاد شعراء کی دماغ سوزی اور کاوش طبع سے ظہور میں آئی اُس میں اور ایران کی فارسی شاعری میں بہت فرق ہے - اُن کے خیال میں ہندوستانی شاعری میں نہ تو زبان کی وہ لطافت ہے جو ایرانی شاعری میں پائی جاتی ہے اور نہ اُسلوب بیان کی وہ سلاست اور روانی' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستانی شاعری ایرانی شاعری کا ایک پھیکا سا خاکہ اور ایک بے رنگ نقل ہے - (۱) بدقسمتی سے بعض مشرقی نقاد بھی خصوصاً وہ

(۱) براؤن - Persion Literature under the Tartass (ص ۱۰۷)

جو ایرانی نسل سے ہیں، یورپ کے مستشرقین کی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں - برخلاف اس کے بعض اور لوگ جنھوں نے ہندوستان کی فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جو اس کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ سے واقف ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص زمانے تک ایران اور ہندوستان کی فارسی شاعری میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا اور بعد میں اگر فرق پیدا ہوا، جو حالات اور واقعات کی بنا پر ناگزیر تھا، تو یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کون سی شاعری قابل ترجیح ہے یا کم از کم یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستانی شاعری ادنیٰ ہے اور ایرانی شاعری اُس سے بہت برتر؛ ان دونوں میں سے کون سی رائے صحیح ہے اور کون سی غلط، اِس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں ایرانی شاعری کی بنیاد کس زمانے میں اور کن حالات میں قائم ہوئی -

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فارسی شاعری خود ایران میں بھی دراصل کچھ بہت قدیم زمانے میں ظہور میں نہیں آئی اِس لیے کہ بنوسامان کے عہد سے پہلے بظاہر ایران میں موجودہ فارسی شاعری کا وجود نہ تھا، اگرچہ بعض تذکرہ نویسوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی داغ بیل ساسانی دور میں پڑ چکی تھی لیکن اس قسم کی روایتیں یقیناً ناقابل اعتماد ہیں - دوسری بات جو ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ آج جس خطۂ زمین کو ہم ایران کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کے حدود بہت بعد کے زمانے میں یعنی صفوی، بلکہ

قاچار خاندان کے زمانے میں قائم ہوئے تھے۔ اس زمانے سے لے کر جب عربوں نے ایران کو فتح کیا غزنوی سلطانوں کے عہد تک موجودہ ایران بڑی بڑی سلطنتوں کا ایک جزو رہا اور اس کے کوئی خاص حدود معین نہ ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں سامانیوں کے عہد میں جب فارسی زبان کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آہستہ آہستہ ایک ادبی زبان بن کر عربی کی جگہ لینا شروع کی تو اس کی نشو و نما کا مرکز محض ایران نہ تھا بلکہ وہ تمام وسیع علاقے تھے جن میں ایک طرف اگر عراق عرب اور افغانستان شامل تھے تو دوسری طرف خراسان اور ماوراءالنہر۔ اس لیے کہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے یہ سب ملک ایک تھے بلکہ ان میں ایک گہری معاشرتی یکانگت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ آپس کے تجارتی تعلقات کی بنا پر تاجروں کا برابر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آنا جانا، امراء کا ایک دوسرے سے میل جول، شاعروں اور دوسرے ادیبوں اور عالموں کی ایک دربار سے دوسرے دربار میں رسائی، یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ جو معاشرتی اور ادبی غیریت کو اگر کوئی ایسی غیریت موجود تھی، دور کر سکتی تھیں۔ اس لیے ہمارے پاس یہ سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ جو فارسی زبان مثلاً شیراز میں رائج تھی وہ اس سے بہت مختلف تھی جو بلخ اور بخارا میں بولی جاتی تھی اور اگر بالفرض عام بول چال کی زبان میں کوئی مقامی خصوصیتیں تھیں بھی تو کم از کم ادبی زبان میں اس قسم کا کوئی خاص امتیاز نہیں ہو سکتا تھا۔

جب بارھویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں غزنوی خاندان کا چراغ گل ہوگیا اور وہ سلطنت جسے محمود غزنوی نے فروغ دیا تھا گردش زمانہ سے غوریوں کے ہاتھ لگی تو علاء الدین جہاں سوز کے جانشینوں کو ہندوستان کی فتح کا خیال آیا۔ محمود غزنوی نے اپنی زندگی میں متعدد بار ہندوستان پر فوج کشی کی، لیکن اس کے حملے ایک آندھی کی طرح تھے جو گزر گئی، یا ایک بگولے کی مانند تھے جو اپنے راستے میں تباہی پھیلاتا ہوا غائب ہوگیا، پنجاب کے ماسوا اس نے کبھی ہندوستان کے کسی اور حصے کو باقاعدہ اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ محض اس مال غنیمت پر قانع رہا جو اسے ہر مہم میں ہندوستان کے زرخیز علاقوں سے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ مگر غوری خاندان کے دو بھائیوں یعنی محمد غوری اور شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے زیادہ تر شمال مغربی حصے کو باضابطہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور ان کے بعد ان کے ایک غلام قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد مضبوطی سے قائم ہوگئی، جس کا مرکز دہلی کا قدیم شہر بن گیا۔ اس طرح گویا ہندوستان میں فارسی شاعری کا آغاز غزنوی دور میں ہوا اور جب تک دہلی فتح نہ ہوا تھا پنجاب کے شہر خصوصاً لاہور اس شاعری کا بڑے مرکز رہے۔ چنانچہ اس زمانے کا ایک بڑا شاعر ابوالفرج رونی لاہور کے قریب ایک گاؤں رون کا باشندہ تھا۔ اس شاعر نے کافی شہرت حاصل کی اور سلطان مسعود بن ابراہیم اور اس کے عہد کے امراء کی تعریف میں اس نے بہت سے

قصائد لکھے تھے، جن میں سے بعض اب تک محفوظ ہیں - کئی قدیم تذکرہ نویس اسے استاد اور افضل الفضلاء کے القاب سے یاد کرتے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ رونی نے شاعری میں بہت بلند مرتبہ پایا تھا [۱] - اسی طرح اس کا ایک ہمعصر شاعر، جو ابوالفرج سے بھی زیادہ مشہور ہے، یعنی مسعود بن سعد بن سلمان بھی لاہور ہی میں پیدا ہوا؛ اس شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے تین دیوان اپنی یادگار چھوڑے تھے جن میں سے ایک عربی میں تھا، ایک فارسی میں، اور ایک ہندی میں، اگرچہ اب صرف فارسی دیوان موجود ہے اور باقی دو دیوانوں کا کہیں پتہ نہیں چلتا [۲] - ان دونوں شاعروں سے پہلے لاہور کے ایک اور ابو عبداللہ نکتی کا ذکر بھی اکثر تذکروں میں ملتا ہے، لیکن اس شاعر کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ سلطان شہید یعنی سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے زمانے میں تھا -

جب دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو قدرتی طور پر بادشاہ کے دربار کے ساتھ ساتھ ارباب علم و ہنر نے بھی دہلی کا رخ کیا، غزنوی سلطنت کے ختم ہو جانے پر غزنین کے شہر کو اب کوئی خاص اہمیت حاصل نہ رہی تھی، اس لئے وہاں کے صاحب کمال، جو دور دور سے وہاں آ کر جمع ہوئے تھے، اب ہندوستان کی طرف کھنچنے لگے اور دہلی کے دربار کی رونق بڑھانے لگے،

(۱)—دیکھئے بدایونی ج ۱ (ص ۷۳۷) لب‌الالباب ج ۲ (ص ۲۴۱) اور چہار مقالہ (ص ۱۳۲ -)

(۲)—دیکھئے چہار مقالہ (ص ۱۲۰ — ۱۲۵)

اُس زمانے کے مشہور شعرا میں تاج الدین خاص طور پر قابل ذکر ہے جو سلطان التمش کے عہد میں تھا - اس شاعر نے دھلی میں فروغ پایا اور غالباً وہیں کا باشندہ تھا - دو اور شاعر جن کے متعلق ہمیں کچھ معلومات حاصل ہیں شہاب الدین' عرف شہاب مہمرہ اور عمید الدین تھے' ان میں سے پہلے بدایوں کے اور دوسرے سنام کے رہنے والے تھے جو سامانہ کے قریب ریاست پٹیالہ میں ایک قدیم تاریخی مقام ہے' انہی شعرا کے جانشین امیر خسرو اور خواجہ حسن تھے جن کے نام پر نہ صرف دھلی بلکہ تمام ہندوستان کو ناز ہے اور بجا طور پر ہے اس لئے کہ ان کے مقابلے کے شاعر ایران کی شاعرخیز زمین نے بھی کم پیدا کئے ہیں اور ہندوستان میں تو اُس وقت سے اب تک چھ سو سال کے طویل عرصے میں کوئی ایسا فارسی گو شاعر نہیں پیدا ہوا جو ان کی برابری اور همسری کا دعوی کر سکے -

ہندوستان میں فارسی شاعری کے ارتقا کے اس مختصر تبصرے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس شاعری کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب ایران اور ہندوستان کے درمیان میں نہ تو جغرافیائی اور سیاسی حدود حائل تھے اور نہ ادبی اور معاشرتی' گویا فارسی زبان کی بہترین روایات جن میں شیرۂ شیراز کی چاشنی بھی تھی اور نبات سمرقند کا ذائقہ بھی' ہندو کش اور سندھ کو پار کر کے پہلے لاہور پہنچیں اور پھر وہاں سے دہلی' ان روایتوں کو قائم اور برقرار رکھنے کے وہ گہرے تعلقات ضامن تھے جو ایران اور ہندوستان میں اس زمانے میں تھے اور مغل بادشاہوں کے زمانے تک برابر رہے - اور بالفرض اگر مرور زمانہ سے ہندوستان کی فارسی زبان میں تھوڑا سا

نمک ہندی بھی شامل ہو گیا تو اس کی وجہ سے یقیناً نہ تو زبان کی خوبی زائل ہوئی اور نہ فارسی شاعری کی ضرب‌المثل شیرینی میں کوئی خلل واقع ہوا - خصوصاً امیر خسرو اور خواجہ حسن جیسے شاعروں کے متعلق تو ہم یہ وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ اُن کی زبان ویسی ہی پاکیزہ اور خالص تھی جیسی کہ ایران کے بڑے بڑے شعرا کی - اور اگر کہیں خسرو کے کلام میں ہندیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو وہ فارسی محاورے سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی جدت‌پسند طبیعت اور وطن‌پرستی کے اس جذبے کے سبب سے پیدا ہوئی جس کا اظہار وہ اکثر اپنے کلام میں کرتے ہیں - ورنہ اُن کی نظم کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ایران کے نقادوں نے بھی اُن کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور خود سعدی شیرازی نے اُن کے کلام کی تعریف کی - بلکہ خواجہ حافظ نے بھی جب یہ شعر بنگالے کے حاکم غیاث الدین کو لکھ کر بھیجا کہ -

شکر شکن شوند همه طوطیان هند

زین قند پارسی که به بنگاله می رود

تو یقیناً اُن کے ذہن میں طوطیِ هند امیر خسرو کا ہی خیال تھا -

لیکن ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی اگر کوئی ہندوستان کی قدیم فارسی شاعری کو حقارت کی نظر سے دیکھے تو اِسے سوائے ہٹ دھرمی کے کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اگر اس قسم کی رائے رکھنے کے لیے کوئی عذر ہو سکتا ہے تو وہ یا تو حقیقت سے ناواقفیت اور یا قومی تعصب ہی ہو سکتا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو رائے اس طرح قائم کی جائے وہ اہل بصیرت کے نزدیک ہرگز قابل اعتبار نہیں ہو گی -

حصۂ اول

(سوانح حیات)

—— :o: ——

پہلا باب

خسرو کا حسب و نسب، ان کے اجداد کا ہندوستان میں ورود، ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

بارھویں صدی عیسوی کا زمانہ عالم اسلامی کے لیے بعض لحاظ سے انتہائی عروج کا وقت تھا - تہذیب اور تمدن کا وہ شاداب چمن جس کو مسلمان حکمرانوں اور علما اور فضلا نے اپنی ان‌تھک کوششوں اور بے‌مثل جاں‌فشانی سے صدیوں تک سینچا تھا، اس زمانے میں اپنی پوری بہار پر تھا اور ابھی وہ طوفان بلا، وہ تباہ کن آندھی یعنی چنگیزخاں کی یورش جس نے اس لہلہاتے ہوئے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، چلنا شروع نہ ہوئی تھی - اسلامی سلطنت کا پرانا مضبوط شیرازہ ضرور بکھر چکا تھا اور یہ عظیم‌الشان سلطنت جس کی نظیر فلک پیر نے بھی کم دیکھی ہوگی، الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی - بغداد کے خلیفہ سرکش اور زبردست امرا کے ہاتھ میں کٹھ‌پتلی بن کر رہ گئے تھے اور

دارالسلام کی چار دیواری کے باہر ان کا سیاسی اثر یا حکومت محض برائے نام رہ گئی تھی - لیکن پھر بھی خلیفہ کی مذہبی سیادت زیادہ تر مسلمان ملکوں میں تسلیم کی جاتی تھی اور ان ملکوں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا - مشرقی ممالک کے شہر، خصوصاً سامانی اور غزنوی حکمرانوں کی علم دوستی اور علم پروری کی وجہ سے نہ صرف تجارت اور مال و دولت کا گھر تھے بلکہ علم اور فن کے بھی بڑے مرکز بن گئے تھے، غزنین، بلخ، بخارا، خیوا، شیراز، اصفہان، غرض بیسیوں ایسے شہر تھے جو شان و شوکت میں بغداد سے ہمسری اور دمشق سے دلکشی کا دعویٰ رکھتے تھے، جن کی مسجدوں کے مینار اور محلوں کے برج آسمان سے باتیں کرتے تھے، جن کی بڑھتی ہوئی آبادی اُن کی چار دیواری میں نہ سماتی تھی، جہاں دور دور سے سیاح اور طالب علم کھنچے چلے آتے تھے اور جن کی زمین حقیقت میں سونا اگلتی تھی -

یہ سب کچھ تھا لیکن سلطنت کا مختلف بادشاہوں میں تقسیم ہو جانا قدرتی طور پر آپس کی رقابت کو فروغ دیتا تھا، اور اگر یہ رقابت محض علمی اور ادبی میدانوں تک محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا شوق اکثر ان حکمرانوں کو میدان جنگ میں بھی لا کھڑا کرتا تھا - اس لئے اگر ایک طرف انہیں بے دریغ روپیہ صرف کر کے اپنے دربار میں عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو جمع کر لینے کا سودا رہتا تھا تو دوسری طرف اپنے حریفوں کے مقابلے اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے فوجی

انتظامات اور جنگی ساز و سامان تیار رکھنے کا فکر بھی دامن گیر رھتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان ملکوں میں ایک سیاسی اور فوجی نظام قائم ھوگیا تھا جو یورپ کے قرون وسطیٰ کی ''فیوڈ لزم'' سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا - ھر ایک امیر کا یہ فرض تھا کہ وہ لڑائی کے موقع پر اپنے بادشاہ کو ایک مقررہ تعداد سپاھیوں کی مہیا کر کے دے اور ان سپاھیوں کے اخراجات کا ذمہ دار ھو، اب وہ زمانہ نہ رھا تھا کہ ھر ایک مسلمان سپاھی ھو اور ضرورت کے وقت اپنی خوشی سے دشمنوں کے خلاف ھتھیار اٹھانے کے لیے آمادہ اور تیار رھے - بلکہ کچھ سپاھی تو مستقل طور پر فوج میں ملازم رکھے جاتے تھے اور کچھ لڑائی کے موقع پر بھرتی کر لیے جاتے تھے بعض علاقوں اور قوموں کے لوگ خاص طور پر فوجی ملازمت کے لیے پسند کیے جاتے تھے، اور ان قوموں میں ترکوں کو بنوعباس کے ابتدائی دور ھی سے اپنی دلیری اور شجاعت کی بنا پر خاص امتیاز حاصل ھوچکا تھا - اس لیے کہ عباسی خلفا کو جب سرکش عربوں اور ایرانیوں کو دبانے کی ضرورت محسوس ھوئی تو ان کی نظر انھیں جفاکش اور جنگجو لوگوں پر پڑی، اور واقعہ یہ ھے کہ ترکوں نے تھوڑے ھی عرصے میں اپنی سپہ گری کی دھاک تمام عالم اسلامی میں باندھ دی اور آگے چل کر وہ عربوں کی بجائے اسلام کے سب سے بڑے حامی اور مددگار بن گئے -

ترکوں کی آبادی وسط ایشیا میں دور دور تک پھیلی ھوئی تھی، یہ لوگ امن کے زمانے میں سیدھے سادھے دیانتدار کسانوں کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے، لیکن جنگ کے

وقت جوق جوق فوجوں میں بھرتی ہوکر داد شجاعت دیا کرتے تھے، ماوراءالنہر کے ترک خصوصاً اپنی بہادری کے لئے مشہور تھے۔ چنانچہ الاصطخری ان کے متعلق لکھتا ہے کہ، اسلامی قوموں میں ان ترکوں کی طرح کفار سے لڑنے والی کوئی اور قوم نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ماوراءالنہر کے چاروں طرف کفار کی آبادی ہے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ان ترکوں سے بڑھ کر کوئی جری قوم نہیں ہے......وہ کافر ترکوں کے خلاف اسلام کی پشت و پناہ ہیں......بہادری کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں کی اطاعت اور اپنے بڑوں اور برابر والوں کی خدمت کرنے میں بھی یہ لوگ سب سے بڑھ کر ہیں......اسی لیے خلفا کو یہ ترغیب ہوتی تھی کہ اپنی فوجوں کے لئے ان ترکوں میں سے سپاہی لیں......اور اس طرح ماوراءالنہر کے کسان اُن کی فوجوں کے قائد، اُن کے خدام اور ان کے پسندیدہ مصاحب بن گئے تھے"۔ (۱)

اس زمانے کے نظام کے مطابق سپاہیوں کی تقسیم دہائیوں میں ہوتی تھی، سب سے چھوٹی فوجی جماعت دس سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھی، اس کے بعد سو، ہزار، پانچ ہزار وغیرہ کی جماعتیں ہوتی تھیں، غرض یہ کہ فوج کا ہر ایک حصہ دس یا دس کے ضعف پر مبنی ہوتا تھا اور اسی تعداد کے لحاظ سے فوجی افسروں کے عہدے معین ہوتے تھے۔ یہ نظام ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے زمانے میں برابر قائم رہا، چنانچہ امرا کے منصب، مثلاً پنج ہزاری یا ہفت ہزاری، اسی مناسبت سے ہوتے تھے، عثمانی ترکوں میں یہ نظام فوج

(۱)—الاصطخری (ص ۲۸۶ - ۲۸۷)

اب تک قائم ہے۔ ان کے افسروں کے خطاب "اون باشی"، یوزباشی، بیگ باشی" اس کے شاہد ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اعشاری تقسیم میں ہزار کے عدد کو خاص اہمیت حاصل تھی اور مختلف علاقوں سے لڑائی کے موقع پر ایک ایک ہزار کی تعداد میں آدمی لیے جاتے تھے، اور ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ ہزارہ کہلاتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں امیر خسرو کا یہ شعر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ :--

گر ز دشمن بود ہزار سوار　　چشم تو مہر ان ہزارہ بود

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ یا "ہزارہ" جس علاقے سے لیا جاتا تھا اسی علاقے کے نام سے پکارا جاتا تھا یا بعض صورتوں میں اپنے قبیلے کے سردار یا مورث اعلیٰ کے نام سے منسوب ہوتا تھا، اور عرصہ گزر جانے کے بعد جب وہ فوجی نظام درہم برہم ہو چکا تھا، اور یہ ضروری نہ رہا تھا کہ کوئی خاص قبیلہ کسی امیر کے ماتحت ہو اور جنگ کے زمانے میں اپنا ہزار کا دستہ بھیجتا ہو، تو بھی قبیلے کا قدیم نام "ہزارہ" باقی رہا۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جہاں کوئی "ہزارہ" جا کر آباد ہو گیا وہ علاقہ بھی ہزارہ کہلانے لگا، چنانچہ ہندوستان کے شمالی مغربی حصے میں جو علاقہ ہزارہ کے نام سے موسوم ہے، اُس کی وجہ تسمیہ غالباً یہی ہے کہ کسی زمانے میں، بہت ممکن ہے کہ اس زمانے میں جب چنگیز خاں نے بہادر مگر بدنصیب جلال الدین خوارزمی کے تعاقب میں ہندوستان کا رخ کیا تھا، کچھ ہزارہ قبیلے یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔

انہی جنگجو ہزارہ ترکوں میں سے خسرو کے والد امیر

سیف الدین محمود ہی تھے - خسرو کے سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ وہ ترک تھے اور ان کے قبیلے کا نام ہزارۂ لاچین تھا (۱) اور خسرو خود اپنے کو کئی جگہ خسرو لاچین کے نام سے یاد کرتے ہیں - لاچین ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی باز یا شاہین کے بھی ہوتے ہیں اور غلام کے بھی - خسرو کے اپنے ایک بیت کی بنا پر بظاہر دوسرا مفہوم زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - کہتے ہیں کہ :-

خنہ کہ در عہد تو سلطان سخن ، خسرو لاچین سلطانی شدہ است

گویا لفظ لاچین اور سلطانی سے صفت تضاد پیدا کرنا چاہتے ہیں -

بہر حال اس لفظ کا مفہوم اتنا اہم نہیں ہے جتنی یہ بات کہ لاچین کس کا نام تھا - کسی علاقے کا نام تو ظاہر ہے لاچین ہو نہیں سکتا ' کسی آدمی ہی کا نام ہوگا - زیادہ تر تذکرہ نویس اس کے متعلق خاموش ہیں لیکن ایک ادیب نے لکھا ہے کہ لاچین امیر خسرو کے والد کا نام تھا - یہ روایت قابل قبول نہیں معلوم ہوتی' اس لیے کہ امیر خسرو نے اپنے والد کا نام ہمیشہ سیف الدین یا محض سیف ہی لکھا ہے ' یہ ضرور ہے کہ امیر سیف الدین اپنے قبیلے کے سردار تھے لیکن اس کی کوئی معتبر شہادت موجود نہیں ہے کہ قبیلے کا نام یعنی ہزارۂ لاچین انہی کے نام پر تھا - زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاچین ان کے کسی بزرگ کا نام تھا جو کسی زمانے میں اپنے قبیلے کے سردار رہے ہوں گے ' خسرو لاچین کی

---

(۱) مثلاً دیکھیے دولت شاہ (ص ۲۳۸) نفحات الانس (ص ۲۱۰) خزانۂ عامرہ (ص ۲۰۹) سفینۃ الاولیا (ص ۱۶۸) وغیرہ -

ترکیب پر ابنی اضافت کا گمان یقیناً ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کی اضافت صرف باپ ہی کی طرف نہیں بلکہ کسی جد یا مورث اعلیٰ کی طرف بھی ہو سکتی ہے - (۱)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قبیلے یعنی ہزارۂ لاچین کا اصلی وطن کہاں تھا اور کس زمانے میں یہ قبیلہ ہندوستان میں آکر آباد ہوا - دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ ایک روایت کے مطابق ان کا اصلی وطن کش کا شہر تھا جو اب قبۃ الخضرا کے نام سے مشہور ہے لیکن بعض اور روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہزارۂ لاچین سے تھے جو قرشی اور مایمرغ کے نواح میں آباد تھا اور ہنگامۂ چنگیزی کے زمانے میں یہ لوگ ماوراء النہر سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں آ کر مقیم ہو گئے تھے (۲) - لیکن اس کے بر خلاف زیادہ تر سوانح نگار، جن میں سے بعض کا بیان عام طور پر دولت شاہ کے بیان سے زیادہ معتبر سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً جامی اور مرزا حسین بایقرا، یہ لکھتے ہیں کہ چنگیز خاں کے زمانے میں یہ لوگ بلخ اور اس کے آس پاس آباد تھے اور وہاں سے ہندوستان وارد ہوئے - ان دونوں روایتوں میں سے میں دولت شاہ کے بیان کو قابل ترجیح سمجھتا ہوں، اس لیے کہ امیر خسرو اپنے کلام میں بلخ اور بخارا کے شہروں اور وہاں کے باشندوں کا جنہیں وہ بالائی کہتے ہیں، اکثر حقارت آمیز طریقے اور تضحیک کے پیرائے میں ذکر کرتے

(۱)— حواشی چہار مقالہ، مرزا محمد (ص ۱۳۲) -

(۲)—دولت شاہ (ص ۲۳۸) اس بیان میں لفظ مایمرغ غلطی سے پایمرغ چھپ گیا ہے -

میں، علاوہ ازیں کش، مایمرغ اور قرشی جن کا دولت شاہ نے ذکر کیا ہے، سب ماوراء النہر کے صوبے میں ہیں اور اس علاقے کے ترک خاص طور پر وہ جنگی صفات رکھتے ہوے جو ہزارۂ لاچین میں پائی جاتی تھیں اور جن کا ثبوت امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود نے ہندوستان میں اپنے جوہر شجاعت دکھا کر دیا - اگرچہ ان دونوں روایتوں میں ایک صورت مطابقت کی یوں پیدا کی جا سکتی ہے کہ ہزارۂ لاچین کا اصل وطن کش، مایمرغ اور قرشی کو مان لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ بعد میں، یعنی ہندوستان آنے سے کچھ عرصہ پہلے، یہ قبیلہ بلخ کے گرد و نواح میں آکر مقیم ہوگیا تھا - کش ماوراء النہر کا ایک خاصا قدیم اور مشہور شہر ہے، اس لیے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے - یہ شہر ایک چھوٹی سی ندی کشکا رود کے کنارے واقع ہے، بعض اور چھوٹی چھوٹی ندیاں، جیسے نہارسود، جاں رود، اور خضر رود بھی اس کے قریب ہی سے بہتی تھیں، ابن حوقل کے زمانے میں یہاں ایک قلعہ اور مضبوط چار دیواری تھی، کئی ندیوں کے قرب کی وجہ سے کش کے گرد و نواح کا علاقہ بہت زرخیز تھا - امیر تیمور کے زمانے میں اس شہر کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اس لیے کہ امیر تیمور یہیں پیدا ہوا تھا اور غالباً اسی تعلق کی وجہ سے اس نے اس شہر کو ازسر نو تعمیر کرا کے اس میں ایک شاندار محل بنوایا تھا جس کا نام آق سرای (سفید محل) تھا اور جس میں وہ اکثر آکر ٹھہرا کرتا تھا - غالباً اسی زمانے میں اس شہر کا عام نام شہر سبز ہوگیا جیسے دولت شاہ نے قبۃ الخضرا میں

تبدیل کر دیا ہے - ماپرنخ بھی کش کے نواح ہی میں ایک مقام کا نام تھا انہیں قرشی جیسے عرب اکثر نسف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور ایرانی زیادہ تر نخشب لکھتے ہیں - کش سے کوئی سو میل جنوب کی طرف واقع ہے، چنگیز خاں کے بعد ایک مغل شہزادے نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا تھا اور اسی مناسبت سے اس شہر کا نام قرشی مشہور ہوگیا -

ہزارۂ لاچین کے ہندستان میں آنے کا صحیح زمانہ معین کرنا مشکل ہے لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ یہ قبیلہ چنگیزخاں کے زمانے یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا - ہندوستان میں اس وقت تک قطب الدین ایبک کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا ایک غلام شمس الدین التمش دھلی کے تخت پر متمکن تھا - اس قابل بادشاہ نے تاج حکومت سنبھالتے ہی اپنا اقتدار اور اثر تمام شمالی ہندوستان میں قائم کر لیا تھا اور اپنے حریفوں کو جن میں سے سب سے زیادہ زبردست تاج الدین یلدوز اور ناصرالدین قباچہ حاکم ملتان تھے زیر کرنے کے بعد بنگال کے خلجیوں کو بھی وہاں کی حکومت سے نکال باہر کیا تھا - ان مہموں کے لیے اسے بہادر سپاہیوں کی ضرورت تھی اور اس طرح امیر سیف الدین محمود نے بھی مع اپنے ساتھیوں کے اس بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی اور دھلی کے قریب ہی ایک مقام پٹیالی میں جسے مومن آباد یا مومن پور بھی کہتے ہیں اور جو دریاے گنگا کے کنارے واقع ہے مقیم ہو گئے - بہت ممکن ہے کہ پٹیالی ان کی جاگیر میں شامل ہو اگرچہ اس کا کوئی ذکر کسی سوانح نگار یا مؤرخ نے نہیں کیا - برنی نے صرف یہ لکھا ہے کہ انھیں بارہ سو

تنکہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا (۱) - لیکن یہ ظاہر ہے کہ اپنے قبیلے کا سردار ہونے کی حیثیت سے انھیں کوئی نہ کوئی بڑا منصب ملا ہو گا اور اس کے ساتھ، جیسا کہ عام قاعدہ تھا، جاگیر بھی، خسرو کے اپنے بیانات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر سیف‌الدین، التمش کے عہد میں کوئی بڑی حیثیت رکھتے تھے اور اس بادشاہ کو ہندوستان کی تسخیر اور اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے میں اُنھوں نے بہت مدد دی تھی، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ :-

جہان بقوت او می گرفت التمش
که برکشیده خدایش ز قبضهٔ قدرت

اس کے علاوہ چونکہ خسرو اپنے والد کو اکثر سیف شمسی یا سلطانی شمسی کے نام سے یاد کرتے ہیں تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ التمش کے خاص امیروں میں سے تھے - لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہمیں اُن کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں -

ہندوستان میں آنے کے بعد امیر سیف‌الدین نے عمادالملک کی ایک بیٹی سے شادی کی اور اسی شادی سے ۶۵۱ھ یعنی ۱۱۹۳ء میں امیر خسرو پٹیالی میں پیدا ہوئے - امیر خسرو کے ہندوستان میں پیدا ہونے کے متعلق کسی قسم کا شبہہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ تقریباً سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں، سوائے اس کے کہ ایک تذکرہ نویس یعنی والہ داغستانی نے یہ لکھ دیا ہے کہ وہ بلخ سے اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آئے تھے (۲)، لیکن اگر اس بیان سے کسی

(۱)--- برنی (ص ۱۹۷) - (۲)--- تذکرہ -

کے دل میں کوئی شبہہ پیدا ہو تو وہ امیر خسرو کے اپنے بیانات سے دور ہو سکتا ہے - مثلاً ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

ہست مرا مولد و ماوی و وطن

خسرو (۱) کے دو بھائی اور تھے جن میں سے ایک کا نام عزالدین علی شاہ تھا - یہ غالباً خسرو سے بڑے تھے کیونکہ خسرو ان کا ذکر اکثر عزت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں - خسرو ان کی عربی اور فارسی کی قابلیت کی تعریف بھی لکھتے ہیں لیکن ان کے متعلق ہمیں اور صرف یہ معلوم ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال پر بڑے بیٹے کی حیثیت سے ان کے جانشین ہوئے - تیسرے بھائی جو خسرو سے سن میں چھوٹے تھے حسام الدین قتلغ تھے - انھوں نے علم و ادب میں بظاہر کوئی خاص ناموری حاصل نہیں کی بلکہ سپاہی پیشہ آدمی تھے - اور اپنے آباء و اجداد کے نام کو انھوں نے اپنے قلم کے زور سے نہیں بلکہ تلوار کے جوہر دکھا کر روشن کیا تھا - چنانچہ خسرو اپنی مثنوی ''مجنون و لیلیٰ'' میں ان کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں -

شہسواری میں وہ ایک دلیر باز کی طرح تھے..... لڑائی کے فن میں وہ پوری مہارت رکھتے تھے اور اسی لیے بادشاہ نے انھیں حسام الدین (دین کی تلوار) کا خطاب دیا تھا - حملے میں وہ اپنے والد کی طرح دلیر تھے' میری طرح نہیں کہ میری تلوار ٹوٹ چکی' چونکہ انھوں نے اپنے والد کے فن میں ایسی مہارت پیدا کرلی تھی،

---

(۱)—خسرو کا پورا نام بعض تذکرہ نویسوں نے یوں لکھا ہے - ابوالحسن یمین الدین خسرو -

اس لئے وہ اب انہی کی سر زمین (یعنی ملک عدم) میں جا بسے ہیں، انہوں نے اپنی جان اپنے والد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دے دی اور ان کے مرنے کا رنج میرے دل کو نصیب ہوا''۔

بہر حال یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ تینوں بھائیوں میں خسرو ہی سب سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے اور بچپن سے ہی اپنی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دینے لگے تھے بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ خسرو جب پیدا ہوئے تو ان کے والد انہیں ایک خرقے میں لپیٹ کر ایک بزرگ کے پاس لے گئے اور ان بزرگ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ، امیر محمود تم ایک ایسے بچے کو میرے پاس لائے ہو جو بڑا ہوکر خاقانی سے بھی سبقت لے جائے گا (۱)۔ یہ روایت ممکن ہے صحیح ہو، ممکن ہے غلط ہو، لیکن خسرو نے اپنے دیوان ''دیباچۂ الصغر'' کے مقدمے میں اپنے بچپن کے جو بعض دلچسپ حالات لکھے ہیں اُن سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا مادہ ان میں پیدائشی تھا اور بہت چھوٹی عمر میں وہ ایسی آسانی سے شعر موزوں کر لیتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر لکھتے ہیں (اس وقت اُن کی عمر دس سال سے زائد نہ تھی) کہ ان کے استاد قاضی اسد الدین جو اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے، انہیں اپنی ہمراہی میں قاضی عز الدین کے گھر لے گئے۔ یہ قاضی صاحب علم اور فضل میں بڑی شہرت رکھتے تھے جب یہ لوگ اُن سے ملنے کو گئے تو وہ نظم کی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ قاضی اسدالدین نے ان سے کہا

---

(۱)۔۔۔فرشتہ وغیرہ۔

کہ یہ چھوٹا بچہ، میرا شاگرد، بھی شاعری میں بہت بلند پروازی کرتا ھے، ذرا اس سے بھی ایک دو شعر پڑھوا کر دیکھیے، اس پر عزالدین نے ایک کتاب خسرو کے ھاتھ میں دے دی اور پڑھنے کو کہا - خسرو نے ایسی شیریں اور مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا کہ سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری ھو گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - اس کے بعد قاضی اسد الدین نے کہا کہ شعر پڑھ لینا تو کوئی بڑی بات نہیں - آپ اس سے کہیے کہ کچھ شعر خود کہہ کے بھی سنائے تاکہ اس کی ذھانت کا امتحان ھو سکے - اس پر خواجہ عزالدین نے چار متفرق چیزوں کے نام لیے جن میں بظاھر کوئی مناسبت نہیں یعنی مو، بیضہ، تیر اور خربزہ اور کہا کہ ان کو ایک رباعی میں موزوں طریقے سے بیان کرو - خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی -

ھر موی کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضۂ عنبرین بران موی ضم است
چون تیر مدان راست دلش را زیرا
چون خربزہ دندانش میان شکم است

رباعی سن کر خواجہ، انگشت بدنداں رہ گئے اور اُنھوں نے خسرو کی بے انتہا تعریف کی - اس کے بعد اُنھوں نے خسرو سے اُن کا نام دریافت کیا اور پھر اُن کے والد کا، والد کا نام خسرو نے سلطانی شمسی بتایا - یہ سن کر خواجہ کہنے لگے کہ "چونکہ تمھارے والد کا نام سلطانوں سے نسبت رکھتا ھے اس لیے تمھارا تخلص سلطانی ھونا چاھیے - یہ تخلص تمھارے لیے فال نیک ثابت ھوگا - کسی شاعر نے اب تک

خواہ وہ کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو اقلیم سخن میں ایک درہم سے زیادہ وقعت حاصل نہیں کی - سارے زمانے کا سکہ " سلطانی " دو درہم کے برابر ہے - اس لیے تم یقین رکھو کہ تمہاری شہرت اور مقبولیت اور سب شعرا سے دوگنی ہوگی -"

امیر سیف الدین محمود بظاہر صرف تلوار کے دھنی تھے - وہ سپاہیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس لیے انھیں نہ تو اس کا موقع تھا اور نہ اتنی فرصت کہ میدان علم میں بھی کوئی غیرمعمولی کارنامہ دکھا سکیں ' بلکہ خسرو نے تو انھیں اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں " امی " یعنی ناخواندہ یا ان پڑھ لکھا ہے - لیکن خسرو کی ذہانت اور تحصیل علم کا شوق دیکھ کر انھوں نے ان کے لیے تعلیم کا بہترین انتظام ' جیسا کچھ بھی اس زمانے میں ممکن تھا ' ضرور کیا ہوگا - اس سلسلے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں کیونکہ خسرو نے خود بھی اپنے صرف ایک استاد قاضی اسد الدین خطاط کا ہی ذکر کیا ہے ' جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے - قاضی اسد الدین خوشنویسی میں کمال رکھتے تھے اور اسی لیے خسرو ایک بیت میں اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں -

گیسوے تو ہمچو خط خواجہ است کہ در وے
آسان نتواند کہ نہد سر پسر انگشت

اس کے ساتھ ہی اُن کا قاضی کا لقب یا خطاب یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خوشنویسی کے علاوہ اور علوم میں بھی دسترس رکھتے تھے - مگر یہ یقینی بات ہے کہ قاضی عزالدین کے علاوہ اور بعض قابل اور ذی‌علم اساتذہ خسرو کی ابتدائی تعلیم کے

لیے مقرر کیے گئے ہوں گے کیونکہ خسرو اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ اُن کی تمام تر کوشش یہی رہی کہ میں بےحاصل کچھ حاصل کر لوں - اس زمانے تک ہندوستان میں بڑی تعداد میں عالم اور فاضل اساتذہ جمع ہو چکے تھے اور دربار سے تعلق کی وجہ سے امیر محمود کو اُن میں سے اکثر سے ملنے کا موقع ملتا رہتا ہوگا - اس لیے اپنے ہونہار بیٹے کی موزوں اور مناسب تعلیم کے لیے اُن سے بڑھ کر اور کسے موقع مل سکتا تھا ' خسرو کی علمی استعداد کے متعلق ذرا آگے چل کر میں زیادہ تفصیل سے لکھوں گا لیکن خسرو کے اپنے بیان سے یہ پایا جاتا ہے کہ بچپن میں اُن کی اپنی توجہ اور طبیعت کا میلان اور علوم کی نسبت' شاعری کی طرف بہت زیادہ تھا - ایک جگہ لکھتے ہیں " میرے والد مجھے مکتب بھیجا کرتے تھے لیکن میں ردیف اور قافیے کے چکر ہی میں رہتا تھا - میرے قابل استاد سعدالدین محمد خطاط' جو عام طور پر قاضی کے لقب سے مشہور تھے' مجھے خوش نویسی سکھانے کی کوشش کیا کرتے تھے لیکن میں مہ جبینوں کے خط کی تعریف میں شعر کہتا رہتا تھا اور اپنے استاد کی پوری کوشش کے باوجود جو طرۂ یار کی طرح' دراز اور مسلسل تھی میں زلف اور خال کے شوق سے باز نہ آتا تھا' - " (۱)

خسرو کے اِس بیان سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ابتدا ہی سے شعر شاعری کا غیر معمولی شوق تھا وہاں یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ خسرو نے کم از کم آغاز عمر میں زیادہ

(۱) دیباچۂ تحفۃالصغر -

ٹھوس اور زیادہ سنجیدہ مطالعے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، شاعر کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے، جو شخص ہر وقت اپنے خیالات میں محو رہتا ہو، جس کے دماغ میں ہر وقت بیسیوں حسین شکلیں بنتی ہوں اور بگڑتی ہوں، جس کی نظر اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے بے نیاز ہوکر اُس حسن ازلی کو نا معلوم فضاؤں میں تلاش کرتی رہتی ہو، جس کا پرتو دنیا کی ہر ایک خوبصورت چیز میں موجود ہے، اسے پنج گنج یا ہدایہ کے درسوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور کافیہ اور کنز کے اوراق میں اس کے لیے کیا دلکشی پائی جا سکتی ہے اور اسی لیے میرا خیال یہ ہے کہ خسرو نے جو کچھ بھی علمی استعداد پیدا کی، جس کے قابل قدر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں، نہ تو وہ خشک کتابوں کے صفحوں پر دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے انہیں حاصل ہوئی اور نہ استادوں کی مدد سے - بلکہ زیادہ تر ان کی اپنی فطرتی ذہانت اور ارباب علم کی صحبت کا فیضان تھا جس نے انہیں اپنے زمانے کے ان تمام علوم اور فنون میں جن کا جاننا ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا شہرۂ روزگار بنا دیا تھا - خود فن شاعری میں بھی جہاں تک ہماری تحقیق کام دیتی ہے وہ کسی کے رہین منت نہ تھے اور نہ کبھی انہوں نے کسی شاعر سے با قاعدہ اصلاح لی - اپنی بعض تصانیف میں وہ ایک ہم عصر عالم شہاب الدین کا ضرور ذکر کرتے ہیں کہ اُن سے بعض نظموں میں اُنہیں اصلاح ملی لیکن یہ بزرگ کون تھے، یہ کہنا مشکل ہے اور بظاہر خسرو کا اُن سے

اصلاح لینا زیادہ تر تیمن کے طور پر تھا نہ کہ با قاعدہ شاگردی کے طریقے پر' اس لیے کہ خسرو کے بیان سے اُن بزرگ کا تقدس اور تبحر علمی زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور فن شعر میں مہارت کم۔ کیونکہ اکثر خسرو انھیں امام یا امام شہاب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بعض سوانح نگاروں نے ان شہاب الدین کو شہاب مہمرہ سمجھا ہے' لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے۔ اِس لیے کہ شہاب مہمرہ سلطان التمش کے بیٹے اور جانشین رکن‌الدین ابراہیم کا ہم‌عصر تھا اور اس بادشاہ کی تعریف میں اُس کے متعدد قصیدے موجود ہیں۔ اس بادشاہ کو ۶۳۴ ھ میں معزول کر کے قید کر دیا گیا تھا اور اُس کے تھوڑے عرصے بعد ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ گویا شہاب مہمرہ کے عروج کا زمانہ خسرو کی پیدائش سے کوئی ۱۹ سال پہلے گزر چکا تھا اور اس طرح اگرچہ یہ ممکن ہے کہ وہ خسرو کے سن بلوغ کو پہنچنے تک زندہ ہو' لیکن اِس کا امکان بہت ہی کم ہے کہ وہ خسرو کے عین عروج کے وقت' یعنی علاءالدین خلجی کے زمانے میں زندہ تھا اور دھلی میں موجود تھا' حالانکہ خسرو نے جن شہاب الدین کا ذکر کیا ہے اُن سے خسرو کو جو کچھ مدد یا اصلاح ملی وہ اسی زمانے میں ملی' کیونکہ وہ اُن کا تذکرہ ایک تو خاص طور پر ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں کرتے ہیں جو ۶۹۵ ھ میں مرتب کیا گیا اور ایک ''ہشت بہشت'' میں جس کا سنہ تالیف ۷۰۱ ہجری ہے۔ اور اسی دیباچے میں خسرو لکھتے ہیں کہ '' مولانا شہاب‌الدین مہمرہ و مولانا بہاءالدین بخاری کہ ہر یکے بستان علم را بلبلے بودہ اند'' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شہاب مہمرہ کا ۶۹۵ ھ سے قبل

انتقال ہو چکا تھا، اس کے علاوہ خسرو کے اس شعر سے بھی کہ :-

در مداران (بدایون) مست برخیزد شہاب مہمرہ
بشنود از نغمۂ مرغان دہلی گر نوا

یہ نتیجہ آسانی سے نکل سکتا ہے کہ اول تو خسرو کے زمانے میں شہاب مہمرہ زندہ نہ تھا اور دوسرے یہ کہ اُس کا شمار اُن کے زمانے کے شعرائے دہلی (مرغان دہلی) میں نہ تھا - اِس لیے خسرو کو شہاب مہمرہ کا شاگرد سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا ' باقی رہے مولانا شہاب‌الدین تو ممکن ہے کہ یہ وہی شاعر ہوں جن کا ذکر برنی نے اور فرشتہ نے علاءالدین خلجی کے عہد کے شعرا میں شہاب صدرنشین کے نام سے کیا ہے - جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں - خسرو نے اُن کی علمی قابلیت اور عربی دانی کی بہت تعریف کی ہے اور اعجاز خسروی میں ایک خط پورا عربی میں اُن کے نام لکھا ہے - وہ شاعر ضرور تھے کیونکہ خسرو کہتے ہیں " کہ اگر اُنھیں اپنے کلام کو جمع کرنے کا خیال آتا..." لیکن بظاہر شاعری میں اُنھوں نے زیادہ نام پیدا نہیں کیا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ کہیں بھی اُن کے کلام کے نمونے دستیاب نہ ہو سکتے - اس لیے میرا خیال یہی ہے کہ خسرو نے اُن سے علمی استفادہ وقتاً فوقتاً ضرور کیا لیکن شاعری میں اُن کے آگے باقاعدہ زانوے شاگردی کبھی نہ نہیں کیا - اس خیال کو خسرو کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ انھی مولانا شہاب‌الدین نے اور اُن کے دو اور دوستوں یعنی علاءالدین علی شاہ اور تاج‌الدین زاہد نے اُنھیں نہ صرف اپنا کلام جمع کرنے کی ترغیب دی بلکہ اس کام میں اُن کی اعانت بھی کی تھی -

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ خسرو شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے' اگر اُنہیں اس کا خیال بھی آتا تو اُن کی جدت پسند طبیعت غالباً اسے گوارا نہ کرتی کہ وہ اُستادی شاگردی کے قدیم سلسلے کا اپنے کو پابند بنا کر اپنے فطرتی ذوق اور رجحان پر بیجا قیود عائد کرلیتے - بر خلاف اس کے فن شعر میں مہارت حاصل کرنے کا انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے پرانے اور مشہور اساتذہ کے کلام کو پڑھنا شروع کیا اور ان میں سے جس کا کلام پسند آیا اسی کی مخصوص طرز میں خود بھی شعر کہنے لگے' ظاہر ہے کہ ان کی نظر انتخاب پہلے ایران کے بڑے بڑے شاعروں ہی کی طرف اُٹھی' اُس زمانے میں سعدی زندہ تھے' خاقانی' سنائی اور انوری کا دور ختم ہوچکا تھا' کمال خجندی کا بھی خاصا شہرہ تھا اور وہ "خلاق معانی" کے لقب سے مشہور تھے - خسرو نے انہی استادوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اِن سب کا رنگ بہت جھلکتا ہے - اپنی اس ابتدائی مشق کے متعلق خسرو دیباچۂ "تحفۃ الصغر" میں خود یوں لکھتے ہیں -

"میں بارہ سال کا تھا مختلف قسم کی شاعری کی بنیاد میرے دماغ میں مستحکم ہوگئی' جب اُس زمانے کے شاعروں اور علما نے فن شعر میں میری مہارت دیکھی تو وہ حیران رہ گئے اور ان کی یہ حیرانی میرے لیے مزید فخر کا باعث ہوگئی' کیونکہ میرا کلام سن کر وہ میری بہت تحسین و آفرین کیا کرتے تھے - لیکن مجھے اس قسم کی ہمت افزائی کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی' کیونکہ مجھے اس دل کش

فن کا اتنا خبط ہوگیا تھا کہ صبح سے شام تک قلم کی طرح میرا سر جھکا رہتا تھا اور رات دن میری آنکھیں اوراق کی سیاہی اور سفیدی پر جمی رہتی تھیں تاکہ میں عقل و دانش اور ذوق صحیح میں شہرت حاصل کر سکوں۔ کبھی کبھی میرے ہم عصر استاد میرے ہنر کی آزمائش کیا کرتے تھے اور میں اپنا کمال ان کے سامنے اپنی زبان قلم کی فصاحت سے دکھایا کرتا تھا، چونکہ کسی ایسے مشہور استاد نے کبھی میری تربیت نہ کی تھی جو مجھے شاعری کے رموز اور دقائق بتا سکتا اور میرے قلم کو گمراہی کے راستوں پر پڑنے سے روک سکتا، یا اس خوبی کو نمایاں بنا سکتا جو میری برائیوں میں دبی پڑی تھی، اس لئے میں نے کچھ عرصے تک وہی کیا جو طوطے کو بولنا سکھانے کے لئے کیا جاتا ہے، یعنی میں نے اپنے سامنے خیال کے آئینے کو رکھا اور ان شعلوں سے جن کا عکس اس آئینے میں پڑتا رہا، میں نے شاعری سیکھنا شروع کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے دماغ کے آئینے کو صیقل کوشش سے جلا دی اور ان مختلف انواع شعر کا مطالعہ کیا جو قوت تخیل سے پیدا ہو سکتے ہیں اور بڑے بڑے اساتذہ کے کلام کو برابر دیکھتا رہا۔ ان کے کلام میں مجھے جہاں شیرینی نظر آئی میں نے لے لی اور اس طرح آخرکار شاعری کا حقیقی ذوق مجھے حاصل ہوگیا، جب میں نے انوری اور سنائی کا کلام پڑھا تو میرا دل اور میری آنکھیں روشن ہوگئیں اور جہاں کہیں بھی مجھے کوئی نظم آب زر کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دی، میں نے اس کا جوہر رواں کی طرح پیچھا کیا، جو دیوان بھی مجھے مل سکا میں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اس کی نقل بھی اپنے ہاتھ سے محفوظ کی۔"

دوسرا باب

بلبن کا عہد، عمادالملک کے زیر سایہ خسرو کی تربیت،
کشلو خان اور شہزادۂ بغرا خان سے اُن کی وابستگی

شعر شاعری کی یہ مشق ابھی کچھ زیادہ ترقی نہ کرنے پائی تھی کہ خسرو کے والد، امیر سیف الدین محمود اس دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر، اُن کے اپنے بیان کے مطابق صرف آٹھ سال کی تھی اور اگرچہ "تحفۃ الصغر" کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ -

"اس کمسنی میں بھی کہ جب میرے دودھ کے دانت ٹوٹ رہے تھے اشعار میرے منہ سے موتیوں کی طرح جھڑتے تھے"۔

یہ ظاہر ہے کہ اُن کی شاعرانہ پرواز ایک ایسے نوخیز پرند کی اُڑان سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی جس کے ابھی ٹھیک سے پر بھی نہ نکلے ہوں - لیکن یہ ضرور ہے کہ شاعری کے ذوق اور تحصیل علم کے شوق کی بنیاد اُن کی طبیعت میں راسخ ہو چکی تھی۔

اور یہ زیادہ تر اُن کے والد کی پدری شفقت اور تربیت ہی کا نتیجہ تھا - اپنے والد کے اس احسان کو خسرو نے کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ اُس زمانے میں بھی کہ جب اُن کے کمال کا شہرہ دور دور ہو چکا تھا' اُن کے دل میں اپنے والد کے لیے ایک گہرا جذبہ شکر اور امتنان کا موجود رہتا' چنانچہ "غرۃالکمال" کے دیباچے میں کہتے ہیں کہ "میری مٹی میں اُنہی کا بویا ہوا بیج ہے جو اب پھل پھول رہا ہے" -

امیر سیف الدین محمود کے انتقال کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں لیکن غالباً وہ کسی لڑائی میں کام آئے - اس لیے کہ خسرو لکھتے ہیں - شہادت کے تلخ گھونٹ کو پینے کے لیے اُنہوں نے اپنی جان شیریں دے دی اور آبِ حیات جاوداں کا جام نوش کر لیا جس کا وعدہ قرآن مجید کی آیت -

بل ہم آحیاء عند ربھم	نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس موجود ہیں -

میں کیا گیا ہے" - خسرو کی عمر اُس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ اس صدمے کی پوری اہمیت کو سمجھ سکتے لیکن ایسے ناسمجھ بھی نہ تھے کہ اُنہیں اتنی کم عمری میں باپ کے سائے سے محروم ہو جانے کا رنج نہ ہوتا اور پھر باپ بھی ایسا کہ جس کے متعلق اُنہوں نے لکھا ہے کہ - " ترک خواب ہی میں فرشتہ ہو سکتا ہے لیکن وہ عالم بیداری میں بھی فرشتہ تھے - عالم بالا سے کبھی کسی نے فرشتے کو آتے ہوئے نہ دیکھا ہو گا' مگر اُن کی طبیعت میں فرشتہ خصلتی ایسی راسخ تھی کہ اُنہوں نے کبھی کسی سیہ چشم حور کے لیے بھی آنکھ سرخ نہ کی تھی' وہ دنیوی

حیثیت سے امیر تھے اور دینی حیثیت سے صاحب ولایت " (۱) - اس لیے جب ہم خسرو کا یہ شعر پڑھیں کہ -

سیف از سرم بوقت و دلم بس دو نیم ماند
دریاے من روان شد و درم یتیم ماند (۲)

تو ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں گزشتہ زمانے کی ایک دھندلی سی یاد کو شاعرانہ تخیل سے تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس میں اُس حقیقی رنج اور یاس کا جذبہ جھلکتا ہے جو ایک بچے کے معصوم دل میں اپنے مہربان باپ یا چاہنے والی ماں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے پر پیدا ہوتا ہے اور جو اُسے جوانی اور بڑھاپے کے لمحات فرصت میں بھی اکثر بےچین کر دیتا ہے -

یہ خسرو کی خوش قسمتی تھی کہ والد کے انتقال کے بعد ان کے نانا عماد الملک ان کے سرپرست بنے، کیونکہ بقول خسرو وہ نانا نہ تھے بلکہ ایک دولت تھے - عماد الملک کا شمار سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے امرا میں ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اس بادشاہ سے بہت پہلے یعنی التتمش کے عہد سے حکومت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے - وہ تیس سال تک عارض ممالک رہے اور التمش کے بعد جو فتنہ و فساد کا دور آیا اس میں امن اور امان قائم رکھنے اور سلطنت کو تباہی سے بچانے کے مشکل کام میں ان کا بہت کچھ حصہ تھا - بلبن کے عہد میں، یعنی اس زمانے میں جب انہوں نے خسرو کو اپنے دامن عاطفت میں لیا وہ عارض راوت یا راوت عرض کے عہدے پر فائز تھے - راوت گجراتی زبان

(۱) — دیباچۂ غرۃ الکمال - (۲) — ایضاً -

میں سوار کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے عارض راوت کے فرائض یہ تھے کہ وہ شاہی سواروں کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں اور اس کا خیال رکھیں کہ ہر ایک سوار کے پاس گھوڑا موجود رہے اور اچھی حالت میں ہو تاکہ لڑائی کے وقت کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عمادالملک کو اب بھی وہی اقتدار حاصل تھا جو اُس زمانے میں تھا جب وہ عارض ممالک تھے۔ چنانچہ خسرو کہتے ہیں کہ 'وہ تخت کے چار ارکان میں سے ایک ہیں' اور اگرچہ کوئی نشان بادشاہت نہ رکھتے تھے' بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا کرتے تھے' اپنی عام داد و دہش سے انہوں نے تمام ہندوستان کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا اور پس پردہ حکومت کے تمام فرائض انجام دیتے تھے۔ اگرچہ بظاہر اپنے عارض کے منصب پر قانع رہے تاکہ فتنہ پرداز حاسدوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔ عجیب راوت عرض تھے کہ ہندوستان کے معاملات کو سر انجام دینے میں اپنی صائب رائی سے جب چاہتے تھے کسی رائے کو اُلٹ کر یار بنالیا کرتے تھے''۔

خسرو کا یہ آخری فقرہ پر معنی ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو راجاؤں وغیرہ سے معاملات طے کرنے کا کام زیادہ تر عماد الملک کے سپرد رہتا تھا اور وہ تھے بھی اس کام کے لئے موزوں' اس لیے کہ خود ہندوستانی تھے۔ اُن کے ہندی نژاد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو خسرو کے اِن اشعار میں موجود ہے کہ :-

ز نسل عارض اسود منم آن نسخت معنی

کز اصل خویشتن یک یک نشانی باز دادم من

سوادی بود ان نازک نوین دیباچۂ دولت
ز نوک کلک تدبیر و بیان ان سواد من
خسان را می‌کنم عزت و گہر را می‌دہم اجرہ
ازان ابر سیہ بین طرفہ دریای کہ زاید من

گویا عمادالملک نہ صرف ہندوستانی تھے بلکہ گورے رنگ
کے بھی نہ تھے - دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ تنبول یعنی پان کے
بے حد شوقین تھے اور ظاہر ہے کہ پان کا شوق اس وقت تک باہر
سے آئے ہوئے لوگوں میں زیادہ عام نہ ہوگا - ہر سال وہ اپنے متعلقین
یعنی دیوان عرض کے سب عہدہ داروں کی پرتکلف ضیافت کیا
کرتے تھے اور اُن سب کو قیمتی خلعت دیا کرتے تھے' سال
بھر بھی اپنے ماتحتوں کو زیادہ تر اپنے ہی باورچی خانے
سے کھانا مہیا کرتے تھے' دیوان عرض میں ہر کھانے کے وقت
پر' پچاس ساٹھ خوان طرح طرح کے لذیذ کھانوں اور شربتوں
سے لدے ہوئے مہمانوں کی خاطر کے لیے آتے تھے' بقول خسرو
ان کے دسترخوان کا کونا دامان قیامت تک دراز تھا -
چونکہ عمادالملک تنبول کے خاص طور پر شوقین تھے اس لیے
ان کے یہاں پان ہمیشہ بہت عمدہ قسم کے اور بہت افراط
سے رہتے تھے - غریبوں کو پان تقسیم کیا کرتے تھے اور اپنی
مجلس میں چاندی چاندی پان منگواتے رہتے تھے اور جب
کبھی خود کھاتے تھے تو ایک ایک پان حاضرین میں سے ہر
ہر ایک کو دیتے تھے' اس کے علاوہ ہر سال اتنے ٹکے اور
جیتل غریبوں کو بانٹتے تھے کہ بقول خسرو دنیا میں کوئی
محتاج ننگا نہ رہتا تھا - سواروں پر خاص مہربانی کیا کرتے
تھے' سالانہ معائنے کے وقت جس سوار کا گھوڑا ساز و سامان

سے اچھی طرح لیس نظر آتا تھا اس کا وظیفہ بڑھا دیا کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ انعام بھی دیتے تھے، اگر کسی حادثے کی وجہ سے کسی سوار کا گھوڑا مرجاتا تھا تو اس کو نیا گھوڑا خریدنے کے لیے اکثر اپنے پاس سے روپیا دے دیا کرتے تھے یا دوسرا گھوڑا اپنے خاص اصطبل سے دے دیتے تھے - اگر کوئی گھوڑا دبلا یا بیمار نظر آتا تھا اور اس کا اطمینان ہو جاتا تھا کہ اُس گھوڑے کے مالک کے پاس اُسے کھلانے پلانے کے لیے دام نہیں ہوں تو یا تو اُس کا گھوڑا خود بدل دیتے تھے اور یا اتنا روپیہ اسے دے دیتے تھے کہ وہ گھوڑے کو اچھی طرح رکھ سکے،

غرض یہی عماد الملک تھے جو اب خسرو کے سرپرست اور نگراں بنے اور ظاہر ہے کہ جب غیروں سے اُن کا یہ سلوک تھا تو خسرو پر اُن کی کیا کیا مہربانیاں نہ رہی ہونگی اور کون سی ایسی نعمت ہوگی جو ان کے لیے نہ مہیا کی ہوگی - یہ زیادہ تر عماد الملک کی توجہ ہی کا نتیجہ تھا کہ خسرو کی تعلیم اور تربیت، جو ان کے والد کے بے وقت انتقال سے ممکن تھا کہ ناقص اور ادھوری رہ جاتی، برابر جاری رہی اور خسرو نے جوانی کی سر زمین میں قدم رکھتے تک اُن تمام علوم اور فنون میں جو اُن کے زمانے میں رائج تھے اتنی دسترس حاصل کرلی کہ احباب و اقران میں انہیں کبھی اپنی جہالت کی وجہ سے شرمندگی کا موقع پیش نہیں آیا - خسرو کی علمی استعداد کا صحیح اندازہ یا تو اُن کے کلام سے کیا جا سکتا ہے اور یا اُن کے اپنے بیانات سے، اُن میں جہاں اور بہت سی خوبیاں نہیں وہاں ایک صاف گوئی

کی صفت بھی تھی اور خصوصاً تعریف و توصیف میں' سوائے
چند ایک موقعوں کے جہاں شاعرانہ زعم میں وہ کچھ کہ گئے
ہیں ' اُنھوں نے کبھی مبالغے سے کام نہیں لیا اور نہ اپنی کسی
کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ۔ اُن کے فارسی اور
ہندی زبانوں میں کامل ہونے میں تو کوئی شبہہ ہی نہیں
ہو سکتا اس لیے کہ اگر فارسی ان کے آبا و اجداد کی زبان
تھی تو ہندی انھیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملی تھی'
اُن دو زبانوں کے علاوہ وہ اور زبانیں بھی ضرور جانتے تھے'
چنانچہ ''نہ سپہر'' میں کہتے ہیں کہ :-

من بزبانہای کسان بیشتری کردہ ام از طبع شناسا گزری
دانم و دریافتہ و گفتہ ہم جستہ و روشن شدہ زان بیش و کم

ان زبانوں میں ظاہر ہے ترکی ضرور شامل ہوگی اس لیے
کہ وہ ترک تھے اور بلخ اور بخارا وغیرہ کے باشندے جہاں
سے ہزارہ لاچین کے لوگ ہندوستان میں آئے' فارسی اور
ترکی دونوں زبانوں ہی سے واقف تھے ' عربی کا تھوڑا
بہت علم پرانے زمانے میں ہر پڑھے لکھے آدمی کے لیے ضروری
تھا اور خسرو کے کلام میں بعض غزلیں عربی کی موجود
ہیں ' ''اعجاز خسروی'' میں اُنھوں نے ایک خط عربی زبان
میں مولانا شہاب الدین کو مخاطب کر کے لکھا ہے اور ''خزائن الفتوح''
میں متعدد مفرد ابیات عربی کے موجود ہیں ' اس لیے
یہ بات یقینی ہے کہ خسرو عربی سے خاصی واقفیت رکھتے
تھے' لیکن یہ کہنا مبالغے سے خالی نہ ہوگا کہ وہ عربی دانی
میں علمائے عرب کے ہمسر تھے یا یہ کہ عربی میں اُنھیں
پوری مہارت حاصل تھی (۱) - برخلاف اس کے وہ خود

۱ــــ شبلی - بیان خسرو -

چالیس سال کی عمر میں لکھتے ہیں کہ اگر انہیں فرصت ملتی تو وہ عربی میں بھی اتنی ہی استعداد پیدا کر لیتے جتنی فارسی میں لیکن ایسے خواب دیکھنے کا جب کوئی موقع نہ رہا تھا - اسی طرح "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں اپنے عربی کلام کو وہ "پارسیانہ مبتدیانہ" بتاتے ہیں اور ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ -

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن

کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو نے یہ جو کچھ کہا ہے از روئے انکسار ہے، لیکن اُن کے ایسا لکھنے سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کو اپنی عربی دانی کا نہ تو کوئی زعم تھا اور نہ وہ اُسے کوئی خاص اہمیت دیتے تھے - بلکہ جو کچھ تھوڑا بہت اُنہوں نے عربی میں لکھا وہ محض تفنن طبع کا نتیجہ تھا یا ممکن ہے کہ اُن حاسدوں کا منہ بند کرنے کے لیے لکھا ہو جو اُن کی عربی سے ناواقفیت کو اُن کی تنقیص اور مذمت کا بہانہ بناتے ہوں، بہرحال میرا یہ خیال ہے کہ خسرو عربی جانتے تو ضرور تھے لیکن اُنہوں نے اُس زبان میں کمال پیدا کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی -

ایک اور زبان جس سے بظاہر خسرو تھوڑے بہت واقف تھے، سنسکرت تھی، کیونکہ اس زبان کا اُنہوں نے "نہ سپہر" میں خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زبان رتبے میں عربی سے تو کم ہے لیکن دری (فارسی) سے بڑھ کر ہے -

وینست زبانی بصفت در دری کمتر از عربی و بہتر از دری

سانسکرت کے علاوہ ہندوستانی [illegible]
سے بھی' جن میں سے بعض کا ذکر انہوں نے "نہ سپہر" میں کیا
ہے' بالکل صحیح ہے کہ [illegible]
کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا ۔

جس طرح خسرو نے کبھی عربی زبان میں کمال حاصل کرنے کی کوئی سعی نہیں کی' اسی طرح وہ کبھی علم عروض کے دائروں کے چکر میں بھی نہیں پڑے اور نہ اپنے دماغ کو اوزان' قوافی' اور زحافات کے گورکھ دھندے کو سلجھانے میں کبھی اونھوں نے پریشان کیا' وہ شاعر ہیں اور فطرتی طور پر موزوں طبیعت رکھتے تھے ۔ شعر کے اوزان پر' اُن کو بغیر کچھ ان کے متعلق مطالعے کئے' اتنی قدرت حاصل تھی کہ مشکل سے مشکل بحر میں شعر کہتے تھے اور مثنوی ''نہ سپہر'' کے ایک سپہر میں ایسی بحر کو کام میں لائے تھے جو کم از کم مثنوی میں ان سے پہلے کسی شاعر نے استعمال نہ کی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اس علم سے ناواقفیت پر بعض لوگوں نے انہیں مورد طعن و طنز بھی بنایا' اس لیے کہ ایک جگہ کہتے ہیں' (۱)

اے کہ می گوئی مرا خسرو نمی دانی عروض
من چہ محتاج عروضم تا کنم گفت و شنو
نظم سنجیدہ ہمی گویم بموزونی طبع
نقد سنجیدہ باشد وقت سنجیدن گرو
من ترازو دارم و تو در ترازو می نہی
کیست زین ہر دو ترازو خود درین سنجیدہ شو

(۱)—دیوان بقیۂ نقیہ ۔

لیکن نجوم میں انھیں جو دسترس حاصل تھی وہ ان کے کلام سے بخوبی ظاہر ہے، مختلف برجوں میں مختلف ستاروں اور سیاروں کی جائے وقوع کا مبارک یا منحوس اثر، قران، تثلیث، تسدیس وغیرہ، رمل کی رو سے بارہ خانوں کے خواص، غرض یہ کہ نجوم کے متعلق انھیں تمام اہم جزئیات سے واقفیت تھی اور ان چیزوں کو ایک خاص شاعرانہ انداز میں بیان کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ مثنوی ''نہ سپہر'' میں انھوں نے سلطان محمد، یعنی سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے بیٹے، کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے جو زائچہ اور فالنامہ لکھا ہے وہ اُن کے اس کمال کی بہترین مثال ہے۔ ہندوؤں کے بعض قدیم علوم مثلاً سحر اور طلسمات وغیرہ کی طرف بھی اُنھوں نے توجہ کی تھی اور غالباً اور زیادہ توجہ کرتے اگر انھیں یہ خیال مانع نہ ہوتا کہ اس قسم کے علوم شرع اسلامی کے خلاف ہیں، ممکن ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا سے جو تعلق انھیں آخر عمر میں حاصل ہوا اس سے انھیں احکام مذہبی کی پابندی کا زیادہ خیال پیدا ہوگیا ہو اور اُنھوں نے اس قسم کی چیزوں کا خیال بالکل ترک کر دیا ہو۔ اپنی اس توجہ کا ذکر ''نہ سپہر'' میں یوں کرتے ہیں:—

من قدری بر سراین کار شدم

علم موسیقی میں اُن کی مہارت مسلمہ ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اس فن میں نایک کا رتبہ حاصل کر لیا تھا، لیکن چونکہ ہندوستانی موسیقی میں خسرو کے تصرفات کافی اہمیت رکھتے ہیں اس لیے اُن کی علمی استعداد کے اس پہلو پر میں ایک مستقل باب میں بحث کروں گا، یہاں

اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شاعری کی طرح موسیقی کا بھی خسرو کو بچپن ہی سے شوق رہا اور انھیں ہندوستانی اور ایرانی دونوں اصولوں سے واقفیت تھی۔

تاریخ کے علم میں بھی خسرو کو بہت کچھ درک تھا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے لے کر اپنے زمانے تک کے واقعات پر خصوصاً انھیں پورا عبور حاصل تھا۔ ان واقعات کو جس صحت اور خوبی کے ساتھ اُنھوں نے اپنے قصائد اور مثنویوں میں نظم کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے زمانے کی تقریباً مکمل تاریخ اُنھی کی تصانیف سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جس صحت اور دیانتداری کے ساتھ اُنھوں نے ہر واقعے کو لکھا ہے وہ ان کے کسی ہمعصر کی تصنیف میں نہیں پائی جاتی، حالانکہ وہ شاعر تھے مؤرخ نہ تھے اور شاعر کے لیے مبالغہ یا حقیقت سے بے پروائی ایک معمولی بات ہے، مثنوی ''دول رانی خضرخاں'' میں التمش کے جانشینوں کا چند اشعار میں ذکر کیا ہے، بیان مختصر ہے لیکن شاعرانہ انداز کو قائم رکھتے ہوئے ہر ایک بادشاہ کے کردار اور کارناموں کو اس خوبصورتی سے لکھ گئے ہیں کہ اُس زمانے کی تاریخ کا ایک بہت بیش قیمت مرقع تیار ہو گیا ہے، ذرا ان اشعار کو غور سے پڑھیے اور پھر اُن لطیف اشاروں کی جو اُن میں کیے گئے ہیں شرح اور تفصیل، تاریخ برنی، طبقات ناصری وغیرہ میں ملاحظہ کیجیے تو آپ کو خسرو کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ ہو سکے گا۔

چو رفت آن شمس روشن در سیاهی
بر آمد اختر فیروز شاهی

به بخشش خلق عالم را رهی کرد
همه گنجینهٔ شمسی تهی کرد

چو ششماهی دران دولت بسر برد
چو طفل هشت ماهه دولتش مرد

ازان پس چون پسر کم بود شایان
به دختر گشت رای نیک رایان

رضیه دخترے مرضیه سیرت
سریر آراست از جای سریرت

مهی چند آفتابش بود در میغ
چو برق از پرده می زد پرتو تیغ

چو تیغ اندر نیام از کار می ماند
فراوان فتنه بےآزار می ماند

برید از صدمهٔ شاهی نقابش
ز پرده روے بنمود آفتابش

چنان می راند زور ماده شیران
که حامل می شدند از وے دلیران

سه سالی کش قوی بد پنجه و مشت
کسی بر حرف او ننهاد انگشت

چهارم چون ز کار او ورق گشت
برو هم خامهٔ تقدیر بگذشت

بیان شد زان پس از حکم الهی
نگین سکهٔ بهرام شاهی

سہ سال او نیز اندر عشرت و جام
نشاطی راند چون پیشینہ بہرام
برو ہم کرد بہرام فلک زور
شد آن بہرام نیز اندر دل گور
ازاں پس بر فراز تخت مقصود
سعادت داد ہفت اختر بہ مسعود
دو سہ سالے دگر از بخت و دولت
علای داشت از وی مسند و تخت
چو آن گلہای کم عمر از چمن جست
جوان سروی بالین گاہ بنشست
بسال پیوست ز اوج پایۂ خویش
جہاں می‌داشت اندر سایۂ خویش
عجب عہدے ہمہ در کامرانی
بہر خانہ نشاط و کامرانی
نہ کس دادی کمند کینہ را تاب
نہ کس دیدی خیال فتنہ در خواب
خود او مستغرق کار الہی
بامرش بندگان در کار شاہی

غرض یہ کہ شاید ہی کوئی ایسا علم یا فن ہو جس کا جاننا اُس زمانے میں ایک عالم اور ادیب کے لیے ضروری تھا جس کی طرف خسرو نے اپنی توجہ مبذول نہ کی ہو اور جس سے وہ کسی حد تک بہرہ‌یاب نہ ہوئے ہوں اور انہی سب علوم و فنون سے آراستہ ہوکر اُنہوں نے میدان شعر میں اپنی طبیعت کی جولانی دکھانا شروع کی - یہ ضروری نہیں ہے کہ آغاز جوانی ہی میں وہ

ان سب علوم پر حاوی ہو گئے ہوں بلکہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ عمر کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا افق علم و معرفت وسیع ہوتا گیا اور زمانے کے سرد و گرم نے ان کی قابلیت میں رفتہ رفتہ وہ پختگی پیدا کردی جو آج ان کا طرۂ امتیاز ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ اپنے نانا عمادالملک کی زندگی ہی میں خسرو نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور وہ زمانہ تھا بھی ایسا کہ ایک واقعی قابل اور ہونہار شاعر کے لیے شہرت اور ترقی کے لیے بیسیوں راستے کھلے ہوئے تھے۔

التمش کی وفات کے بعد ۶۳۴ھ سے ۶۶۴ھ تک تیس سال کے زمانے میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، پانچ حکمراں دہلی کے تخت پر بیٹھے، جن میں سے صرف آخری یعنی ناصرالدین نے خاصے عرصے یعنی کوئی بیس سال تک حکومت کی، اسی بادشاہ کے زمانے میں خسرو پیدا ہوئے تھے، لیکن جب اُنھوں نے اقلیم شاعری میں نام پیدا کرنا شروع کیا تو اُس وقت اس بادشاہ کا دور بھی گذر چکا تھا اور اب سلطان التمش کا ایک غلام غیاث‌الدین بلبن بادشاہ تھا۔ غیاث‌الدین البری یا الپ اری ترکوں کے ایک اچھے خاندان سے تھا، اور شمس‌الدین التمش کی ملازمت میں آئے ہم. اُس نے ایسے کار نمایاں دکھائے کہ اُسے اس سلطان کے چالیس خاص غلاموں اور جاں‌نثاروں کے زمرے میں جگہ مل گئی۔ اس کے بعد رضیہ سلطانہ نے اسے اپنا میر شکار مقرر کیا، اور ناصرالدین کے عہد میں اسے سرحدی علاقوں میں انتظام اور خاص طور پر مغلوں کی روک تھام کے لیے تعینات کر دیا گیا اور یہ زیادہ تر اسی کی مسلسل اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان مغلوں کی یورش سے بچا رہا اور دوسری طرف

ملک بھر میں ایسا امن امان اور خوشحالی رونما ہو گئی جو عرصے سے نہ دکھائی دی تھی - اپنی اس کارگذاری اور جانفشانی کا اسے یہ صلہ ملا کہ ناصرالدین کے انتقال پر وہ اپنے آقاؤں کی سلطنت کا مالک بن گیا، بلبن سخت گیر بادشاہ تھا اور امور سلطنت میں کسی قسم کی غفلت یا کوتاہی کو معاف نہیں کرتا تھا، لہو و لعب کا دشمن تھا اور اگرچہ بادشاہ بننے سے پہلے شراب کا عادی تھا اس نے تخت حکومت پر قدم رکھتے ہی اس عادت کو بالکل ترک کر دیا بلکہ اپنے بیٹوں اور امیروں کی بھی سختی سے نگرانی رکھتا تھا کہ وہ شراب خوری وغیرہ کی بری عادتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں، مجال نہ تھی کہ اُس کے دربار میں کوئی بات داب شاہی کے خلاف ہو یا کسی مسخرے اور بھانڈ کی وہاں رسائی ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی انتہا کا منصف مزاج، رعایا کا بھی خواہ اور قابلیت اور ہنر کا قدردان تھا، حکومت کے بڑے بڑے عہدے چن چن کر ایسے آدمیوں کو دیتا تھا جو نہ صرف خاندانی اعتبار سے بلند مرتبہ ہوں بلکہ ذاتی خوبیوں سے بھی متصف ہوں، بڑھاپے کے زمانے میں تخت پر بیٹھا لیکن نزک و احتشام کا بہت دلدادہ تھا، مضبوط اور قوی ہیکل سیستانی پہلوانوں کا ایک دستہ بنایا تھا جو سواری میں اس کے گرد و پیش ننگی تلواریں کاندھوں پر رکھ کر چلا کرتے تھے اور دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک خاص ہیبت اور خوف طاری ہو جاتا تھا، اسی طرح دربار میں بڑے اہتمام سے تخت کے تین طرف چاووش، نقیب، حاجب، ناظر، سر جاندار وغیرہ ہاتھوں میں نیزے اور دورباش لیے ہوئے متعین رہتے تھے، آراستہ پیراستہ گھوڑے اور سونے چاندی کی جھولوں اور عماریوں سے مزین ہاتھیوں کی صفیں دربار

کی رونق اور دبدبے کو بڑھا دیتی تھیں اور حاضرین رعب اور دہشت سے کانپنے لگتے تھے بلکہ بعض تو بیہوش ہو کر گر جاتے تھے' علم اور ہنر کی سرپرستی اور قدردانی ہریادلی سے کرتا تھا اور اسی لئے دہلی کا شہر اس کے زمانے میں دور دور کے علما کا ملجا و ماوی بن گیا تھا - بادشاہ اور اس کے امیروں کی داد دہش کی شہرت سن کر لوگ دارالسلطنت کی طرف کشاں کشاں چلے آتے تھے اور جو آتا تھا محروم نہ جاتا تھا -

اس زمانے کے امرا کی حالت برنی یوں بیان کرتا ہے کہ شمسی' ناصری اور بلبنی ملکوں میں آپس میں جاگیروں' مال و دولت کی فراوانی یا بڑے بڑے عہدوں کی وجہ سے کوئی رقابت یا مخاصمت نہ تھی بلکہ جو بھی باہمی رشک اور رقابت تھی وہ سخاوت اور دریادلی کے کاموں میں تھی' چنانچہ اگر کوئی ملک یا خان سن لیتا تھا کہ کسی اور ملک یا خان کے دسترخوان پر پانچ سو آدمیوں کو مدعو کیا گیا تو وہ اپنے دسترخوان پر ایک ہزار آدمیوں کو کھانا کھلاتا تھا - یا اگر کسی کو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں ملک نے دو سو تنکے خیرات کئے تو وہ رشک کرتا تھا اور چار سو تنکے خیرات کر دیتا تھا اور اگر کسی امیر نے اپنی محفل شراب میں پچاس آدمیوں کو گھوڑے اور سو آدمیوں کو خلعت عطا کئے تو جب تک دوسرا اپنی محفل میں سو گھوڑے اور دو سو خلعت تقسیم نہ کر لیتا تھا اسے چین نہ آتا تھا - اسی فیاضی اور فضول خرچی کی وجہ سے اس عہد کے خان' ملک اور امیر اکثر مقروض رہا کرتے تھے' (۱)

---

(۱) برنی' ص ۱۱۹-۱۲۰

ان امیروں میں چند ایک خاص طور پر قابل ذکر ہیں، خصوصاً اس لیے کہ خسرو کو اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ان سے زیادہ تر سابقہ پڑا اور ان کی سرپرستی ان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی - خسرو کے نانا عمادالملک عارض راوت کا تو ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ سب سے زیادہ با رسوخ اور نامور ملک سلطان بلبن کا بھتیجا علاءالدین کشلو خان تھا، جو باربک کے عہدے پر فائز اور ارلغ قتلغ مبارک کے خطابوں سے سرفراز تھا، یہ ملک عام طور پر ملک چھجو کے لقب سے مشہور تھا اور بقول برنی سخاوت میں حاتم طائی سے بھی بازی لے گیا تھا - شکار اور چوگان بازی میں سر کردۂ روزگار تھا بلکہ کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں میں اس کی شہرت ہندوستان سے خراسان تک پہنچ گئی تھی اور اس کی تعریفیں سن کر چنگیز خان کے پوتے ہلاکو نے اسے اپنے ملک میں بلا لینے کی بہت کوشش کی اور عراق کا آدھا ملک دے دینے کا لالچ بھی دلایا لیکن وہ نہ گیا، خود بلبن کو بھی اس کے رسوخ اور ہردلعزیزی کی وجہ سے اس کی جانب سے کھٹکا لگا رہا کرتا تھا -

ایک اور قابل ذکر امیر ملک‌الامراء فخرالدین کوتوال دہلی تھے جو اپنے نیک کاموں اور خدا ترسی کے لیے مشہور تھے - کہتے ہیں کہ ان کے گھر پر شب و روز بارہ ہزار آدمی قرآن‌خوانی کے لیے مامور تھے، ہر روز بلا ناغہ وہ اپنا پورا لباس تبدیل کرتے تھے اور جو کپڑے اتارتے تھے وہ محتاجوں میں بانٹ دیتے تھے، بلکہ ہر روز ان کا پلنگ اور بستر بھی بدلا جاتا تھا اور ہر سال وہ ایک ہزار غریب لڑکیوں کے جہیز تیار کرا کے دیا کرتے تھے -

اسی طرح بلبن کا چچازاد بھائی امیر علی سرجاندار بھی

جود و سخا میں شہرۂ آفاق تھا ' جس کسی کو صلہ یا انعام دیتا تھا تو کبھی کئی ہزار سے کم کی رقم نہ دیتا تھا ' پہلے شراب کا بہت دلدادہ تھا اور یہ بات بلبن کو ناگوار گذرتی تھی ' چنانچہ ایک دن' اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ شراب پی کر تم بہت سخاوت پر اُتر آتے ہو ' شراب کے نشے میں دے دینا کیا بڑی بات ہے یوں ہی دو تو ہم بھی جانیں کہ ہاں تم سخی ہو - بادشاہ کی اس بات کا امیر علی پر ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے شراب سے توبہ کرلی اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر سخاوت کی داد دینے لگا -

خسرو کو جب کسی مربی اور سرپرست کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نظر انتخاب پہلے علاءالدین کشلو خاں ہی پر پڑی ' اگرچہ اس وقت تک خسرو' بادشاہ یعنی بلبن کی تعریف میں کئی قصیدے کہ چکے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں ان کی رسائی نہیں ہوئی - ممکن ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر اور سنجیدہ مزاج شخص شعر و شاعری کے مذاق سے بھی محروم ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی یہ نوعمر شاعر ایسی مسلمہ حیثیت نہ رکھتے ہوں کہ دربار کے شعرا میں انہیں جگہ مل جاتی ' اسی طرح کشلو خاں کے علاوہ وہ بعض اور امیروں مثلاً شمس‌الدین دبیر ' امیر علی سر جاندار ' اختیارالدولہ حسام‌الدین وغیرہ کی بھی مدح خوانی کر چکے تھے لیکن اُن میں سے کسی سے باقاعدہ اپنے آپ کو متعلق نہ کیا تھا - خسرو کی عمر اس وقت کوئی بیس سال کی تھی لیکن ابھی سے اُنہوں نے خاصا نام پیدا کر لیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب امیر اور ملک اس کے خواہاں تھے کہ خسرو کو اپنی ملازمت میں لے لیں' ان کا پہلا دیوان

تحفۃالصغر اس وقت تک مرتب ہو چکا تھا اور ان کی ابتدائی کامیابیوں نے ان میں ایک خاص جذبہ، فخر اور خودستائی کا پیدا کر دیا تھا جو ایک نوجوان شاعر کے لیے یقیناً قابل معافی ہے اور جو ان کے زیادہ پختہ عمر کے کلام میں کمتر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی زمانے کے لکھے ہوئے قصیدوں میں ایک جگہ کہتے ہیں:—

تا بفر شعر من دریاب شد اقلیم ہند
یا باشعار ظہیر اقصای ملک فاریاب

ایک اور قصیدے میں یہ شعر ہے کہ:

تا کشد گردون بچشم انوری
خاک من کحل سپاہانی شدہ است

اِن ہی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "میرے جوان خیال کے نتائج کو جاننے والے لوگ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور میرے اشعار ایک سے دوسرے شخص تک پہنچتے تھے، گویے ان اشعار کو سازوں کے ساتھ گاتے تھے اور اُنھیں سن کر پشت خم بوڑھوں پر بھی ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی"۔

لیکن جب ہمارے نوجوان شاعر کا پیمانہ، خوشی اور فخر سے اس طرح لبریز ہو رہا تھا تو اُنہیں اپنی زندگی کے دوسرے بڑے صدمے سے واسطہ پڑا، یعنی سنہ ۶۷۱ھ میں ان کے نانا عمادالملک بھی ایک سو تیرہ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اپنی طویل عمر کے ستر سال انھوں نے بادشاہ اور ملک کی خدمت میں گزارے تھے اور اپنے کام کو بےمثل قابلیت اور دیانتداری سے انجام دیتے رہے تھے، ان مہربان نانا کے انتقال نے

خسرو کے دل میں اپنے شفیق باپ کے " انتقال کا رنج تازہ کر دیا اور اسی احساس تنہائی ' اسی شعور بےبسی نے انہیں دوبارہ آ گھیرا ' عمادالملک کے انتقال پر انہوں نے ایک بہت ہی پردرد اور موثر مرثیہ لکھا جو دیوان تحفۃالصغر میں موجود ہے ' اس مرثیے میں ایک جگہ کہتے ہیں - ' وہ چراغ گل ہو گیا ' شمع خاک بجھ گئی ' افسوس ! دونوں جہانوں کی بنیاد تباہ ہو گئی ' عارض حضور بادشاہ میں کیوں نہیں جاتا ؟ وہ وزیر اعظم کہاں چھپا ہوا ہے اور دیوان میں کیوں نہیں آتا ؟ اے آصف بادشاہ خود تیرے لیے رو رہا ہے اور اے عارض دیوان بھی تیرا ماتم کر رہا ہے - قبۂ آسمان کا ستون منہدم ہوگیا ہے ' یہی وجہ ہے کہ قصر شاہی کے بام و در تک سوگوار نظر آتے ہیں ' ترکوں نے اپنے کلاہ اتار پھینکے ہیں اور اپنے چغے دامنوں تک چاک کر دیے ہیں ' اور ہندو راجہ برہمنوں کی طرح سر ننگے کیے ہوئے پریشان اور غمزدہ ' آنسو بہا رہے ہیں -

اسی افسوسناک واقعے کی وجہ سے خسرو کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ملک چھجو کی ملازمت اختیار کریں ' اس ملک کی سخاوت عام تھی لیکن شاعروں پر خاص طور پر مہربان تھا ' چنانچہ ایک مرتبہ ایک شاعر شمس معین کا قصیدہ سن کر ایسا خوش ہوا کہ اپنے اصطبل کے سب گھوڑے اسے بطور انعام دے دیے اور جن قوالوں نے اس کے سامنے وہ قصیدہ گا کر سنایا تھا ان میں سے ہر ایک کو دس دس ہزار تنکے عطا کیے ' خسرو جیسے شاعر کی وہ جس قدر بھی قدر کرتا کم تھی اور ظاہر ہے کہ خسرو کو بھی اس کی مدح میں جو لطف آتا ہوگا وہ کسی اور کی

تعریف کرنے میں نہیں حاصل ہوسکتا تھا، اپنی اس پہلی ملازمت میں خسرو کے فرائض منصبی بظاہر اس سے زیادہ نہ تھے کہ وہ اس ملک کے دربار میں حاضر رہیں اور اس کی محفلوں کی زینت کو بڑھائیں، چنانچہ خسرو کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ "دو سال تک میں نے اس کی مجلس میں ایسے ایسے قصیدے اُس کی تعریف میں پڑھے کہ جو سے اور کسی کی مدح میں نہیں کہہ سکتا تھا، میں اس سرو کے باغ میں برابر موجود رہتا تھا اور اُس کے دربار کو باد صبا کے ان جھونکوں سے جو میری سوسن زبان سے نکلتے تھے تروتازہ کرتا رہتا تھا۔" یہ دو سال خسرو نے غالباً بہت آرام میں گزارے، کشلو خان کی محفل کی چہل پہل، ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹ، قوالوں اور گویوں کے سرور انگیز نغمے عود و عنبر کی خوشبوئیں، شراب ارغوانی کے دور، غرض عیش و عشرت کے کوئی ایسے لوازمات نہ تھے کہ جو اس کی محفل میں موجود نہ ہوں، بلبن ان چیزوں کا بہت مخالف تھا لیکن بھلا اس کے ملک اور خان ان بندشوں کی کیا پروا کر سکتے تھے جو بادشاہ ان پر عائد کرنا چاہتا تھا، چوری چھپے ہی سہی، مگر ہوتا سب کچھ تھا، البتہ اس کی احتیاط رکھی جاتی تھی کہ بادشاہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

بلبن نے اپنے امرا پر جو قیود عائد کی تھیں وہ اپنے بیٹوں اور خاندان کے لوگوں کے لیے اور بھی سخت کر دی تھیں اور ان کی ہر نقل و حرکت پر بادشاہ کی نظر رہتی تھی، لیکن کبھی کبھی یہ لوگ بھی موقع پاکر کسی خان یا ملک کی محفل میں پہنچ جاتے تھے اور چند گھنٹے اُن خوش گوار

صحبتوں کا لطف اُٹھا لیتے تھے ۔ چنانچہ جب خسرو کو ملک چھجو کی ملازمت میں دو سال ہوگئے تو ایک رات بلبن کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں جو بعد میں کیقباد کے نام سے بادشاہ ہوا ، اس ملک کی محفل میں اپنے چند ہمراہیوں اور مصاحبوں کے ساتھ شریک ہوا ۔ اس صحبت کا بیان خسرو یوں کرتے ہیں ۔

" شہزادے کے ساتھ اُس کے چند خاص مصاحب بھی تھے ، جن میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی شامل تھے ۔ ان دونوں عالموں کا اجتماع گویا قران السعدین تھا یا چاند اور سورج کا یکجا جمع ہو جانا اور میں جو کہ عطارد ہوں اس پر نازاں تھا کہ مجھے بھی اس صحبت میں بار ملا ۔ ایک طرف تو یہ دونوں اقلیم سخن میں اپنا سکہ جمانے کی کوشش میں مصروف تھے اور دوسری طرف میں شاعری کے نقارے کو ایسی بلند آواز سے بجا رہا تھا کہ وہ مجھے نیچا نہ دکھا سکتے تھے ۔ ان دو طرفہ گرجوں کو دونوں شہزادوں اور اُن کے مصاحبوں نے خوب غور سے سنا ، اور جب شعرا اپنا کلام سنا رہے تھے تو اُن کی بخشش کے بادل نے ایسا مینہ برسایا کہ تمام روے زمین کو سیراب کر دیا ، سونے کی عجب بارش تھی کہ دیناروں کو دیکھتے دیکھتے لوگوں کی آنکھیں برقانی ہوگئی تھیں ، اور سونے کے بوجھ سے ان کے دامن یوں پھٹے پڑتے تھے جیسے گلاب کی سیکڑوں پتیاں الگ الگ ہو کر بکھر جائیں ، میرے شیریں اشعار شہزادہ بغرا خان کو ایسے پسند آئے کہ اُس نے اُس دریا دلی کے مطابق جو بادشاہوں اور شہزادوں کا خاصہ ہے میرے لیے

ایک خوان سفید جغراتی (چاندی کے) ٹنکوں کا بھرا ہوا منگوا کر بطور انعام عطا کیا اور اس طرح مجھے اپنا بندۂ بےدام بنا لیا ۔ مگر کشلو خان میں حسد و رشک بہت تھا، اور اس کے چہرے پر فوراً ناراضگی کے آثار ظاہر ہوگئے، میں نے یہ دیکھ کر اُسے ہر طرح منانے کی کوشش کی مگر وہ میرا کوئی عذر نہ سنتا تھا، اس واقعے کو کئی دن گزر گئے لیکن گزشتہ باتوں کی یاد اس کے دل سے محو نہ ہوئی، وہ مجھے سزا دینا چاہتا تھا اور اپنے غصے کے تیر کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس لیے میں بھی تیر کی طرح بھاگ نکلا " (۱)

خسرو کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کشلو خان کو جو بات ناگوار گزری وہ یہ تھی کہ جب خسرو اس کی ملازمت میں تھے تو اُنھوں نے کسی اور سے، خواہ بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، کوئی صلہ یا عطیہ لینا کیوں منظور کیا، بغرا خان اس کی محفل میں بطور مہمان آیا تھا اور مہمان سے ایک ایسے سخی میزبان کی موجودگی میں کچھ لینا اسے پسند نہیں آیا، علاوہ ازیں اسے یہ بھی خیال گزرا ہوگا کہ خسرو نے شہزادے کی موجودگی میں خاص طور پر اپنا ہنر اور کمال دکھانے کی کوشش اسی لیے کی کہ شہزادے کی توجہ اپنی طرف مبذول کریں اور اس کی سرپرستی سے بہرہ اندوز ہو سکیں، کشلو خان کی یہ خفگی بجا تھی یا بےجا، اس بحث میں پڑنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں

(۱) دیباچہ غرۃ الکمال

تھے، لیکن اس خفگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو نے عمادالملک کے انتقال کے بعد جو جائے پناہ تلاش کی تھی اُسے بھی اُنھیں خیرباد کہنا پڑا اور اب اُنھیں کسی نئے سرپرست کی جستجو ہوئی۔ اس پریشانی کی حالت میں قدرتی طور پر اُن کا خیال بغرا خاں ہی کی طرف گیا کیونکہ اُسی کی وجہ سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگڑا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے سامانے کا رخ کیا جو اُس زمانے میں ایک بہت اہم فوجی مقام تھا اور جسے مغلوں کے حملے کی روک تھام کے لیے خاص طور پر زیادہ مستحکم بنا دیا گیا تھا، ملتان کے بعد شاید یہی شہر سرحدی چھاونیوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور سامانے کا صوبہ ہمیشہ کسی قابل اور معتبر حاکم ہی کے سپرد کیا جاتا تھا، اسی لیے بلبن نے ملتان میں تو اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کو متعین کیا تھا اور سامانے کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خان کو سونپی تھی، غرض خسرو جب سامانے پہنچے تو بغرا خان نے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ ان کے کمال کا معترف ہو چکا تھا اور ایسے ہونہار شاعر کی موجودگی سے اس کے دربار کی رونق کا بڑھ جانا ایک یقینی بات تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو جلد ہی اس شہزادے کے خاص الخاص مصاحبوں اور ندیموں میں شمار ہونے لگے،

لیکن گردش زمانہ نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، سامانے آئے اُنھیں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بغرا خان کی دربار دہلی سے طلبی ہوئی اور بادشاہ نے ساتھ لکھنوتی کی مہم پر جانے کی تیاری کا حکم ملا۔ ہوا یہ کہ اُن دنوں

لکھنوتی کا حاکم ایک ملک طغرل نامی تھا - اُس نے اپنی بہادری اور قابلیت سے لکھنوتی اور بنگالے کے صوبوں کو بالکل اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا اور وہاں کے لوگوں میں اسے بڑا رسوخ حاصل ہوگیا تھا ' ان کامیابیوں کی وجہ سے اسے اپنے متعلق بہت زعم ہوگیا اور خصوصاً جب اُس نے جاجنگر کو تسخیر کر کے بہت سا مال و دولت وہاں سے حاصل کر لیا تو اُس کا سر پھر گیا اور بلبن کے عہد کے چودھویں سال یعنی کوئی سنہ ۶۷۶ھ میں اُس نے علم بغاوت بلند کر کے اپنا لقب مغیث الدین رکھ لیا اور خطبہ اور سکہ اپنے نام کا جاری کر دیا ' جب بلبن کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اُس نے ایک سپہ‌سالار امین‌الدین کو کچھ فوج دے کر طغرل کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا ' لیکن امین‌الدین کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر دھلی واپس آگیا ' اس بزدلی کی اُسے بہت سخت سزا ملی یعنی بلبن نے اُسے قتل کرا دیا اور پھر ایک اور فوج طغرل کے مقابلے میں لکھنوتی روانہ کی ' لیکن طغرل نے ' جس کا حوصلہ اور ہمت اب اور زیادہ ہوگئی تھی ' اس فوج کو بھی بری طرح مار بھگایا - پے درپے دو شکستوں سے بلبن کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس نے فوراً خود سفر کی تیاری شروع کر دی اور اس مہم کے لیے جو بھی ضروری ساز سامان ہو سکتا تھا سارا سار تیار کرنے کا حکم دیا ' برسات کا زمانہ قریب تھا اور بادشاہ کے امیروں وزیروں نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی ' لیکن بلبن نے ایک نہ سنی ' سامانے سے بغرا خان کو بلا کر اپنے ساتھ لیا اور کوچ کا حکم دے دیا ' شہزادے نے جہاں اپنے اور خاص خادی

مصاحبوں کو ہمراہ چلنے کو کہا وہاں خسرو سے بھی چلنے کی درخواست کی، شہزادے کی اس خواہش کو رد کرنا آسان نہ تھا اس لیے خسرو، غالباً با دل ناخواستہ، راضی ہوگئے۔ یہ پہلا لمبا اور دشوار سفر تھا جو انھیں اپنی زندگی میں پیش آیا اور اس طرح بھری برسات میں ایک دور دراز مہم کے ہمراہ بہت سے تلخ تجربے ہوئے جن کا ذکر انھوں نے بہت شکایت آمیز لہجے میں کیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ اپنی وہ خوبصورت غزل جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں اسی موقع پر یعنی دہلی سے روانگی کے وقت کہی ہو:-

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چون کنم دل بچنین وقت ز دلدار جدا

ابر باران و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کنان ابر جدا، یار جدا

لکھنوتی تک شاہی لشکر ابھی نہ پہنچا تھا کہ طغرل نے جاج نگر کا رخ کیا اور اپنے ساتھ لکھنوتی کے بہت سے باشندوں کو بھی لے گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بلبن کو کوئی اور ڈیڑھ سو کوس کا سفر طے کرنا پڑا، بقول خسرو کیچڑ اور دلدلوں کی کثرت کی وجہ سے اس سفر کا ہر ایک کوس ایک مصیبت تھا اور سال بھر سے بھی کچھ زائد عرصہ کل سفر میں صرف ہوگیا، مگر بلبن نے ہمت نہ ہاری اور آخر کار فوج کے ایک دستے نے طغرل کی جائے پناہ کا پتہ لگا کر اچانک اُس کے خیموں پر دھاوا بول دیا، طغرل مارا گیا اور اُس کا سر کاٹ کر بلبن کو بھیج دیا گیا، باغیوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور لکھنوتی کے بڑے بازار میں جو کوئی ایک کروہ لمبا

تھا اُنہیں برابر برابر پھانسی پر لٹکا دیا گیا ' اب بلبن نے اطمینان کا سانس لیا اور اس فتح کی خوش‌خبری دہلی روانہ کر کے خود بھی دارالسلطنت کی جانب چلا ' لیکن چلنے سے پہلے لکھنوتی اور بنگالے کی حکومت بغرا خاں کے سپرد کی اور اُس کے سکریٹری شمس‌الدین دبیر کو بھی صلاح و مشورے کے لیے خاص طور پر شہزادے کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ' بلکہ اِن دونوں کو بہت سی نصیحتیں کیں اور کچھ ہدایتیں باقاعدہ لکھ کر ان کے سپرد کیں کہ انتظام حکومت میں اُن کا خیال رکھیں - شہزادے کو حکومت کے چتر سرخ اور دورباش سے سر فراز کیا گیا اور بادشاہ کا چتر سیہ دہلی کی طرف روانہ ہوگیا - یہ شمس‌الدین دبیر اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں میں سے تھے اور خسرو پر اُن کی خاص توجہ رہتی تھی' خسرو اُن کی عنایت اور احسان کا اکثر ممنونیت کے لہجے میں ذکر کرتے ہیں اور اُنھوں نے ان کی مدح میں کچھ قصیدے بھی لکھے ہیں - جب بلبن بغرا خاں کو چھوڑ کر دہلی روانہ ہونے لگا تو شمس‌الدین دبیر نے بہت کوشش کی کہ خسرو بھی اُن کے ساتھ لکھنوتی میں رک جائیں لیکن خسرو نے معذرت چاہی اور شہزادے سے رخصت ہو کر شاہی لشکر کے ساتھ دہلی آگئے - بلبن غالباً سنہ ۶۷۹ھ میں اس مہم کو سر کر کے دہلی پہنچا ' فتح کی خوشی میں شہر کو خوب سجایا گیا ' گھر گھر جشن اور عیش و طرب کی محفلیں منعقد ہوئیں اور سرداروں اور سپاہیوں کو دل کھول کر انعام و اکرام دیا گیا ' اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد ملتان کا حاکم تھا ' بلبن کی واپسی کی خوش‌خبری

سن کر یہ شہزادہ بھی ملتان سے باپ کی زیارت کے لیے دہلی پہنچا اور اپنے ساتھ بہت سا خزانہ اور تاتاری گھوڑے جو مغلوں سے لڑائیوں میں ہاتھ لگے تھے لایا جنہیں اُس نے بادشاہ کے سامنے ہدیہ پیش کیا ' بادشاہ بیٹے کی اس سعادت‌مندی سے بہت خوش ہوا اور اُس کی قدر و منزلت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگا - یہ بیٹا بادشاہ کو ہمیشہ سے بہت عزیز رہا تھا اور جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے باپ کی اس محبت کا واقعی مستحق بھی تھا ' بہادری' شرافت اور دریا دلی میں بے مثل تھا اور وہ تمام صفات جو ایک مہذب اور شائستہ انسان میں پائی جاسکتی ہیں اُس کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں' آداب مجلس اور قاعدے قواعد کا اتنا پاس کرتا تھا کہ اگر کبھی اپنے دربار میں کئی گھنٹے بھی بیٹھنا پڑے تو زانو نہ بدلتا تھا ' بزرگوں اور عالموں کا بےحد قدردان تھا ' اور اُن سے بہت ہی عزت اور ادب سے پیش آتا تھا - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس کی مجلس میں کچھ قوال گا رہے تھے - مجلس میں شیخ صدرالدین اور شیخ عثمان بھی تھے' کسی شعر پر ان دونوں بزرگوں پر ایسا جذبہ طاری ہوا کہ اُنھوں نے اُٹھ کر رقص کرنا شروع کر دیا ' شہزادے نے یہ دیکھا تو فوراً خود بھی کھڑا ہوگیا اور جب تک یہ وجدانی رقص جاری رہا ہاتھ باندھے اور نیچی نظر کئے برابر کھڑا رہا -

دہلی میں شہزادے کے قیام کے دوران میں اُس کی ملاقات خسرو سے بھی ہوئی اور اُس نے اُن کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا ' چنانچہ خسرو ایک روز اپنا کلام لے کر پہنچے اور شہزادے کو سنایا ' شہزادے کو بےحد پسند آی

اور اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ خسرو اس کے ساتھ ملتان چلے چاہیں' خسرو نے بغرا خان سے جو تعلق قائم کیا تھا وہ تو ایک طرح سے منقطع ہو ہی چکا تھا' بلبن سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اپنے دربار میں انھیں کوئی شایان شان منصب دے دے' یا ان کی قابلیت کی مناسب قدر کر سکے اس لیے ظاہر ہے کہ خسرو کو اس تجویز کے منظور کرنے میں زیادہ تامل نہ ہوسکتا تھا' چنانچہ اُن کا اپنا بیان بھی یہی ہے کہ انھوں نے شہزادے کی بات بہت خوشی سے مان لی' انعام میں ایک گلہ اور خلعت تو انھیں مل ہی چکا تھا اب شہزادے کی ملازمت میں کمر بندگی باندھ کر ملتان کے سفر کے لیے تیار ہوگئے اور کچھ عرصے کے بعد شہزادے کے ساتھ اس قدیم اور تاریخی شہر میں پہنچ گئے -

تیسرا باب

خسرو شہزادہ محمد کی ملازمت میں، ملتان کا قیام، شہزادے کی شہادت، بلبن کا انتقال اور کیقباد کی تخت نشینی

ملتان کا شہر عرصے سے سندھ کے صوبے کا پایۂ تخت رہا تھا، اس زمانے میں اس شہر کی پرانی عظمت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا اس لیے کہ چنگیز خاں کے خروج کے بعد سے مغل برابر ہندوستان پر حملے کرتے رہتے تھے اور ان حملوں کی روک تھام کے لیے ملتان میں ہمیشہ کوئی قابل حاکم رکھا جاتا تھا جس کے پاس ایک بڑا لشکر ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ شہر ہندوستان کی سرحد سے بہت دور نہ تھا اس لیے باہر کے ملکوں یعنی ایران اور ترکستان وغیرہ سے جو تجارتی تعلقات ہندوستان کے تھے ان میں بھی اسے کافی اہمیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے ملتان کے باشندے بہت خوشحال تھے اور ملتانی تاجروں کی دولت ضرب المثل ہو گئی تھی، چنانچہ اس زمانے کے فضول خرچ اور دیوالیہ امرا اکثر ان سوداگروں کی مدد حاصل کیا کرتے تھے۔ روپے پیسے کی کان ہونے کے ساتھ ہی یہ شہر علم اور فضل کا بھی بڑا مرکز بن گیا تھا اور خصوصاً شہزادہ محمد کی حکومت کے زمانے میں تو ملتان اس معاملے میں دہلی سے شاید ہی کچھ پیچھے ہو۔ اس لیے کہ اس شہزادے کی سخاوت اور قدردانی کا شہرہ سن کر عالم، ادیب اور شاعر دور دور سے یہاں آ کر جمع ہو گئے تھے۔

مذہبی حیثیت سے بھی ملتان دہلی سے رقابت کا دعویٰ رکھتا تھا کیونکہ یہاں عرصے سے ولی اور بزرگ ہوتے چلے آئے تھے اور سلطان محمد کے زمانے میں اگر دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کا چشمۂ فیض جاری تھا تو ملتان میں خواجہ صدرالدین ' جو خواجہ بہاءالدین زکریا کے بیٹے تھے ' روحانی ہدایت کی شمع روشن کئے ہوئے تھے - ان حالات میں ظاہر ہے کہ خسرو کے لیے ملتان میں کسی قسم کی بھی دلچسپی کی کمی نہ تھی ' اور انہیں اپنا کمال دکھانے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا ' لیکن خسرو فطرتاً جذباتی طبیعت کے واقع ہوئے تھے ' انھیں اپنے اهل و اقارب اور دہلی کی یاد رہ رہ کر ستاتی تھی ' شہزادے نے ان کی دلجوئی میں یقیناً کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی ' مگر باوجود اس قدر و منزلت کے جو انہیں ملتان میں حاصل تھی' اور باوجود اس کے کہ شیخ سعدی شیرازی تک نے ان کے کلام کی تحسین و آفرین لکھ کر سلطان محمد کو بھیجی تھی اور خسرو کی سرپرستی اور قدردانی کی تاکید لکھی تھی ' ان کا دل ملتان میں زیادہ عرصے نہ لگ سکا - اس کی ایک وجہ تو دہلی سے دوری تھی اور دوسرا سبب غالباً یہ تھا کہ مغلوں سے جو آئے دن لڑائیاں رہتی تھیں اُس سلسلے میں سلطان محمد کو بعض دشوار گزار اور دور دراز مقامات میں آنے جانے کی ضرورت اکثر پیش آتی رہتی تھی' اور ان سفروں میں معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات خسرو کو بھی اپنے همراہ لے جایا کرتا تھا ' چنانچہ کسی ایسے ہی سفر میں خسرو کو سرحدی پٹھانوں سے بھی واسطہ پڑا اور اس کا ذکر یوں کرتے ہیں :—

" ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۂ اسلام تھا جو ہفت اقلیم

کے بادشاہوں کا قبلہ ہے یعنی وہ دہلی جو مشہور آسمان ہے اور
روے زمین پر بہشت بریں کا ایک ٹکڑا ہے ' تو آسمان اس پر اپنا
مبارک سایہ ڈالے ہوئے ہیں اور ہفت اقلیم اس کے دروازے کا
حلقہ ہیں - اس کے بلند قصر آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور
سورج پر بھی سایہ ڈالتے ہیں ' اور اس کے بازار میں آدمیوں
کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ
میں جگہ نہیں ملتی ' اس کے سرسبز میدانوں میں پھول کھل
رہے ہیں ' اور اس کے چشمے چمکدار آنکھوں سے بھی زیادہ صاف
اور روشن ہیں ' جن کا بہتا ہوا پانی آب حیات کی طرح خوش گوار
اور نبات میں سے بہتے ہوئے دودھ کی طرح شیریں ہے ' حوض
سلطانی ایسا روشن کہ معلوم ہوتا ہے چاندی کو پگھلا کر پتھر میں
ڈال دیا ہے ' اس کے باغات میں تماشائیوں کا ہجوم ' جن میں
سے ہر ایک لالہ رخسار ' بلاگوش کی وہ چمک دمک کہ کان کے
موتیوں کی آب کو بھی ماند کرے ' عود اور رباب کے نغمے جو
اس کے باغوں میں بلند ہوتے ہیں ایسے شیریں کہ درخت مخمور
ہو جائیں اور چشمے اونگھنے لگیں - وہاں میرے دن سیر اور
تماشے میں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت میں بسر ہوتی
تھیں ' شاید اُس گلستان کے لیے میرا وجود بار تھا کہ تقدیر نے
مجھے اس خارستان میں لاکر مقید کر دیا ہے ' قلعہ کیا ہے ایک
دہکتا ہوا تنور ہے ' وحشیوں اور جنگلیوں سے معمور جیسے کوئی
ویرانہ ... اس قلعے میں افغانوں کی بستی ہے ' نہیں بلکہ مردم خوار
دیوؤں کی ' اس لیے کہ ان کے نعروں سے دیو بھی خوفزدہ ہو کر
نالہ و بکا کرنے لگتے ہیں ' سر کیا ہیں ' معلوم ہوتا ہے بڑے بڑے
بورے بھوسے سے بھرے ہوئے ' اور داڑھیوں کی یہ کیفیت کہ جلا ہوا

کے برش معلوم ہوتے ہیں، ٹانگیں لق لق کی سی مگر عقاب سے زیادہ تندخو، سر یوں نیچے کو جھکے ہوئے جیسے ویرانے کے بوم کا، ان کی آوازیں کوے کی بولی کی طرح کرخت اور ناگوار، ان کے منہ اس طرح کھلے ہوئے جیسے مٹکا کا، زبانیں ایسی کند جیسے خانہ ساز تیر، اور الفاظ ایسے سخت کہ جیسے منجنیق سے پتھر نکل رہے ہوں، کسی دانا نے ٹھیک کہا ہے کہ جب گویائی آسمان سے اہل زمین کے لیے نازل کی گئی تو افغانوں کو سب سے کم اور سب سے آخری حصہ ملا۔" (۱)

لیکن خسرو کی ملتان سے یہ بیزاری کچھ زیادہ بڑھنے نہ پائی، اس لیے کہ وہاں بھی ان کی دلبستگی کے کافی سامان تھے، اور اس لیے انھوں نے جو پانچ سال وہاں گزارے وہ بعض لحاظ سے ان کی زندگی کا ایک بہت اچھا زمانہ کہا جا سکتا ہے، شہزادہ محمد نے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، دور دور سے ادیبوں اور شاعروں کو بلا کر اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا، بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ اس نے دو بار شیخ سعدی شیرازی کو بھی ملتان آنے کی دعوت دی اور ان کے لیے قیمتی تحائف اور خلعت بھیجے لیکن شیخ سعدی نے دونوں مرتبہ معذرت لکھ بھیجی، ملتان کے دربار میں خسرو کے علاوہ سب سے زیادہ مشہور شاعر سید حسن سجزی تھے،(۲) - یہ تقریباً خسرو کے ہم عمر تھے اور غزل گوئی میں خصوصاً کمال رکھتے تھے، اسی مناسبت سے انھیں سعدی ہند بھی کہا جاتا تھا، بعض نقادوں کا تو یہ خیال ہے کہ وہ غزل میں خسرو سے بھی

---

(۱) دیوان تحفۃ الصغر - (۲) خواجہ حسن دہلوی کے لیے دیکھیے دیباچہ دیوان حسن مطبوعہ حیدرآباد دکن -

بازی لے گئے تھے لیکن اگرچہ اس میں اختلاف کی گنجایش ہے یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ میر حسن کے کلام میں ایک سادگی اور بے ساختگی ایسی ہے کہ جو بہت کم شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے - خسرو اور حسن کے بظاہر بہت اچھے تعلقات تھے اور خسرو ان کی بہت قدر کرتے تھے چنانچہ دیباچۂ غرۃالکمال میں ہندوستان کے با کمال شعرا کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے حسن کا نام بھی لیا ہے - لیکن وہ قصہ عشق اور محبت کا جسے فرشتہ اور بعض اور تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے میرے خیال میں زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے - کیونکہ خسرو کے کلام سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے اور حسن کے درمیان کوئی ایسا رشتۂ الفت قائم ہو گیا تھا جسے عشق کے نام سے تعبیر کر سکیں، کہا یہ جاتا ہے کہ خسرو کی ملاقات پہلے حسن سے ایک نان‌بائی کی دکان پر ہوئی جہاں حسن کام کرتے تھے، اور اُن کے حسن و جمال اور حاضر جوابی نے خسرو کو مفتون بنا لیا - اُدھر حسن کے دل میں بھی خسرو کی طرف ایک محبت کا جذبہ موجزن ہوا اور دکان چھوڑ کر وہ حضرت نظام‌الدین اولیا کے پاس خسرو کی تلاش میں پہنچے، ان بزرگ سے خسرو کو چونکہ خاص تعلق پہلے ہی سے حاصل تھا اس لئے آپس میں مراسم بڑھنے شروع ہوئے، جب شہزادہ محمد خسرو کو ملتان بحیثیت مصحف‌دار کے لے جا رہا تھا تو حسن کو بھی دوات‌دار کا منصب دے کر ساتھ لے گیا - وہاں دونوں دوستوں کے تعلقات لوگوں کی نظر میں کھٹکنے لگے اور شہزادے کو بھی کچھ شبہ پیدا ہوا چنانچہ اس نے حسن کو خسرو سے ملنے کی ممانعت کر دی، اور جب باوجود اس بندش کے حسن نے خسرو سے ملنا نہ چھوڑا تو شہزادے نے حسن کو تازیانے

کی سزا دی' اور خسرو کو بلوایا - خسرو نے جو اپنی بانہہ کھول کر دکھائی تو ان کے بالکل وهیں کوڑے کے نشان تھے جہاں حسن کے اور اُنہوں نے یہ مصرعہ پڑھا کہ : —

گواہ عاشق صادق در آستین باشد'

اس پر سلطان محمد نے اُن کے عشق کی پاکیزگی کو تسلیم کر لیا اور اگرچہ خسرو نے ملازمت سے استعفا دینے کی خواہش ظاہر کی شہزادے نے اسے منظور نہ کیا اور ان سے آئندہ کسی قسم کا تعرض کرنا چھوڑ دیا - (۱)

اس روایت کا بودا پن اول تو اسی سے ظاہر ہے کہ کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ملتان جانے سے پہلے خسرو کو حضرت نظام الدین اولیا سے کوئی خصوصیت حاصل ہو چکی تھی بلکہ برخلاف اس کے خسرو کے اپنے بیانات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اُن کی رسائی حضرت نظام الدین اولیا کے حضور میں آخر عمر میں ہوئی - دوسری بات جو قابل غور ہے یہ ہے کہ خسرو اور حسن کے ہمعصر مورخ ضیاءالدین برنی نے کہیں اس قسم کے گہرے تعلق کا ذکر نہیں کیا - بلکہ محض یہ لکھا ہے کہ خسرو اور حسن میں دوستی تھی اور اس دوستی کی بنا ایک حد تک برنی ہی کی سعی سے پڑی تھی' تیسری چیز یہ ہے کہ جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں خسرو کے کلام میں کہیں حسن کا خاص طور پر تذکرہ نہیں ہے اور نہ حسن نے اپنے اشعار میں کہیں خسرو کی مدح و ستایش کی ہے' بعض تذکرہ نویسوں نے حسن کی یہ رباعی نقل کی ہے کہ :—

خسرو از راہ کرم بپذیرد انچہ من بندہ حسن می‌گویم

---

(۱) فرشتہ : حصہ دوم ص ۲۰۲

سخنم چو سخن خسرو نیست ۔ سخن این است کہ من می گویم

اور اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حسن کو خسرو سے بہت عقیدت تھی اور اپنے کلام کے متعلق خسرو کی رائے کی وہ بہت قدر کرتے تھے' لیکن ہمارے خیال میں رباعی کے دوسرے بیت سے یہ مفہوم بعید از قیاس ہو جاتا ہے بلکہ اس بیت میں کچھ شائبہ تعریض اور طنز کا بھی پایا جاتا ہے' سوا ے اس کے کہ "سخن اینست کہ من می گویم" کا یہ مطلب لیا جائے کہ "بات یہ ہے کہ میں کہتا ہوں" یعنی یہ کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ حسن ایک ہندی محاورے کا فارسی ترجمہ کر رہے ہیں ۔ اس صورت میں پوری رباعی کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ : خسرو اپنے کرم و عنایت کی رو سے میرے کلام کی قدر کرتے ہیں اور اگرچہ میرا کلام خسرو کا سا نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں کہتا ہوں (اس لیے خسرو کو پسند آتا ہے) لیکن ظاہر ہے کہ فارسی محاورے کے لحاظ سے یہ مفہوم صحیح نہ ہوگا ۔ قیاس تو یہ کہتا ہے کہ اپنے زمانے کے ان دو بڑے شاعروں میں کچھ نہ کچھ رقابت اور رشک باہمی ضرور موجود ہوگا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ رقابت یا رشک بھی اس حد تک مستقل نہ ہوا ہو کہ ان کے دوستانہ تعلقات میں کوئی ظاہرا فرق رونما ہو ۔ بہر حال خسرو اور حسن کی دوستی تسلیم کرنے میں ہمیں تو کوئی تامل نہیں ہوسکتا کیونکہ افضل الفوائد میں خسرو اکثر ان کے نام کے ساتھ "برادرم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں' لیکن مذکورہ بالا روایت کے ماننے کے لیے کوئی صائب رائے شخص تیار نہ ہوگا ۔

خسرو پانچ سال یعنی سنہ ۶۷۸ھ سے سنہ ۶۸۳ھ تک

ملتان میں رہے اور بقول خود ملتان کے پانچوں دریاؤں کو اپنے اشعار کے سمندروں (بحروں) سے پانی دیتے رہے - اس عرصے میں غالباً انھیں شہزادے کے ساتھ ملتان سے دہلی آنے کا اتفاق ہوتا رہا - اس لیے کہ سلطان محمد ہر سال ایک پھیرا دہلی کا ضرور کر لیتا تھا - اس طرح خسرو کو اپنے اہل و اعزہ سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہوگا - ان کی شادی غالباً اب تک ہو چکی تھی، دہلی کی تعریف اور اس شہر کی دلچسپیوں کے بارے میں خسرو کی جو عبارت اوپر نقل ہو چکی ہے اس سے بھی خیال گزرتا ہے، اگرچہ افسوس کی بات ہے کہ نہ تو خسرو نے خود اور نہ کسی تذکرہ نویس نے یہ لکھا کہ ان کی شادی کب ہوئی اور کہاں ہوئی - تاہم یہ بات مسلمہ ہے کہ ان کی شادی ہوئی تھی اور کئی بچے بھی تھے چنانچہ اس کے متعلق آگے چل کر اور بیان کروں گا۔ دہلی سے روانہ اور اپنے بال بچوں سے رخصت ہوتے وقت خسرو کو ظاہر ہے کہ بہت رنج ہوتا ہوگا اور مجبوراً ہی وہ ملتان واپسی پر راضی ہوتے ہوں گے - ایک بہت دل‌کش غزل میں جو غالباً کسی ایسے ہی موقعے پر لکھی ہوگی، کہتے ہیں :-

مشکلے سخت است تنہا ماندن از دلدار خویش
با کہ گویم حال تنہا ماندن دشوار خویش

آن کہ روزی ناوکی خوردہ است او داند کہ چیست
درد مجروحی کہ نالد از دل افگار خویش

مردہ را حسرت ز مردن نیست ہست از بہر آنک
باز می ماند ز ہم‌صحبتان دیدار خویش

خسرو کے اس پانچ ساله قیام ملتان کا خاتمہ ایک بہت ہی افسوسناک واقعے یعنی مغلوں کے ہاتھوں شہزادہ محمد کی شہادت پر ہوا - جب سے سلطان محمد کو ملتان کی حکومت ملی تھی اسے برابر مغلوں سے واسطہ پڑتا رہا اس لیے کہ مغل کسی نہ کسی سردار کی قیادت میں سال میں ایک دو مرتبہ ضرور ہندوستان کے زرخیز میدانوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح دھاوا بول دیا کرتے تھے اور ان سے اکثر خوں ریز معرکے رہتے تھے جن میں زیادہ تر مغلوں کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑتا تھا اور لوٹ مار کا زیادہ موقع ملنے سے پہلے ہی راہ فرار اختیار کرنا پڑتی تھی - شہزادے کی ان کامیابیوں کا ذکر خسرو نے بھی بعض مرصع قصیدوں میں کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شجاعت اور قابلیت کی دھاک مغلوں کے دلوں پر بیٹھ چکی تھی - لیکن قسمت کو پلٹتے دیر نہیں لگتی اور بعض دفعہ اپنے پر حد سے زیادہ اعتماد ہی انسان کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے -

سنہ ۷۸۳ھ کا آخری مہینہ یعنی ذی الحجہ تھا کہ شہزادہ محمد کو مغلوں کے ایک حملے کی خبر ملی، یہ حملہ ایک مغل سردار تیمور خاں نے، جو اس زمانے میں ہلاکو خاں کے پوتے ارغون خاں کی طرف سے ہرات، بلخ، بخارا، غزنین، غور اور بامیان کے صوبوں کا حاکم تھا - کوئی بیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ کیا اور مغل لشکر بڑھتے ہوئے لاہور اور دیوپال تک پہنچ گیا - شہزادے کو یہ سن کر ایسا غصہ آیا کہ ملتان سے فوراً روانہ ہو گیا اور فوج کی فراہمی یا ساز و سامان کی تیاری کا مطلق خیال نہ کیا - شاہی لشکر تیزی سے بڑھتا ہوا چند گھنٹے میں یعنی صبح سویرے سے دوپہر تک دریائے راوی (آب لاہور) تک پہنچ گیا - مغلوں کا

لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر تھا - تیمور خاں نے پیش دستی
کی اور دریا کو عبور کر کے شہزادے کی فوج پر حملہ کر دیا -
بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کئی مغل سردار اس خوں ریز
معرکے میں کام آئے، ہندوستانی فوج مغلوں سے تعداد میں بہت کم
تھی لیکن اس نے مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے اور آخر انھیں
بھاگتے ہی بنی، شہزادہ اور اس کے ساتھی یہ سمجھے کہ میدان
جیت لیا، اور اس لیے حزم اور دوراندیشی کو خیرباد کہ کر
زیادہ تر ہندوستانی سپاہی بھاگتے ہوئے مغلوں کے تعاقب میں
روانہ ہوگئے - نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادے کے ساتھ کل پانچ سو آدمی
رہ گئے اور چونکہ نماز ظہر کا وقت تنگ ہو رہا تھا ان لوگوں نے
دریا کے کنارے نماز کی نیت باندھ لی - ادھر مغلوں کا ایک سردار
دو ہزار چیدہ سواروں کی ایک جمعیت کے ساتھ کمین گاہ میں بیٹھا
موقع کا منتظر تھا اور شہزادے کو اس طرح مشغول دیکھ کر اس
نے ایک دم یورش کر کے ہندوستانی فوج کو موت کے گھاٹ اتارنا
شروع کیا، حملہ بالکل اچانک ہوا تھا اور ایک اور چار کی نسبت
تھی لیکن پھر بھی شہزادے اور اس کے ساتھیوں نے وہ شجاعت
اور پامردی دکھائی کہ کئی گھنٹے لڑائی رہی اور آخر مغل سردار
اس اندیشے سے کہ کہیں بڑا شاہی لشکر بھی واپس آکر اس
کی فوج پر نہ ٹوٹ پڑے اور اس طرح اسے اپنے ساتھیوں
سے ملنے کا موقع ہی نہ رہے اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو
جمع کر کے بھاگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شومی قسمت سے
ایک تیر شہزادے کے آکے لگا اور ایسا کاری زخم آیا کہ
وہ گر پڑا اور گر کر جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔
اب کیا تھا، ہندوستانی فوج میں بھاگڑ مچ گئی اور مغلوں نے

بھاگتے ہوئے ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا - کئی دریا میں غرق ہوکر شہید ہوئے اور مغل شاہی خیمے کو تاخت و تاراج کر کے اور سیکڑوں قیدی گرفتار کر کے واپس روانہ ہوگئے - اور ان ہی قیدیوں میں امیر خسرو بھی تھے - اپنی اس مصیبت کو خسرو نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے :—(۱)

"کچھ تم نے بھی سنا کہ اس سال ملتان کے قریب مسلمانوں کا میمنہ کفار کے حملے سے کیسے ٹوٹ گیا ؟ میں اس مصیبت کا بیان کیا کروں کہ جس سے ملک الموت بھی بچ کر بھاگنا چاہتا تھا ؟ یا ان حملوں کا کیا حال لکھوں جو کہ شہزادہ غازی نے حیدر کرار کی طرح کافروں پر کئے ؟ لیکن تقدیر کے ان احکام کو جو خود خدا کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں کوئی کس طرح ٹال سکتا ہے..... شہیدوں کا خون زمین تو پانی کی طرح سینچ رہا تھا اور قیدیوں کے گلوں میں رسیوں کے پھندے یوں پڑے تھے جیسے پھول دھاگے میں پرو دیے ہوں" زین کے گرہوں میں ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور لگاموں کے پھندوں میں ان کے گلے گھٹ رہے تھے' اگرچہ میں اس کشت و خون سے زندہ بچ رہا لیکن قید ہوا اور دہشت اور موت کے ڈر سے میرے کمزور جسم میں خون خشک ہوگیا" مجھے ایک پہاڑی نالے کی طرح بھاگنا پڑا اور پیدل چلتے چلتے میرے تلووں میں ہزاروں آبلے پانی کے بلبلوں کی طرح نمودار

(۱) اس واقعے کے حالات کے لیے دیکھیے : فرشتہ ج ۱ ص ۷۸۲ - برنی ص ۱۰۹--۱۱۰ - بدایونی ج ۱ ص ۱۳۰ و ما بعد وغیرہ ' بدایونی نے وہ مشہور مرثیہ بھی نقل کیا ہے جو خواجہ حسن نے اس موقعے پر لکھا تھا -

ہوگئے اور میرے پاؤں کی کھال جگہ جگہ سے کٹ گئی... میرا جسم ایک خزاں دیدہ درخت کی طرح برہنہ تھا اور کانٹوں سے ہزاروں جگہ زخم پڑ گئے تھے، وہ سرکش باغی جو مجھے ہنکائے لیے جا رہا تھا گھوڑے پر یوں بیٹھا تھا جیسے پہاڑ پر چیتا، اس کے منہ سے بری بو آ رہی تھی اور اس کی غلیظ مونچھیں اس کے دہانے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اگر کبھی درماندگی سے ذرا رفتار ہلکی کر دیتا تھا تو وہ کبھی تو اپنا طمانچہ دکھاتا تھا اور کبھی طوقماز، یاس میں آہ بھرتا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ اس بلا سے اب زندہ بچ کر نہ نکلوں گا، مگر اس مہربان خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جس نے مجھے اس سے رہائی دی، نہ تو تیر نے میرے دل کو چھیدا اور نہ تلوار نے میرے جسم کو گھائل کیا"۔

خسرو اس قید مغل سے کب اور کس طرح رہا ہوئے، اس کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان کے کچھ اشعار سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ملتان سے کچھ زیادہ دور نہ گئے تھے کہ قسمت نے ان کی گلو خلاصی کی ایک عجیب صورت پیدا کر دی، چنانچہ اپنی مثنوی خضر خان دول رانی میں کہتے ہیں :—

" ان دنوں جب میں گنہگار بندہ اب سے دور مغلوں کی قید میں گرفتار ہوگیا تھا تو ریگستان میں سر گرداں چلا جا رہا تھا اور گرمی کی شدت سے سر دیگ کی طرح ابل رہا تھا، چلتے چلتے میں اور میرا ساتھی مغل سوار دونوں پیاسے راستے میں ایک چشمے پر پہنچے لیکن اگرچہ پیاس اور گرمی سے میرا تن بدن پھک رہا تھا میں نے اس سلگتی ہوئی آگ پر پانی

سے تیل ڈالنا مناسب نہ سمجھا بلکہ ذرا سے لب تر کر لیے جس سے دل اور جگر میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہوگئی ۔ مگر اس پیاسے سوار اور اس سے زیادہ پیاسے گھوڑے نے خوب سیر ہوکر پانی پینا شروع کیا اور اتنا پیا کہ جلد ہی دونوں گر کر ہلاک ہوگئے ۔"

اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ خسرو کو بہت جلد ہی آزادی مل گئی اور غالباً وہ اسی روز ملتان واپس آگئے اس لیے شبلی نعمانی کا یہ بیان جو غالباً انہوں نے احمد سعید مارہروی کی کتاب "حیات خسرو" سے اخذ کیا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ مغل خسرو کو قید کر کے بلخ لے گئے تھے اور وہاں سے دو سال کے عرصے کے بعد وہ ملتان واپس آئے ۔ غرض جب خسرو ملتان پہنچے تو وہاں عجیب کیفیت دیکھی گھر گھر کہرام مچا ہوا تھا ' ایک تو ایسے ہر دل عزیز اور ہونہار شہزادے کی موت' دوسرے عزیزوں اور دوستوں سے جدائی نے تقریباً ہر شخص کو غم سے دیوانہ بنا رکھا تھا چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہوگیا ' کتنی امیدیں تھیں جو خاک میں مل گئیں' کتنی خوشیاں تھیں جو رنج سے بدل گئیں' اور کتنے گزشتہ کارناموں کا فخر تھا جو ملیامیٹ ہوگیا ' خسرو نے اس اندوہناک واقعے پر دو مرثیے لکھے ہیں اور ان میں مغلوں سے لڑائی' شہزادے کی موت ' اور اہل ملتان کے رنج و الم کی ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے کہ جو سچی بھی ہے اور انتہا درجے کی پر اثر بھی - ان ہی میں سے ایک مرثیہ میں کہتے ہیں -

" سورج اور چاند بھی شہزادے کے خوبصورت چہرے کا ماتم کر رہے تھے اور رات اور دن اس کی جواں مرگی پر گریاں تھے' اسی کے عہد میں چونکہ مرغ اور ماہی بھی امن چین

سے رستے تھے اس لیے ہوا اور پانی میں بھی نالہ و بکا برپا تھا ' ملتان کے باشندے ہر گھر ' ہر گلی اور ہر محلے میں رو رو کر اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور بال نوچ رہے تھے ' رونے کی بلند صداؤں اور ڈھول کی مہیب آوازوں سے رات بھر کسی کو نیند نہ آئی ' آتی بھی تو کس طرح جب ہر ایک گھر میں کسی نہ کسی مرنے والے کا ماتم ہو رہا تھا... ترکوں کی سفیدی اور ہندوؤں کی سیاہی دونوں غائب ہو گئیں اس لیے کہ سب کے سب یکساں نیلے ماتمی لباس میں ملبوس ہیں... نازنینوں کے چہروں کو اب نہ سرخی کی ضرورت ہے اور نہ وسمے کی ' کیونکہ منہ پیٹنے سے ان کے رخسار سرخ ہو رہے ہیں اور ان کے ابرو نیلے ' - (۱)

ایک اور جگہ لڑائی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ' - (۲)

یہ کوئی آفت ہے یا بلا ہے جو آسمان سے نمودار ہوئی ہے ؟

اور یہ کوئی مصیبت ہے یا خود روز قیامت ہے جو آج دنیا کے پیش نظر ہے ؟...

وہ بھی کیا منحوس ساعت تھی جب شہزادہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ملتان سے روانہ ہوا اور اس نے اپنی کافرکش تلوار کو کافروں کے قتل کے لیے میان سے باہر نکال لیا ' جب اسے دشمن کی آمد کی خبر ملی تو اس نے اس کی قوت کی کچھ بھی پروا نہ کرتے ہوئے غصے میں بھر کر فوراً علم اٹھا لیا ' اور جو لشکر موجود تھا اس کے علاوہ اور لشکر حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی ' کیونکہ رستم کو لشکر کا ممنون احسان نہ ہونا چاہیے ! ایک کشش میں وہ ملتان سے لاہور پہنچ گیا اور دل

---

(۱) دیوان وسط الحیات و بدایونی ج ۱ ص ۱۳۸ ۔ (۲) دیوان وسط الحیات ۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے عہد میں بھی کافر کی یہ ہمت
ہوگئی کہ یوں سرکشی اختیار کرے - کیا میں وہی شیر نہیں
ہوں کہ میری تلوار جو آب بھی ہے اور آتش بھی' انھیں ہر
سال پانی اور راکھ میں گھسیٹا کرتی ہے؟ میں نے زمین پر
ان کا اتنا خون بہایا ہے کہ اس میں گدھ یوں تیر رہے ہیں
جیسے پانی پر بطخ اور اس سال ان کے خون سے خاک
ایسی سرخ ہو رہی ہے کہ شفق کو اپنا لال رنگ زمین سے حاصل
کرنا چاہیے - شہزادہ اس فکر میں تھا کہ تقدیر فلک نے تدبیر
کے صفحے پر مشیت ایزدی کا خط کھینچ دیا' محرم کی پہلی
رات کو وہ اپنے لشکر سمیت نکلا اور...عاشورے کے آنے سے پہلے
ہی حسین کی طرح لڑائی کے میدان میں پہنچ گیا اور اس
کے گھوڑے کے پاوؤں کی گردنے سورج کی آنکھ میں سرمہ لگانا
شروع کیا' افسوس! وہ بھی کیا وقت تھا کہ کافر نے اس پر
اپنی فوج سے حملہ کیا' وہ لوگ جوق جوق دریا سے گزر کر آئے
اور ناگاہ اُنھوں نے دھاوا بول دیا'...اب تو شہزادے کے گھوڑے
کو دیکھتا تھا اور اس کے غبار کو آسمان پر گرتے ہوئے' کس طرح
وہ اپنے بادپا گھوڑے کو خاک ایسے دشمنوں کی طرف بڑھا رہا تھا'
کس طرح وہ سپاہیوں کے جوش سے ستاروں میں غلغلہ پیدا کر
رہا تھا اور سواروں کے سیلاب سے دنیا میں زلزلہ رونما کر رہا
تھا' تو نے یہ بھی دیکھا کہ ڈھول کی آواز' گھوڑوں کے ہنہناتے اور
سواروں کی چیخ پکار سے اس نے صحرا و دشت میں کس
طرح لرزہ پیدا کر دیا' بہادر مخالفوں پر حملے کے لیے بیتاب
ہو رہے تھے اور بز دل اس فکر میں تھے کہ بھاگنے کا کوئی موقع
ہاتھ آجائے' اس شاہ مرد پرور کا کام اس میدان کار میں یہ تھا

نہ مردوں کام سا کا کرے اور کام کرنے والے مردوں کہ بر انگیختہ کرے، جب دونوں فوجیں آپس میں گتھ گئیں تو دن تاریک ہوگیا، اور جب خنجر خنجر میں اُلجھا تو آفتاب بھی زرد پڑ گیا، دن غروب ہونے کو تھا کہ اُنہوں نے تلواروں کے زنگاری رنگ سے خورشید لشکر کے سر پر ایک نیا آسمان کھڑا کر دیا، تلواروں کی صفیں دونوں طرف سے بڑھتی ہوئی کنگھی کی طرح نظر آتی تھیں جب وہ ایک دوسرے کے بال کھینچ کر بال سے بال گوندھ رہے تھے، وہ کافر جو ہر طرف سے کافروں کی چوٹی کی طرح ایک دوسرے سے پیوستہ تھے۔ تلوار سے یوں صاف ہونے لگے جیسے اُن ہی کافروں کا آدھا سر صاف تھا، اس سبز میدان میں کشتوں کی لاشیں یوں پڑی تھیں جیسے سبز دیبا میں تصویریں بنی ہوئی ہوں، اس کی شمشیر قتال ایک لمحے کے لیے بھی لڑائی سے فارغ نہ ہوتی تھی، لڑائی کے دن زوال کے وقت سے رات تک یہی حال رہا۔ یارب وہ خون تھا جو صحرا میں بہ رہا تھا یا کوئی دریا کی موج تھی جو دشمنوں کی طرف بڑھ رہی تھی؟ زخمی جب خاک میں جان دے رہے تھے اور تڑپ رہے تھے تو خون ان کے گلوں سے موجزن ہو کر اوپر کو جا رہا تھا، خان لشکر کش صفوں کو ترتیب دینے اور لڑائی کا انتظام کرنے کے لیے اپنے اشہب اقبال کو ہر طرف دوڑا رہا تھا اور وہ دوڑ رہا تھا۔ آسمان فتح کو پھر بالوں سے پکڑ کر واپس کھینچ لے جاتا تھا حالانکہ فتح اُن ملعونوں کی طرف سے بھاگ کر ہماری جانب آنا چاہتی تھی، کافر اس انتظار میں تھے کہ رات آئے اور وہ بچ کر میدان جنگ سے نکل جائیں، کہ ایک دم ہماری ترازو کا پلہ پلٹ گیا، آہ! وہ بھی کیا رات تھی کہ آفتاب آسمان سے گر پڑا تھا، دیو جہاں

میں آگ لگاتے پھر رہے تھے اور شہاب زمین پر پڑا تھا ۔ چونکہ اس آفتاب ملک کے دن ختم ہو چکے تھے اس لئے ابھی کچھ دن باقی تھا کہ آفتاب غروب ہوگیا' اگر حسین کربلا کو بے آبی کا راستہ طے کرنا پڑا تو یہ مقدمہ تھا جو آب سے آگ میں گر پڑا' لوگوں کے دلوں میں مچھلی کے جال کی طرح روزن ہو گئے کیونکہ دیو کے دھوکے سے جم کے ہاتھ سے شاہی انگوٹھی پانی میں گر گئی تھی' کافر خون میں یوں پڑا تھا جیسے گوبر میں گدھا اور مومن کیچڑ میں یوں جیسے میلے پانی میں موتی ۔ ایک فوج دریا میں آب بلا سے گزر رہی تھی اور دوسری فوج دیکھنا' کس سراب کے راستے میں پڑ گئی تھی' سب کے سب تختۂ خاک کے نیچے چلے جا رہے تھے اس لیے کہ اب سب کا کام یوم حساب کے دفتر ہی سے متعلق ہو چکا تھا ۔ کشتوں کے سر' جو خون ناب میں غلطاں تھے ایسے تھے جیسے ناریل پر شنگرف سے نقش بنائے گئے ہوں' بہت سے زندہ ایسے بھی تھے کہ ہیبت کی وجہ سے مردوں کے درمیان بدن پر خون ملے اور آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے ۔ یہ معمولی مصیبت نہ تھی جو میں نے دیکھی بلکہ میں نے خود قیامت کو دیکھ لیا' کیونکہ اگر قیامت ایسی ہی ہوگی تو میں نے اُسے ضرور دیکھ لیا ہے' دائرۂ آسمان نے دیکھو کیا پرکار کی سی گردش کی اور مرکز اسلام کو پرکار کی طرح سرگشتہ کر دیا' تونے دیکھا کہ ذرے نے چشمۂ خورشید کی آب چرا لی ۔ اور پتھر کو دیکھا کہ اس نے لولوے شہوار کا کام تمام کر دیا ؟ اسے ہر سال مغلوں سے دین کی خاطر سروکار رہتا تھا ' آخر دیکھا کہ

اس نے سر بھی اُسی کارِ دین کی نذر کر دیا ؟ جمعہ کا دن اور ذی الحجہ کا آخری روز تھا کہ یہ واقعہ ہوا اور سنہ ۶۸۳ھ کا آخر اور سنہ ۶۸۴ھ کا شروع تھا - "

خسرو کے کتنے ہی عزیز دوست ہوں گے جو اس ہنگامے میں اُن سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے' کیسی کیسی صورتیں ہوں گی جو مغلوں کے بے پناہ تیروں اور بے محابا تلواروں نے ہمیشہ کے واسطے خاک میں پنہاں کر دیں ، اُن دوستوں کی موت کا رنج خسرو کو اپنی جان کی سلامتی کی خوشی سے کہیں زیادہ ہوا اور جگہ جگہ اپنے اس رنج و الم کا بہت ہی دردناک الفاظ میں ذکر کرتے ہیں - چنانچہ اپنے ایک مشہور قصیدے " حکم الحکم " میں کہتے ہیں :— (۱)

"صیاد کے پھندے سے اپنی رہائی سے مجھے کیا حاصل' جب دوستوں اور غم‌خواروں کا وہ سلسلہ ٹوٹ کر پرزے پرزے ہوگیا ؟ چمن کی زمین پر اب رنگا رنگ کے پھول کھل رہے ہیں اور لالے کے رنگ سے صحرا میں چنار کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے' مگر افسوس جب مصیبت کی آندھی نے اُن چہروں کو جو گلاب کی مانند تھے خاک میں بکھیر دیا تو میرا دل گلاب کی کلی کی طرح کس طرح خون نہ ہو جائے ؟ گزشتہ سال کے دوستوں میں سے اس سال کوئی بھی باقی نہیں رہا - کاش یہ سال آخری سال ہوتا ! لاؤ ' ایک جام دو کہ غم غلط کرنے کو اسے پی لوں اور پھر اپنے آنسوؤں سے دوبارہ بھر دوں ! اے ابر بہار پانی کو چھوڑ اور میری طرح خون

---

(۱) دیوان وسط الحیات

کے آنسو برسا ! اب جب کہ سنہ چھ سو چوراسی (۶۸۴) ھے میری عمر چونتیس برس کی ہو گئی ھے - لیکن اس سے کیا حاصل ھے ؟ اس لیے کہ اگر میری عمر کے سال بجائے تیس اور چار کے تیس ہزار بھی ہو جائیں تو ایک ھی بات ھے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ انجام فنا ھے ! اور اگر میں شاعر نہیں بلکہ جادوگر بھی ہو جاؤں تو بھی مجھے معلوم ھے کہ خاک میری منتظر ھے - اگر میں خالی خسرو نہیں بلکہ کیخسرو ہوں تو بھی میری آخری منزل غار ھی ہوگی -"

خسرو نے کئی رباعیوں میں بھی اپنے اس رنج و الم کا اظہار کیا ھے - جن میں سے چند یہ ہیں :

در جنگ مغل کہ تیر کین شد پر تاب
هم تاب ز روی رفت و هم روی ز تاب
زان کشتہ و خستہ کاندر آب افتادند
آن آب همہ خون شد و آن خون همہ آب

قومی کہ در آن عرصۂ کین می خسپند
تریاں کہ بہر چہ چنین می خسپند
بر خاک نہادہ اند سرہا گوئی
در ماتم خویش بر زمین می خسپند

آن گرد بلا ببین کہ انگیختہ شد
ناگہ بہ سر پیر و جوان بیختہ شد
آن روی جوانان سیہ خط بر خاک
گو آب حیات بود هم ریختہ شد

وقت می و باغ و زیلتی بر کردہ
رفتند چو غنچہ دوستان سر کردہ
ای گل مگر این حال شنیدی امروز
رخسارہ ز خون دیدہ پر تر کردہ

جمعی ہمہ گردن برسن کردہ گرو
بودند چو خون کشتگان اندر رو
ہم خار ہمی گرفت دامن کہ مرو
ہم آبلہ می فتاد در پا کہ مرو

آن کیست کہ سوی رفتگان ما رہ جوید
مارا جز از حال اسیران گوید
پای کہ ز برگ گل خراشیدہ شدی
یا رب کہ میان خار چون می پوید

ملتان کے افسوس ناک واقعے کے متعلق مصنف تاریخ فرشتہ نے ایک روایت نقل کی ہے جس کا مقصد غالباً ایک بزرگ کی روحانی کرامات کو مبالغہ آمیز طریقے پر بیان کرنا ہے اور جو بالکل ممکن ہے کہ اُن بزرگ کے کسی عقیدت‌مند مرید کی من گھڑت ہو اس لئے کہ اس قسم کی روایت برنی یا کسی اور مورخ نے نقل نہیں کی - روایت یہ ہے کہ شہزادہ محمد کی بیوی سلطان رکن‌الدین کی بیٹی تھی اور بہت نیک اور پرہیزگار خاتون تھی، ہر چند کہ شہزادے کو اس سے بہت اُنس اور محبت تھی ایک دن شراب کے نشے میں ایسا وارفتہ ہوگیا کہ بیوی کو طلاق دے دی، جب ہوش میں آیا تو اپنے کئے پر بہت نادم ہوا اور رجوع

کرنا چاہا لیکن فقہا نے قانون شرع کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ اب رجوع صرف اس طرح ممکن ہے کہ اس خاتون کا نکاح پہلے کسی اور شخص سے ہو اور پھر وہ طلاق دیدے - چنانچہ شہزادے کو ایسے آدمی کی تلاش ہوئی اور اس نے شیخ صدرالدین کو اس کام کے لیے منتخب کیا اور ان بزرگ نے یہ منظور کر لیا کہ وہ شہزادی کو اپنے نکاح میں لانے کے بعد طلاق دے دیں گے تاکہ شرعی حجت پوری ہوسکے اور وہ دوبارہ سلطان محمد کے نکاح میں آسکے' لیکن نکاح کے بعد ان بزرگ نے طلاق دینے سے انکار کیا اس لیے کہ شہزادی نے کہا کہ میں ایک ایسے نیک اور متقی آدمی کے پاس آنے کے بعد دوبارہ اس "فاسق و فاجر" کے پاس نہیں جانا چاہتی - اور اگرچہ شہزادے نے بہت کوشش کی کہ وہ بزرگ اپنا وعدہ پورا کریں لیکن اُنھوں نے شہزادی کو اس کی خلاف مرضی چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا' اس پر شہزادے کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے شیخ کو کوئی سخت سزا دینے کی ٹھان لی اور اپنے اس ارادے کا اعلان بھی کر دیا' لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے اس ارادے کو پورا کر سکے اسے مغلوں کے حملے کی خبر ملی اور وہ لاہور کی طرف روانہ ہوگیا' اور پھر وہاں سے کبھی واپس نہ آیا' (۱)

اس قسم کی لغو روایتوں پر یقیناً کوئی منصف مزاج آدمی اعتبار نہیں کر سکتا کیونکہ اگر شہزادے کا ان بزرگ کو دھمکانا اور ان کو گزند پہنچانے کا ارادہ قابل عقوبت سمجھا جا سکتا ہے تو ان بزرگ کی وعدہ خلافی بھی لایق ملامت

(۱) نوشتہ ج ۲' ص ۲۱۰-۲۱۱

تصور ہوسکتی ہے، علاوہ ازیں تاریخ فرشتہ میں سلطان محمد کے حسن سیرت اور خوش اطواری کی اس قدر تعریف کی گئی ہے کہ اس کے بعد اسی شہزادے کے متعلق فاسق و فاجر کے الفاظ کا استعمال تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، بالکل اسی قسم کی ایک روایت سلطان غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام الدین اولیا کے متعلق بھی مشہور ہے اور اگرچہ اس دوسری روایت کی صحت کا کچھ گمان ہوسکتا ہے تو بھی وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے - لیکن اس کا ذکر اپنی جگہ پر ہوگا - شہزادہ محمد کی شہادت پر جو عام ماتم ملتان اور دہلی میں ہوا اس کی نیک نفسی اور ہر دل عزیزی کا بین ثبوت ہے، جن لوگوں کو بھی اس سے قریب کا واسطہ پڑا وہ اس کے مداح ہی نہیں بلکہ جان و دل سے گرویدہ ہوگئے اور خسرو کو بھی اس سے ایک خاص محبت اور عقیدت پیدا ہوگئی تھی، چنانچہ برنی کا بیان ہے کہ اس کے انتقال کے عرصے بعد تک خسرو اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر ہماری قسمت اچھی ہوتی تو آج شہزادہ محمد مالک تاج و تخت ہوتا - (۱)

جب اس حادثۂ جانکاہ کی خبر دہلی پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا اور گھر گھر میں صف ماتم بچھ گئی - لوگ امیر خسرو اور سید حسن کے مرثیے پڑھتے تھے اور زار و قطار روتے تھے، سلطان بلبن کی عمر اب آسی ۸۰ سے کچھ زیادہ ہو چکی تھی، بڑھاپے میں ایسے منظور نظر اور قابل بیٹے کا صدمہ ناقابل برداشت تھا، بہت ضبط اور حوصلے کا آدمی تھا اس لیے اپنی

---

(۱) برنی ص ۳۸

ظاہرہ عادات اور اطوار میں کوئی فرق نہ آنے دیا، دربار کا دبدبہ اور شکوہ وہی پہلا سا اب بھی رہا لیکن اصل میں دل ٹوٹ چکا تھا، خلوت میں لوگوں کی نظاروں سے بچ کر اپنے دل کی بھڑاس آنسو بہا کر نکال لیا کرتا تھا، آخر اسی صدمے میں بیمار پڑا اور جب بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اپنے جوانمرگ بیٹے کے خورد سال بچے کیخسرو کو اپنا جانشین نامزد کیا، حالانکہ اپنا چھوٹا بیٹا بغرا خان، جو اب حاکم لکھنوتی تھا، موجود تھا - لیکن بغرا خان سے بلبن شاید کبھی بھی بہت خوش نہ تھا، اور اس موقع پر بھی بجائے اس کے کہ بغرا خان باپ کی دلجوئی اور ہمدردی کے خیال سے دہلی میں کچھ عرصے تک اس کے پاس رہتا وہ بلانے سے آیا بھی تو بہت ہی مختصر قیام کے بعد لکھنوتی واپس چلا گیا، وہ آزاد منش اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور دہلی کی بندشیں اس کے لیے ناقابل برداشت تھیں، اس کا یہ طرز عمل بھی غالباً بلبن کے لیے اسے تخت و تاج سے محروم کرنے کا ایک باعث ہوا - کیخسرو کو ولی عہد قرار دینے کے بعد اپنے باپ کی جگہ ملتان بھیج دیا گیا - اور اس نے وہاں کی حکومت سنبھال لی،

بلبن نے کیخسرو کی نامزدگی اکابر دولت کے سامنے، جن میں فخرالامرا کوتوال دہلی اور اس کا بھتیجا نظام‌الدین وزیر شامل تھے، باقاعدہ کی تھی اور ان دونوں امرا سے خاص طور پر اس کی نگہداشت اور وفاداری کی تلقین کی، لیکن کوتوال شہزادہ محمد سے ہمیشہ برگشتہ خاطر رہا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب بوڑھے بلبن نے سنہ ۶۸۶ھ میں آنکھیں بند کیں تو اس نے اور ذمہ‌دار لوگوں سے سازش کر کے سلطان محمد کے

بھتیجے کو تو عملاً ملتان میں نظر بند کر دیا اور بغرا خان کے نوجوان بیٹے کیقباد کو تخت دہلی پر بٹھا دیا - اس شہزادے کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی' بلبن کی سخت نگرانی اور ہر وقت کی دیکھ بھال میں اس نے تربیت پائی تھی' لیکن فطرتاً رنگین مزاج اور شوقین واقع ہوا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا تاج سر پر رکھتے ہی اس نے رنگ رلیاں منانا شروع کر دیں' جوان تھا اور بہت عرصے اپنی فطرتی خواہشوں کو دباتا رہا تھا' موقع ملتے ہی کھل کھیلا اور خوب جی بھر کر داد عیش و طرب دینے لگا' وہ دربار جس میں کبھی کسی مسخرے یا بھانڈ کا سایہ بھی نہ دکھائی دیتا تھا اور جہاں ارباب عیش و نشاط پر بھی نہ مار سکتے تھے اب راجہ اندر کا اکھاڑا بن گیا' دور دور سے گویے' مسخرے' بھانڈ' بازیگر امنڈے چلے آتے تھے اور بقول برنی ہر دیوار کے سایے میں ایک پری نظر آنے لگی اور ہر بالا خانے پر ایک حور جلوہ نما ہوگئی - ہر گلی سے ایک گویا اور سازندہ ظاہر ہوگیا اور ہر ایک محلے سے کسی نہ کسی بھانڈ یا گویے نے اپنا سر اُٹھایا - (۱) بادشاہ نے دہلی کو چھوڑ کر کیلوکھری کو آباد کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں شاہی محل' خوش نما باغوں اور امرا کے پر تکلف اور شاندار مکانوں سے یہ مقام رشک دہلی ہوگیا' یہاں خوب عیش و طرب کے جلسے رہتے تھے' اور ارباب نشاط کا ایک پورا عملہ دربار شاہی سے متعلق تھا -

خسرو شہزادہ محمد کے انتقال کے بعد دہلی آئے لیکن جلد ہی اپنی والدہ کے پاس پٹیالی چلے گئے اور کچھ عرصے اپنا وقت

---

(۱) برنی : ص ۱۲۹

زیادہ تر وہیں گزارا - اس زمانے میں امیر علی سر جاندار سے اُن کے مراسم بہت بڑھ گئے اور اس امیر نے خسرو کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ' حاتم کے لقب سے مشہور تھا اور واقعی داد سخاوت دینے میں حاتم سے کم نہ تھا ' وزیر نظام الدین نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ خسرو کو دربار شاہی میں بلا لے' لیکن خسرو بھلا اس وزیر پر کیونکر اعتماد کرسکتے تھے جس نے اپنے آقا کی آخری خواہش کا کچھ بھی پاس نہ کیا اور خسرو کے خاص مربی اور مہربان' شہزادہ محمد ' کے بیٹے کو تخت سے محروم کر دیا ' اس لیے اُنھوں نے امیر علی کا ساتھ نہ چھوڑا - نظام الدین کا اقتدار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کیقباد کے مزاج میں بہت دخیل ہوگیا تھا - اپنے اس رسوخ سے اس نے ناجائز فائدہ اُٹھا کر پہلے تو اپنے ایک رقیب اور مد مقابل کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد کیقباد کے کان کیخسرو کے خلاف بھرنا شروع کئے - آخر اس بدقسمت شہزادے کو ملتان سے کسی بہانے سے دہلی بلوایا گیا اور راستے میں رہتک کے مقام پر اسے قتل کر دیا گیا '

کیقباد کی بدعنوانیوں اور اس کے وزیر نظام الدین کی ناشائستہ حرکتوں کی خبر بغرا خان کو لکھنوتی پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا - باپ کے انتقال کے بعد اپنے بیٹے کو تخت دہلی پر بیٹھے دیکھ کر اسے کچھ نہ کچھ رشک اور حسد ضرور پیدا ہوا ہوگا ' لیکن فطرتی تساہل اور آرام طلبی نے اسے اس کی مہلت نہ دی کہ وہ بیٹے سے تخت و تاج کے لیے برسر مخاصمت ہو' اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی یہ نصیحت بھی یاد تھی کہ لکھنوتی اور بنگالے کی حکومت پر اسے قناعت کرنا چاہیے اور دہلی میں

جو بھی حکمران ہو اس کی اطاعت اور وفاداری کو اپنا فرض سمجھنا چاھیے - لیکن دھلی کے ان حالات کو معلوم کر کے اس کا پیمانۂ صبر لبریز ھوگیا اور اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ بیٹے کو قرار واقعی فہمایش کرے اور اسے نظام الدین کے پنجے سے چھڑائے' یہ ٹھان کر اس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ لکھنوتی سے دھلی کی طرف یلغار شروع کر دی' ادھر کیقباد کو بھی باپ کے ارادوں کی اطلاع ملی اور اس نے بھی فوج فراھم کر کے پیش دستی کے طور پر دھلی سے لکھنوتی کا رخ کیا' اس عیش پسند بادشاہ کو مغلوں کے خلاف ایک کامیابی حاصل ہو جانے سے بظاھر اپنی جنگی اور فوجی قابلیت کا بھی کچھ زعم ھوگیا تھا اور ھر چند کہ یہ فتح اس کے بعض قابل سپہ سالاروں کی سعی سے حاصل ھوئی تھی' لیکن اس میں اپنی بڑائی اور نمود کا اچھا موقع مل گیا تھا - مغلوں نے سامانے سے لاھور تک کے علاقے پر تاخت کر کے خوب لوٹ مار کی لیکن شاھی فوجوں نے آخر کار انھیں ایک فیصلہ کن شکست دے کر سرحد پار بھگا دیا اور سیکڑوں ھزاروں مغل قتل ھوئے یا گرفتار ھو کر دھلی لائے گئے - ان سب کو بہت بےدردی سے قتل کر دیا گیا اور ان کے سر کاٹ کاٹ کر کوچۂ و بازار میں نیزوں پر گھمائے گئے - اس واقعے کا خاصا مفصل ذکر خسرو نے اپنی مثنوی قران السعدین میں کیا ھے' مغلوں کی اس شکست کے بعد نظام الدین نے ایک اور بہت ھی قابل ملامت حرکت یہ کی کہ بادشاہ کو ان مغلوں سے بھی بدظن کر دیا جو کچھ عرصے سے دھلی کے نواح میں' آباد تھے اور ان سب کا قتل عام کروا کے' اس وزیر نے اپنے نامۂ اعمال کو اور سیاہ کر لیا -

چوتھا باب

کیقباد اور بغرا خان کی مخالفت اور مصالحت؛ خسرو کی دربار شاہی سے پہلی مرتبہ باقاعدہ وابستگی

بہر حال اُدھر تو بغرا خان دہلی کی طرف بڑھتا آ رہا تھا اور اِدھر کیقباد لکھنوتی کی طرف کوچ بکوچ چلا جا رہا تھا۔ آخر دریائے سرو یا سرجو پر جا کر دونوں فوجوں کا اِتصال ہوا اور اب صورت یہ تھی کہ دریا کے ایک طرف تو باپ اور دوسری طرف بیٹا خیمہ‌زن تھے اور ذرا سی چنگاری کی ضرورت تھی جو دونوں طرفوں کے جذبات کو مشتعل کر کے جنگ کی آگ کو ایسا بھڑکا دیتی کہ ہندوستان کی حکومت کا خرمن اگر جل کر راکھ نہ ہو جاتا تو کم از کم جھلس تو ضرور ہی جاتا؛ لیکن بعض عقلمند اور معاملہ فہم اُمرا کی کوشش سے یہ خطرناک صورت پیدا نہ ہونے پائی۔ ان اُمرا میں امیر علی سر جاندار خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

یہ امیر کیقباد کے لشکر کے ساتھ تھا اور اسی تعلق کی بنا پر جو اسے اب خسرو سے تھا اس نے انھیں بھی اس سفر میں ہمراہ لے لیا تھا اور اس طرح خسرو کو ان سب واقعات کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ قران السعدین میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ سب چشم‌دیدہ واقعات ہیں جنھیں بلا کم و کاست شاعرانہ

خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دیا ہے - غرض یہ دونوں لشکر کئی روز تک آمنے سامنے پڑے رہے اور آپس میں نامۂ و پیام ہوتا رہا - ایک مرتبہ کیقباد نے اپنے بیٹے کیکاوس کو قیمتی تحفے تحایف دے کر بغرا خان کے پاس بھیجا اور اسی طرح بغرا خان نے اپنے چھوٹے بیٹے کیامورث کو کیقباد کی خدمت میں روانہ کیا ' آپس کے کشیدہ تعلقات رفتہ رفتہ استوار ہوتے گئے ' یہاں تک کہ باپ اور بیٹے کی ملاقات کا سامان فراہم ہوگیا ' ابتدا باپ کی طرف سے ہوئی اس لیے کہ بیٹا آخر بادشاہ تھا ' چنانچہ بغرا خان ایک آراستہ پیراستہ کشتی میں جو سال کی لکڑی سے بنائی گئی تھی اور دس سال کے عرصے میں تیار ہوئی تھی دریا کے پار پہنچا - بیٹے کو دیکھ کر پدری شفقت جوش میں آئی ' ادھر بیٹے کے دل میں بھی باپ کی محبت نے خروش کیا اور تخت سے اتر آیا ' دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا اور اس طرح بقول خسرو دونوں دریا تشنہ لب ایک دوسرے سے ملے ' اور ان کی تشنگی کو آنسوؤں کا وہ سیلاب بھی فرو نہ کر سکا جو دونوں کی آنکھوں سے رواں تھا - (۱)

دوسرے دن کیقباد ملاقات باز دید کے لیے گیا اور یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا - اس طرح بچھڑے ہوئے دوستوں کو بھی ایک دوسرے سے ملنے کا اچھا موقع مل گیا اور خسرو کو عرصے کے بعد اپنے پرانے مربی اور سر پرست شمس الدین دبیر سے دوبارہ نیاز اور شرف ملاقات حاصل ہوا -

اس جھگڑے کے اس خوش اسلوبی سے طے ہو جانے پر بہت

---

(۱) قران السعدین

خوشیاں منائی گئیں اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوئیں ' شاعروں نے قصیدے اور تہنیت کی نظمیں سنائیں اور بیش قدر انعام پائے ' چنانچہ خسرو بھی باپ بیٹے کی ملاقات کی خوشی میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں :—

"خوش قسمت ہے وہ ملک کہ جہاں دو بادشاہ ایک ہوگئے اور خوش نصیب ہے وہ محفل جن میں دو جام ایک دوسرے سے مل گئے - بیٹا بادشاہ اور باپ بھی سلطان ' اب ملک کی رونق دیکھیے جب کہ دو سلطان ایک ہوگئے ' دنیا پر حکومت کے لیے دو زبردست بادشاہ متحد ہوگئے ہیں ' ایک ناصر زماں محمود سلطان (بغرا خان) جس کی حکومت سلطنت کے چار ارکان پر پھیلی ہوئی ہے اور دوسرا معزالدنیا کیقباد جس کے ماتحت ایران بھی ہے اور توران بھی"

ان دلچسپ صحبتوں کا ذکر قران السعدین کے علاوہ خسرو نے نجم الدین حسن کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے جو اعجاز خسروی میں موجود ہے -

کچھ روز کے بعد کیقباد نے باپ سے رخصت چاہی اور باپ نے بہت کچھ پند و نصائح کے بعد بیٹے کو الوداع کہا - ان نصیحتوں میں سے ایک خاص نصیحت یہ تھی کہ کیقباد کو کسی طرح نظام الدین کے چنگل سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہیے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد نے باپ کی اس وصیت پر یا تو قصداً عمل نہ کیا یا اسے اس کا موقع نہیں ملا کیونکہ نظام الدین اس کے آخر عہد تک بر سر اقتدار رہا اور اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی کیقباد نے اسے زہر دلوا کر مروایا تھا - شاہی لشکر کے ساتھ خسرو بھی دہلی کی طرف روانہ ہوئے ' مگر قسمت میں ابھی

اپنے اعزہ و اقارب سے ملنا نہ لکھا تھا، کیونکہ بادشاہ جب کنتپور یا گلتپور پہنچا تو وہاں اس نے خان جہاں امیر علی کو اودھ کا حاکم نامزد کر کے پیچھے چھوڑ دیا - خسرو تو اب اس امیر سے وابستہ تھے ہی - انھیں بھی ٹھہرنا پڑا اور برابر دو سال تک ان کا قیام اودھ یا عوض (اجودھیا) کے قدیم شہر میں رہا - اپنے شاہی لشکر سے اس طرح جدا ہو جانے کا خسرو کو بہت قلق ہوا چنانچہ اپنے ایک خط میں اعجاز خسروی میں یوں لکھتے ہیں :- (۱)

" اس آقا (امیر علی) کے حکم کی تعمیل میں مجھے اپنے ان عزیز دوستوں کی صحبت سے علحدہ ہونا پڑا جو شاہی لشکر کے ساتھ تھے اور ہندوستان کی سیاہی کی طرف واپس جانا پڑا یعنی اقلیم زحل کی طرف، برسات کا موسم تھا اور مجھے ایسے وقت میں سفر کرنا پڑا جب بارش خوب زور پر تھی، دوستوں کی جدائی سے میری آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور بادل میری ہمدردی میں گریاں تھے - میرے گھوڑے کا پاؤں پانی کے گڑھوں میں پھسل پھسل جاتا تھا اور بجلی میری پریشانی اور مصیبت پر ہنستی تھی، مینہ کی بوندیں ٹپک ٹپک کر میرے آنسوؤں کا پتہ دیتی تھیں اور بجلی کی چمک میرے دل کے سوز و اضطراب کو ظاہر کرتی تھی، اس مصیبت سے آخر کار میں اودھ پہنچا - "

اودھ کا یہ مجبوری قیام خسرو کے لیے زیادہ خوش آیند نہ تھا، چنانچہ اس زمانے میں اپنے عزیز دوست تاج الدین زاہد کو انھوں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا تھا جو اعجاز خسروی میں

(۱) اعجاز خسروی، رسالہ ۵، ص ۲۹ و ما بعد

موجود ہے (۱) اور جس کے بعض حصے دلچسپی سے خالی نہیں ہیں - اس خط میں لکھتے ہیں کہ :

"جب میں تم سے یوں جدا ہوا جیسے روشنی سے محروم سایہ تو میں نے سفر شروع کیا لیکن حال یہ تھا کہ آنکھوں سے خون کے آنسو بہ رہے تھے - دل میں درد تھا اور آنکھوں میں دید کا شوق' منزل سامنے تھی مگر میری نظریں پیچھے لگی ہوئی تھیں' جوں جوں آگے بڑھا رنج بھی بڑھتا گیا اور میرے قدموں سے زیادہ تیزی کے ساتھ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے' کوئی زاد رہ نہ تھا بجز غم اور دل میں کوئی یاد تھی تو تمہاری' ہر منزل سے آنسو بہاتا ہوا شاہی لشکر کے ساتھ چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ دو ماہ کے طویل سفر کے بعد جب بادشاہ اودھ پہنچے تو اُنھوں نے ہمارے خان (امیر علی) کو اودھ کی حکومت عنایت کر دی' اودھ کا شہر تو خان کو تفویض ہوا اور مجھے ایک جاں گسل زہر نصیب' دل میں صبر نہ تھا' مگر ٹھیرنے پر مجبور تھا' اودھ کا شہر بلا شبہہ بہت دل فریب ہے مگر تمہارے بغیر مجھے کچھ بھی نہیں بھاتا' شہر کیا ایک باغ ہے جہاں آدمی خوشی اور اطمینان کے ساتھ بسر کر سکتا ہے' اس کی زمین دنیا کے لیے زینت ہے اور اُس کے اطراف میں اسباب طرب جمع ہیں' دریاے سرو اس کے پاس سے گزرتا ہے جس کے دیکھنے ہی سے پیاسے کی پیاس بجھ جاتی ہے' خوشی کے سب لوازم بکثرت موجود ہیں' پھولوں اور شراب کی بہتات ہے' باغوں میں درختوں کی شاخیں پھلوں کے

---

(۱) اعجاز خسروی رسالہ ۵ ص ۴۰ و ما بعد - یہ خط بحسب سنہ ۶۸۷ ھ میں لکھا گیا تھا -

بوجھ سے جھکی جاتی ہیں ، انگور ، کھٹے انار ، نارنگیاں اور بیسیوں
اور قسم کے پھل جن کے ہندوستانی نام ہیں ، میٹھے اور ذائقہ دار ،
مثلاً کیلے اور آم ، دماغ کو طراوت بخشتے ہیں ، چمن میں سدا
بہار پھول کھل رہے ہیں اور پرندوں کے سریلے اور اداس نغموں سے
فضا گونج رہی ہے - مولسری ، چمپا اور جوہی سے چمن بھرپور ہیں ،
ان کے علاوہ کیوڑا ہے جس کے سیمیں نیزے کے سامنے گلاب کا بھی
خون بہتا ہے ، پھر طرح طرح کی خوشبو دار چیزیں اور گرم مسالے ،
عود ، عنبر ، مشک ، کافور اور قرنفل بھی ہیں اور کپڑے ایسے کہ
عمر گزشتہ کو واپس لے آئیں ، تن کی زینت اور بدن کا زیب ،
مثلاً جنبھرنلی اور بہاری کہ موسم بہار کا ایک خوش نما تحفہ معلوم
ہوتے ہیں اور بدن پر ایسے ہلکے معلوم ہوتے ہیں جیسے لالے پر
چاندنی یا صبح کے وقت گلاب پر قطرۂ شبنم -

یہاں کے باشندے سب کے سب مہمان نواز ، خوش اخلاق ،
نیک مزاج ، پسندیدہ اطوار ، وفا شعار اور دریا دل ہیں -
امیر غریب سب مطمئن اور خوش ہیں اور اپنے اپنے کار و بار میں
مشغول ، حاکم وہ ملک معظم اور خان منصور ، اختیارالدین ،
حاتم خان ، علی بن ایبک ہے جو اپنے ہمراہیوں کو مدحیہ قصیدوں
کے صلے میں بیش قیمت موتیوں کے تحفے عنایت کرتا ہے ، مجھ
پر تو وہ خاص طور پر مہربان اور کرم فرما ہے ، اس طرح خوشی
کے کسی ساز سامان کی میرے لیے کمی نہیں اور نہ میں کسی
چیز کا محتاج ہوں لیکن تم سے جدائی نے مجھے اب گور لا کھڑا کیا
ہے - شراب کا جام کبھی پی کر خالی نہیں کرتا مگر اُسے دوبارہ
اپنے خون کے آنسوؤں سے بھرتا ہوں ، تم یہ کیوں تصور کرتے ہو کہ
میں جامہائے شراب میں مزے سے بیٹھا ہوں اور میرے چاروں

طرف نغمہ و سرود کی خوش آیند آوازیں اٹھ رہی ہیں؟ تم میرے آنسوؤں کی شراب کو میری آنکھوں سے گرتے دیکھو اور میرے جلے ہوئے دل کا نالہ بھی تو سنو! میرا پیالہ شراب سے لبریز ہے لیکن مجھے یہ شراب ایسی تلخ معلوم ہوتی ہے جیسے زہر ۔ یہ سچ ہے کہ پیڑ سے توڑ کر گلاب کا پھول کچھ عرصے گلدان میں زندہ رہ سکتا ہے مگر پھر جلد مرجھا بھی جاتا ہے"۔

خسرو کو اپنی ضعیف والدہ خاص طور پر یاد آتی رہتی تھیں چنانچہ اسی خط میں آگے چل کر کہتے ہیں "خان کی عنایتوں نے پردیس کو ایسا خوش گوار بنا دیا کہ مجھے اپنا گھر بھول گیا" یہ دو سال کا عرصہ "جو میں نے یہاں بسر کیا مال و دولت کے لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنے مہربان آقا کی دل جوئی کے خیال سے گزارا' میری ضعیف سن رسیدہ والدہ دہلی میں تھیں اور مجھے بہت یاد کرتی رہتی تھیں' ان کے شب و روز مجھ نالائق کے فکر میں بہت اضطراب اور بے چینی سے گزرتے تھے' اور میری جدائی کے غم سے بے قرار ہو کر مجھے برابر واپس آنے کے لیے لکھتی رہتی تھیں - میرا دل بھی ان کے غم میں بے چین رہتا تھا کچھ عرصے میں اپنا غم کسی نہ کسی طرح غلط کرتا رہا - لیکن جب تاب ضبط نہ رہی اور شوق بے قابو ہوگیا تو میں نے اپنا ماجرا خان کے سامنے ایک عرض حال کی شکل میں پیش کر دیا - خان نے اپنی مہربانی اور کرم کے مطابق میری مجبوری کو دیکھا اور بخوشی مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی - سفر خرچ کے لیے اس نے مجھے دو کشتیاں سونے کے سکوں کی بھری ہوئی عنایت کیں اور اس طرح اس کے احسان کی شکر گزاری سے اپنے دل کو پر کر کے میں نے راہ سفر اختیار کی' شوق دیدہ

مجھے کشاں کشاں لیے جاتا تھا اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ رہے تھے - میں نے راستہ یوں طے کیا جیسے کوئی پیکان تیز یا تیر پراں ہو اور ایک مہینے تک کہیں قیام نہیں کیا ' کیونکہ سفر لمبا تھا اور اشتیاق شدید ' یہاں تک عید کے چاند کی طرح خوش خوش ذی القعد کے مہینے میں دہلی پہنچا ' گلاب کی طرح ہنس ہنس کر میں نے اپنی بھوکی نگاہیں عزیز چہروں پر ڈالیں - دوستوں کی زیارت کا شوق پورا ہوا اور دلی مقصد حاصل ہوگیا - گویا ایک پرند جس نے خزاں کی سختیاں جھیلی ہوں ایک پر بہار چمن میں پہنچ جائے یا کوئی پیاسا آب حیات کے چشمے کو پا لے - میرا دل ' جو رنج سے مردہ ہو چکا تھا ' اپنے عزیزوں کو دیکھ کر دوبارہ زندہ ہوگیا اور ہزاروں ممنون محبت جذبات کے ساتھ میں نے اپنی آنکھیں اپنی مہربان ماں کے قدموں پر رکھ دیں ' میری والدہ نے جن کو میری جدائی نے بیمار اور کمزور کر دیا تھا ' مہر و محبت کے چہرے سے نقاب الٹ دی اور مجھے گلے لگا کر خوشی کے آنسو بہا دیے ' اُن کا غم‌دیدہ دل اب خوش اور مطمئن ہوگیا اور جو جو منتیں اُنھوں نے مان رکھی تھیں سب پوری کیں "

اس طرح خسرو دوبارہ دہلی پہنچے ' کیقباد کے اطوار و عادات میں ابھی تک کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا تھا - باپ کی نصیحتوں کا اگر کچھ اثر ہوا بھی ہوگا تو وہ دہلی آتے آتے زائل ہوگیا تھا اس لیے کہ نظام‌الدین اور اسی قماش کے اور امرا یہ نہیں چاہتے تھے کہ کیقباد اپنی عیش پرستی ترک کر کے امور سلطنت کی طرف متوجہ ہو - اس طرح وہ اختیار اور اقتدار جو انھیں اب تک حاصل رہا تھا نہ رہتا - انہی لوگوں کی ترغیب اور تحریص کا غالباً یہ نتیجہ تھا کہ بادشاہ کی سواری

جوں جوں دہلی کے قریب پہنچتی جاتی تھی حسین رہزنوں اور خوبصورت غارت‌گروں کا جمگھٹ اس کے گرد و پیش بڑھتا جاتا تھا - بادشاہ میں بھلا یہ قوت ضبط کہاں تھی کہ ان عشوہ فروش اور زاہد فریب حسینوں کا مقابلہ پامردی سے کر سکتا ' دہلی پہنچا تو وہی ندیم تھے اور وہی مصاحب ' وہی پرانی صحبتیں اور وہی لیل و نہار - لیکن دل پر باپ کے ایثار اور محبت کا کچھ نقش باقی تھا اور ابھی دریاے سرو کے کنارے کی دلچسپ ملاقاتوں کی یاد دل سے بالکل محو نہ ہوئی تھی ' اس لیے اس نے خسرو کو ایک دن بلا بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس واقعے کو نظم کر دیں ' خسرو کو دہلی واپس آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے - لیکن بادشاہ کے فرمان کی تعمیل ضروری تھی خصوصاً اس لیے کہ دربار شاہی میں یہ ان کی پہلی طلبی تھی ' مدت کے بعد ان کی مراد بر آئی تھی ' وہ اب شہرت اور عظمت کے زینے کی آخری سیڑھی تک پہنچ گئے تھے کیونکہ بادشاہ کے دربار میں رسائی اس زمانے میں کسی صاحب کمال کے لیے گویا معراج تھی - اس ملاقات کے دوران میں بادشاہ سے ان کی جو گفتگو ہوئی اسے انھوں نے قران السعدین میں خود بہت دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے - بادشاہ نے اس قصیدے کے صلے میں جو خسرو اس موقع کے لیے لکھ کر لے گئے تھے انھیں انعام اکرام دینے کے بعد ان سے یوں خطاب کیا :-

" اے ختم الشعرا جس کے دستر خوان کے بچے کھچے ٹکڑوں سے اوروں کا پیٹ بھرتا ہے ' ہمیں تم سے ایک درخواست کرنا ہے - اگر تم اپنے درخشاں خیال کی مدد سے میری خواہش کو پورا

کر دو تو تم جتنا سونا بھی مانگو میں دینے کو تیار ہوں تاکہ تمہیں پھر کبھی احتیاج کی زحمت نہ ہو۔ اس پر خسرو نے جواب دیا کہ : اے بادشاہ جمشید فر، جس کا مثل تخت نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا، میں آپ کا احسان مند غلام اس قابل کہاں کہ آپ کا سا شخص مجھ سے کوئی درخواست کرے، آپ ہی ہر غلام کو جو کچھ بھی وہ مانگے دیتے ہیں، میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں، گلستاں ایک گلاب کے پھول سے رنگ و بو نہیں لیتا اور بادل ایک قطرے سے پانی کا جویاں نہیں ہوتا۔ بادشاہ، جس کے قبضۂ قدرت میں تمام دنیا ہے اگر مجھ سے میری جان بھی طلب کرے تو وہ تو اب بھی انہی کی ہے، اپنے پریشان دماغ اور کند اور سست ذہن سے جو کچھ بھی مجھے حاصل ہو سکتا ہے وہ تو ٹوٹی پھوٹی فارسی ہے، اگر آپ کا مدعا اس سے پورا ہو سکتا ہے تو میں تعمیل حکم کو عین خوش قسمتی خیال کروں گا "۔ اس پر بادشاہ نے کہا : اے ساحر! ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ دقتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے تم میری خاطر سے شاعری کے مردہ جسم میں ایک نئی جان ڈال دو، اس طرح کہ تم دونوں سلطانوں کی ملاقات کا حال نظم کرو یعنی اپنی زبان کے جادو سے مہربان باپ سے میری ملاقات کا قصہ نظم کرو تاکہ اگر کبھی جدائی کا غم مجھے بےچین کر دے تو اُس قصے کو پڑھ کر میرے دل کو کچھ سکون حاصل ہو سکے "۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے خزانچی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور خزانچی جلدی سے خسرو کو بادشاہ کے حضور سے باہر لے گیا اور انہیں ایک مہر زر، اور خلعت شاہی دے کر رخصت کر دیا۔

بادشاہ کے اس احسان اور توجہ کا خسرو پر کافی اثر ہوا اور اسی لیے کہتے ہیں کہ: تعجب ہے کہ مجھے اس عزت کے لیے منتخب کیا گیا ' کہ میرا نفع اس قدر زیادہ ہو حالانکہ میرے پاس کوئی سرمایہ بھی نہیں! نہ تو میری قلم کو ہنر سے کوئی بہرہ حاصل ہے اور نہ میرے ورق پر گوہر سے کوئی چمک دمک دی گئی ہے۔ ... محل شاہی سے نکل کر میں اپنے غریب خانے پر آیا ' پریشان بھی تھا اور شرمندہ بھی ' موتیوں کے بوجھ کے نیچے میری گردن جھک رہی تھی اور اس لیے اب یہ میرا فرض تھا کہ بادشاہ کی خدمت کروں ' لوح دل کو ہاتھ میں لے کر میں ایک گوشے میں جا بیٹھا ' عقل مبہوت تھی ' اور خیالات منتشر ' میں نے خود کو اپنے ساتھیوں سے پوشیدہ کر لیا ' نہیں بلکہ جن و انس سے روپوش ہو بیٹھا ' آخر کچھ عرصے کے بعد دل سے خیالات کا ایک چشمہ رواں ہو گیا اور میرے ذہن کے دھوئیں سے قلم سیاہ ہو گیا ' چونکہ جب میں متفکر تھا تو میں نے اپنے خدا ہی پر بھروسا رکھا اس لیے میرے اس خاکی نفس سے ایک بیش قیمت خزانہ نمودار ہو گیا۔"

یہ خزانہ مثنوی قران السعدین ہی جو بقول خسرو چھ مہینے کی سخت کاوش کے بعد رمضان سنہ ۶۸۸ ھ میں ' پوری ہوئی اور جو بعض لحاظ سے خسرو کی مثنویوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے ' خسرو کے بعض تذکرہ نویسوں کو اس پر تعجب ہے کہ انھوں نے کیقباد جیسے عیش پرست اور نا اہل بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اتنی محنت کی اور ایسی گراں بہا تصنیف اس کے نام پر کی ' لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ کیقباد میں اگر بہت سی برائیاں تھیں تو بعض

خوبیاں بھی موجود تھیں ' حسین اور خوب‌رو جوان تھا ' مزاج کا اچھا اور دل کا سخی واقع ہوا تھا ' علم و ہنر کا بھی بڑا قدردان تھا اور اگر اُسے اچھی صحبت مل جاتی تو ممکن ہے کہ بادشاہ ہونے کے بعد اس سے وہ بے اعتدالیاں سرزد نہ ہوتیں جن کا انجام قبل از وقت موت ہوا اس کے اخلاق اور اطوار کو بگاڑنے میں سب سے بڑا حصہ اس کے وزیر نظام‌الدین کا تھا ورنہ اپنی طبیعت سے وہ برا آدمی نہ تھا ' اس کے علاوہ ایک خصوصیت جو اسے حاصل تھی وہ شائد اس زمانے کے کسی اور بادشاہ میں نہ پائی جاتی یعنی یہ کہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے وہ شاہی نسل سے تھا ' چنانچہ خسرو کہتے ہیں :—

پشت بہ پشت از دو طرف شہریار
هر طرف از هر دو طرف تاجدار

شمس جہاں‌گیر جد با فرش
اظہر من شمس جد دیگرش

ناصر حق شاہ فرشتہ سرشت
خوی خوشش نسخۂ باغ بہشت

جد سوم شاہ غیاث اسم
حاکم دوران ز عرب تا عجم

هر سہ جدش کعبۂ ارکان جود
کردہ دو عالم سہ جدش را سجود

یعنی کیقباد کا دادا غیاث‌الدین بلبن سلطان شمس‌الدین التمش کا نواسا تھا اور اس کی اپنی ماں سلطان ناصرالدین محمود کی بیٹی تھی یا دوسرے لفظوں میں التمش کی نواسی تھی ' پھر ایک اور بات جو خسرو کے لیے اس مثنوی کے لکھنے کی محرک

ہوئی یہ تھی کہ خسرو نے وہ سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے اور اس لیے انھیں ان واقعات سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی خود کیقباد کو ؛ اس طرح کیقباد کی خواہش پورا کرنے میں انھیں اور بھی تامل نہ ہوا ہوگا -

بہر حال کیقباد پہلا بادشاہ تھا جس کے دربار میں خسرو ایک مصاحب اور ندیم ہی کی صورت میں نہیں بلکہ ملک الشعراء کی حیثیت سے پہنچے - اور آیندہ بادشاہوں کے عہد میں ان کی یہ حیثیت برابر قائم رہی ؛ کیقباد کی زندگی نے زیادہ عرصے وفا نہ کی - اور سنہ ۶۸۹ ھ میں اپنے وزیر نظام الدین کو زہر دلوانے کے بعد وہ خود بھی راہی ملک بقا ہوگیا -

اس کے انتقال کی کیفیت یہ ہے کہ نظام الدین سے اپنا پیچھا چھڑانے کے بعد کیقباد نے سامانے کے حاکم ملک جلال الدین فیروز یغرش خلجی کو دہلی بلا کر اسے شاستی خاں کا خطاب دیا اور عارض ممالک کے عہدے پر مامور کر دیا ؛ فیروز خلجی کی عمر اس وقت کوئی ستر ۷۰ سال کی تھی اور اس نے کئی سال سامانے میں رہ کر مغلوں کے حملوں کی روک تھام اور سرحدی علاقوں میں امن امان قائم رکھنے میں بہت سے کار نمایاں دکھائے تھے ؛ اس تقرر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کیقباد بیمار پڑ گیا اور بیماری دن بدن زیادہ خطرناک شکل اختیار کرتی گئی یہاں تک کہ وہ مفلوج ہو کر چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گیا - بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر ترکوں نے آپس میں سازش شروع کی اور کیقباد کی زندگی ہی میں اس کے خورد سال بیٹے کیامورث کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا ؛ لیکن خلجی امرا جن کا سردار فیروز خلجی تھا اور جن

میں بعض اور سر کردہ ملک مثلاً ملک ایتمرکچن باربک اور ملک ایتمر سرخہ بھی شامل تھے ' ان ترکوں سے مخاصمت رکھے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں خانہ جنگی کی نوبت آئی' ترکوں کو شکست ہوئی اور انھیں اطراف و جوانب میں منتشر کر دیا گیا ' کیامورث بدستور بادشاہ رہا اور ملک فیروز خلجی اس کا اتالیق بن گیا اور اس طرح سلطنت کا کل انتظام اس کے ہاتھ میں آگیا ' اس کے کچھ عرصے بعد ایک ترک نے جسے کیقباد سے کوئی ذاتی عداوت تھی اسے بہت ہی بےدردی سے اس کے بستر علالت پر قتل کر دیا ' اسی شاندار قصر نو میں جہاں کبھی اس کے دبدبے اور ہیبت سے لوگ لرزہ بر اندام رہتے تھے اس کا نحیف اور لاغر جسم ' بےجان اور خون میں غلطاں پڑا ہوا نیرنگی زمانہ کا پتہ دے رہا تھا -

جلال الدین فیروز خلجی اور تخت دہلی کے درمیان اب اگر کوئی حائل تھا تو وہ بیچارہ خورد سال کیامورث ہی تھا ' اس کو بھی راستے سے ہٹانے کا جلد ہی انتظام کر دیا گیا ' چنانچہ سنہ ۶۸۹ ھ میں بوڑھے فیروز خلجی نے اسے معزول کر کے سلطان کا لقب اختیار کر لیا اور اس طرح اپنے چتر سفید کو بادشاہت کے چتر سیاہ سے تبدیل کر کے ہندوستان کی وسیع سلطنت کا مالک بن بیٹھا ' خسرو کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فیروز خلجی کے بادشاہ ہونے سے پہلے ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے ' کیونکہ غرۃالکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں :—

"کیقباد کا چاہیتا بیٹا شمس الدین (کیامورث) بادشاہ بنایا گیا اور شائستہ خاں نے اُسے اپنی حفاظت اور اتالیقی میں لے لیا - میں اس آسمان فیروزی کا عطارد (سکریٹری)

اور مصاحب خاص ہو گیا، میری خوش نصیبی سے فیروز شاہ کا علم فیروزی بادشاہت کے چتر سیاہ سے مبدل ہو گیا، اور خدا کی مہربانی سے اس نے اپنے مبارک قدموں سے تخت سلطنت کو زینت بخشی۔" (۱)

ایک اور شخص جس سے فیروز خلجی کو کچھ خطرہ ہو سکتا تھا بلبن کا بھتیجا اور خسرو کا سب سے پہلا مربی علاءالدین کشلو خان تھا، اسے دہلی سے دور رکھنے کی یہ تدبیر کی گئی کہ کڑا مانک‌پور کی حکومت اس کے سپرد ہوگئی اور وہ وہاں روانہ ہوگیا۔

---

(۱) دیباچہ غرۃالکمال

پانچواں باب

جلال الدین فیروز خلجی کی بادشاہت ' اس کا قتل اور علاءالدین کا تخت دہلی پر قبضہ ' خسرو کی ملازمت فیروز خلجی اور علاءالدین کے دربار میں

ملک جلال الدین فیروز خلجی یوں تو اب اپنے آقاؤں کا وارث بن کر ان کے تخت و تاج پر قابض ہو چکا تھا لیکن اس کے دل میں ان کی ' خصوصاً اپنے آقائے نعمت بلبن کی اب بھی وہی قدر و منزلت باقی تھی جو پہلے تھی ' اس میں غرور اور تکبر یا خودنمائی بالکل نہ تھی اور نہ در اصل وہ طاقت یا حکومت کا خواہاں ہی تھا - بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ دہلی کی سلطنت پر اس کا قبضہ زیادہ تر اپنے بیٹوں خصوصاً منجھلے بیٹے ارکلی خان کی تحریص و ترغیب کی وجہ سے ہوا - اسی لیے بادشاہ بننے کے بعد بھی بہت عرصے تک اس کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ دہلی جائے اور بلبن کے تخت پر بیٹھے ' چنانچہ کلوکھری کے قریب کیقباد کے بنائے ہوئے قصر نو ہی میں مقیم رہا - بادشاہ کے مستقل قیام کی وجہ سے وہاں محل کے ارد گرد ایک خاصا شہر آباد ہوگیا جو نئے شہر (شہر نو) کے نام سے مشہور ہوا - آخر بہت دن کے بعد بلبن نے جی کڑا کر کے دہلی کا رخ کیا ' جب قصر لعل (سرخ محل) کے پاس پہنچا تو گھوڑے سے اتر آیا - احمد چپ نے جو اس کا وزیر اور مشیر خاص تھا

اس پر احتجاج کیا کہ حضور آپ یہ کیا غضب کر رہے ہیں؟ مگر بلبن نے اسے خاموش کر دیا اور کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنی اصل کو بھول گیا ہوں اور اپنے آقا بلبن کے احسانوں کو بالکل فراموش کر چکا ہوں؟ واقعہ یہ ہے کہ جب میں محل کے قریب آیا تو میرے دل پر ایک خاص ہیبت اور خوف طاری ہوگیا اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ بلبن اپنی قدیم شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ تخت پر جلوہ افروز ہے، چنانچہ جب وہ تخت کے پاس پہنچا تو تعظیم کے لیے سر جھکا دیا اور اس کے بعد دربار کیا تو وہاں نہیں جہاں تخت شاہی رکھا ہوا تھا بلکہ محل کے ایک اور حصے میں علحدہ جا کر کیا - بلبن کی اس سادگی اور منکسر مزاجی نے آہستہ آہستہ ان سرکش ترکوں کو اور دہلی کے باشندوں کو رام کر لیا جو اب تک اسے حقیر اور بادشاہت کے لیے نا اہل تصور کرتے تھے -

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ خسرو اسی زمانے میں فیروز خلجی سے متعلق ہوگئے تھے جب وہ کیامورث کے اتالیق، یا اتابیک کا منصب رکھتا تھا - چنانچہ غرۃالکمال میں دو ایک قصیدے جو خسرو نے اس کی تعریف میں کہے تھے اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں - بادشاہ ہونے کے بعد فیروز خلجی نے خسرو کی اور بھی قدر و منزلت کی، انھیں امیر کا لقب دیا اور مصحف‌دار کا عہدہ تفویض کیا، اس کے ساتھ بارہ ہزار تنکہ سالانہ کا وظیفہ بھی ان کے لیے مقرر کر دیا، اور انھیں اپنا خاص مصاحب اور ندیم بنالیا - بادشاہ کا بڑھاپا تھا لیکن اس کی محفلوں کی رونق اور چہل پہل ایسی تھی کہ شاید کیقباد کو بھی نصیب نہ

ہوئی ہو۔ شراب ارغوانی کے دور خوب چلتے تھے، بڑے بڑے
گویے اور موسیقی کے استاد آتے تھے اور امیر خسرو اور خواجہ حسن
کی غزلیں سنا سنا کر حاضرین کو مسحور کیا کرتے تھے۔ ان میں
محمد شہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو علم موسیقی میں
اپنے زمانے کا استاد سمجھا جاتا تھا، گانے والیوں میں فتوحہ
اور نصرت خاتون خاص پایہ رکھتی تھیں اور ناچنے میں
نصرت بی بی اور مہرافروز یگانۂ عصر تھیں، ان دلکش اور
خوش آیندہ صحبتوں میں ارباب علم و فضل کا مجمع بھی رہتا تھا
اور شاعروں کو اپنے جوہر دکھانے کا اچھا موقع مل جاتا تھا،
مورخ ضیاءالدین برنی کا ان دنوں آغاز جوانی تھا۔ اور
خوش قسمتی سے اسے بھی ان محفلوں میں کبھی کبھی شرکت کا
موقع مل جاتا تھا، اس نے جن حسرت بھرے الفاظ میں
جوانی کی ان صحبتوں کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے
کہ وہ واقعی کس قدر دل فریب ہوں گی، وہ کہتا ہے: یہ
بوڑھا گنہگار جو صحرائے ناامیدی میں سر گرداں ہے اور جو
اب بڑھاپے سے اتنا ضعیف و لاغر ہو گیا ہے کہ ہوا کا ایک
جھونکا یا دھوئیں کا ایک مرغولہ معلوم ہوتا ہے، جب ان
مجلسوں کا ذکر لکھ رہا ہے تو اس کا یہ جی چاہتا ہے کہ
گلے میں زنار پہن لے اور ماتھے پر برہمنوں کا ٹیکہ لگا لے، ان
خوبرو جوانوں اور ان حسین عورتوں کی یاد میں جن کا
ناچ و گانا اس نے اتنی مرتبہ دیکھا اور سنا ہے۔ ہاں میرا یہی
جی چاہتا ہے کہ اپنے چہرے کو سیاہ کر لوں اور ان اقلیم حسن
کے بادشاہوں اور آسمان خوبی کے سورجوں کا ماتم کرتا ہوا
کوچہ و بازار میں نکل کر اپنے آپ کو ہدف ملامت و تذلیل

بنا لوں، اور ان کے غایب ہو جانے کے ساتھ سال بھر نالۂ و بکا کرتا ہوا نکلوں، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں اور سر کے بال نوچ لوں، اور ان کی قبروں کے پاس اپنی جان دے دوں، (۱)

جلال الدین کی نرم اور دھیمی طبیعت سے زیادہ تر لوگ خوش تھے، لیکن اس کی وجہ سے بعض مفسدہ پردازوں کو سرکشی کا موقع بھی مل جاتا تھا، چنانچہ بعض ترک امرا اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا اس کی ہنسی اُڑاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مغلوں سے لڑ لینا اور بات ہے اور ہندوستان پر حکومت کرنا اور، یہ فیروز کے بس کا روگ نہیں ہے، بادشاہ کو سب خبریں ملتی رہتی تھیں لیکن وہ کوئی بازپرس نہ کرتا تھا، بلکہ یہاں تک ہوا کہ جب چند امرا مل کو اسے قتل کرنے کی ناکام سازش کی اور وہ امرا گرفتار ہو کے اس کے حضور میں آئے تو اس نے اپنی تلوار کھول کر ان کے آگے ڈال دی اور کہا کہ اگر تم میں سے کسی کو میرے مارنے کی ہمت ہے تو شوق سے تلوار اُٹھا کر مجھے قتل کر دے، اور جب شرمندگی اور ندامت سے ان لوگوں کو کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے ان سب کو معاف کر دیا اور وہ رہا کر دیے گئے، حالانکہ اس پر بادشاہ کے مشیر کار بہت معترض بھی ہوئے - پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ فیروز خلجی نے حکومت کو سنبھالنے کے بعد ملک علاءالدین کشلو خاں کو کڑے کا حاکم بنا دیا تھا، اور ترک امرا کی طرح اس ملک کو بھی جلال الدین کی نرمی اور سادگی سے مغالطہ ہوا اور چونکہ بلبن کا بھتیجا ہونے کی حیثیت سے

(۱) برنی ص ۲۰۰

ایک طرح تخت کا حق‌دار بھی تھا اس نے اپنے دل میں
بغاوت کی ٹھان لی، ہندوستانیوں کا ایک بڑا لشکر اپنے گرد و پیش
اپنی ضرب‌المثل داد و دہش سے اکٹھا کر کے اس نے اپنے
خودمختار ہونے کا اعلان کر دیا اور طغرل کی طرح سے اپنا
لقب مغیث‌الدین رکھا، یہی نہیں بلکہ کچھ عرصے بعد اس نے
دہلی کی طرف چڑھائی بھی شروع کر دی، اس بغاوت کی
خبر دہلی پہنچی تو بلبن نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلک خاں
کو کچھ فوج دے کر فوراً آگے روانہ کیا اور خود باقی فوج کے
ساتھ انتظامات مکمل کر کے پیچھے پیچھے چلا، ارکلک خاں
تیزی سے بڑھتا ہوا جمنا اور گنگا کو پار کر کے دریاے رہب
(رام گنگا) کے کنارے جا پہنچا۔ اُدھر سے کشلو خاں بھی
اس دریا تک اپنا لشکر لے کر آگیا تھا، بادشاہی فوج دریا کے
ایک کنارے پر اور ملک چھجو کی دوسرے کنارے پر تھی
اور چند روز دونوں فوجیں اسی طرح آمنے سامنے پڑی رہیں۔
اب بادشاہ کی اپنی فوج بھی قریب آگئی تھی اور اس کی
آمد کی خبر سن کر کشلو خاں نے حوصلہ ہار دیا۔ ایک دن
رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلا۔ ارکلک خاں نے پیچھا کیا
اور اسے جا پکڑا وہ اور اس کے ساتھی گرفتار ہوئے اور انہیں
بادشاہ کے حضور میں اس طرح پیش کیا گیا کہ اونٹوں پر
سوار تھے، ہاتھ دوشاخوں میں بندھے ہوئے، چہروں پر
سیاہی ملی ہوئی، اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، بادشاہ
نے دیکھا تو فوراً چلا اٹھا : یہ کیا تماشا بنایا ہے ! دوشاخے
فوراً کھول دو۔ اس کے بعد انہیں اونٹوں پر سے اُتار کر حمام
میں بھیج دیا گیا، جب وہ دھو کر اور نئے کپڑے پہن کر

وہ پھر بادشاہ کے حضور میں آئے تو بادشاہ نے انھیں عذر و معذرت کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ انھیں اپنے پاس بٹھا کر ان کے ساتھ شراب پیتا رہا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ان سب کی جان بخشی کا اعلان کر کے کشلو خاں کو ملتان کا حاکم بنا دیا (۱)۔ ایسی فیاضی اور نیک نفسی کی مثال اس زمانے کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ تقدیر کے کرشمے دیکھو کہ یہی رحم دل اور فرشتہ خصلت بادشاہ تھا جسے آخر خود اس کے اپنے بھتیجے نے ایسی دغا بازی اور بےرحمی سے قتل کیا۔ یہ قصہ ابھی آگے آئے گا۔

فیروز خلجی کی اس مہم میں خسرو بھی اس کے ہمراہ تھے اور اپنے چشم‌دید واقعات کو انھوں نے اپنی مثنوی مفتاح‌الفتوح میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ ایک اور مہم جس کا اس مثنوی میں ذکر ہے لیکن جس میں بظاہر خسرو شریک نہ تھے، جھاین کے مضبوط قلعے کے خلاف تھی۔ یہ مقام رنتھنبور کے مشہور قلعے کے قریب تھا۔ بادشاہ جب کشلو خاں کی سرکوبی کے بعد دہلی کی طرف واپس آیا تو سیری ہی میں مقیم رہا اور جھاین کے خلاف چڑھائی کی تیاریاں مکمل کرنے میں مصروف رہا۔ آخر شاہی لشکر سیری سے ریواڑی اور چندیری وغیرہ ہوتا ہوا جھاین کے سامنے پہنچا۔ راجہ تو اس کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گیا لیکن اس کے سپہ سالار سانئی یا سائنین نے خوب بہادری سے مقابلہ کیا آخر شکست

(۱) برنی ص ۱۸۳۔ برنی نے یہ واقعہ خسرو سے روایت کیا ہے جو اس موقع پر بادشاہ کے پاس موجود تھے۔

کھائی اور گرفتار ہوا - لوٹ کا بہت سا مال حملہ آوروں کے ہاتھ لگا - بادشاہ نے ایک ملک کو راجہ کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود شہر کی طرف واپس آگیا - جھاین کی تسخیر کے بعد ترک امرا یہ چاہتے تھے کہ رنتھنبور کے قلعے پر چڑھائی کی جائے لیکن بادشاہ جو فطرتاً بھی تساہل پسند واقع ہوا تھا اور جو اب بڑھاپے کی وجہ سے اور بھی اس طرح کے دشوار کاموں سے گھبرانے لگا تھا راضی نہ ہوا - اور باوجود اپنے مشیروں کی انتہائی کوشش کے رنتھنبور کو سر کرنے کا اس نے کبھی خیال نہیں کیا - معلوم ہوتا ہے کہ خسرو نے بھی اس زمانے میں اپنے ایک دو قصیدوں میں بادشاہ کی طبیعت میں اولوالعزمی اور تسخیر ممالک کا شوق اور جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی - مثلاً اپنے ایک قصیدے میں کہتے ہیں :

اے علم بالا زدہ ملک جہاں خواہی گرفت
چو خراساں بستدی ہندوستاں خواہی گرفت

لیکن فیروز خلجی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا - اپنے دونوں بڑے بیٹوں خان خاناں اور ارکلی خان کو جھاین کی فتح کی خوشی میں سنہری دوربّاش اور چھوٹے بیٹے ابراہیم قدر خان کو خلعت اور چتر عطا کیا اور دوسرے شہزادوں اور امرا کو بھی حسب مراتب انعام و اکرام دیا ؛ اس کے بعد وہ اطمینان سے دہلی میں مقیم ہوگیا -

مگر یہ اطمینان اور عافیت صرف چند روزہ تھی - اس کا پیمانۂ حیات اب لبریز ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ وہ خود ہی چھلک جاتا اس کے ایک اپنے عزیز قریب کے بے درد ہاتھوں نے اسے زمین پر پٹخ کر پاش پاش کر دیا ؛ علاءالدین خلجی

فیروز خلجی کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی، فیروز خلجی نے اسے کڑا مانک پور کا حاکم بنا دیا تھا، اور وہاں اس نے اپنے پاؤں خوب مضبوطی سے جما لیے تھے، ان ترک امرا کو جو فیروز خلجی سے برگشتہ خاطر رہتے تھے اس نے اپنے گرد و پیش جمع کر کے ایک خاصا جتھا قائم کر لیا تھا۔ دلیر اور اولوالعزم بھی انتہا کا تھا اور اپنے مقر حکومت کے ارد گرد کے علاقوں پر اکثر تاخت کرتا رہتا تھا، سنہ ۶۹۱ھ کا ذکر ہے کہ اس نے بھیلسا کے علاقے پر چھاپا مار کر بہت سا مال و دولت اور ہاتھی گھوڑے لوٹ لیے اور انھیں لا کر اپنے چچا فیروز خلجی کی خدمت میں پیش کیا۔ بھتیجے کی اس سعادت‌مندی سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اگر کبھی اس کے نیک دل میں علاءالدین کی طرف سے کوئی شبہہ پیدا بھی ہوا تھا تو وہ اس سے دور ہوگیا۔ چچا کو خوش اور مہربان دیکھ کر علاءالدین نے یہ درخواست کی کہ اسے چندیری کے علاقے پر مزید تاخت کی اجازت دے دی جائے، بادشاہ نے منظور کر لیا اور علاءالدین دہلی سے روانہ ہوگیا، دہلی کا قیام اسے ہمیشہ ناگوار ہوا کرتا تھا اس لیے کہ اس کی ساس یعنی ملکۂ جہاں بہت سخت‌گیر اور مغرور عورت تھی اور علاءالدین اس سے اکثر نالاں رہتا تھا۔ اس لیے اس درخواست کی تہ میں دہلی سے کسی طرح دور چلے جانے کی خواہش مضمر تھی، اس کے علاوہ لوٹ مار سے اور روپیہ حاصل کر کے اپنی طاقت کو بڑھانا بھی مقصود تھا۔

علاءالدین دہلی سے یہ بہانہ کر کے چل دیا کہ چندیری پر چڑھائی کرے گا، لیکن اس نے دہلی سے تھوڑی دور جا کر دوسرا

ھی راستہ اختیار کیا ' یعنی سیدھا کڑے پہنچا اور وھاں جا کر فوجی تیاریاں شروع کر دیں - جب اطمینان ھوگیا تو بغیر کسی پر یہ ظاہر کئے ہوئے کہ اس کا اصل مقصد کیا ھے پامال شاہ راھوں کو ترک کر کے جنگلوں کے راستے دیوگیر یا دیوگڑھ کا رخ کیا ' برار اور دکن کا علاقہ اب تک ترکوں کی تاخت سے بچا رھا تھا اور یہاں کے راجہ امن امان سے اپنے اپنے علاقوں پر حومکت کرتے رھے تھے ' اس خلفشار کا اثر ' جو شمالی ھندوستان کے بہت سے علاقوں کو تہ و بالا کر چکا تھا اب تک ھندوستان کے اس حصے میں نہ پہنچا تھا اور اسی لیے یہاں کے شہروں میں بے انتہا مال و دولت ' ھاتھی گھوڑے ' ھیرے جواھرات موجود تھے جو صدیوں کی حکومت اور امن امان کی پیداوار تھے ' علاءالدین ان شہروں کے حالات سنتا رھا تھا اور وھاں کی دولت کے قصے سن کر عرصے سے اس فکر میں تھا کہ کسی طریقے سے اسے اپنے قبضے میں لے آئے ' ان شہروں میں دیوگیر خاص اھمیت رکھتا تھا اس لیے کہ ایک مضبوط فوجی مقام بھی تھا اور صنعت و حرفت کا بڑا مرکز بھی ' روپیہ پیسہ یہاں حد سے زیادہ تھا اور اسی مناسبت سے مسلمانوں نے فتح کے بعد اس کا نام دولت آباد رکھا ' غرض علاءالدین خلجی جب یلغار کرتا ھوا دیوگیر کے بالکل سامنے آگیا تو راجہ کو اس کے آنے کی خبر ملی ' اس گھبراھٹ اور سراسیمگی میں ظاھر ھے وہ کیا مقابلہ کرسکتا ' لیکن دیوگیر کو سر کرنا بھی آسان نہ تھا - اس لیے علاءالدین نے یہ ترکیب کی ' اس شہر کو گرد و پیش کے علاقے سے بالکل منقطع کر کے رسد و سائر کے سب راستے مسدود کر دیے اور اگرچہ راجہ کے بیٹے نے

بہت داد مردانگی دی لیکن آخر کار مجبوراً ہار ماننا پڑی اور علاءالدین نے جو کڑی شرطیں پیش کیں وہ سب منظور کر لیں - دیوگیر کی مال و دولت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ علاءالدین کو وہاں سے جو ہاتھ لگا اس میں یہ یہ چیزیں بھی شامل تھیں ، چھ سو من (من : آدھ سیر) سونا ، سات من موتی ، دو من ہیرے ، زمرد اور یاقوت ، ایک ہزار من چاندی ، ریشمی کپڑوں کے بےشمار تھان اور ہاتھی اور گھوڑے ، یہ سب سامان اتنا قیمتی تھا کہ بقول احمد چپ ، جو فیروز خلجی کا وفادار وزیر اور مشیر کار تھا ، اس سے سات سلطنتوں کی بنا ڈالی جاسکتی تھی ، جب علاءالدین یہ سب مال و دولت لے کر کڑے کی طرف واپس جا رہا تھا تو اس وزیر نے فیروز خلجی کو آنے والے خطرے سے متنبہ کرنے کی بہت کوشش کی اور اسے یہ مشورہ دیا کہ علاءالدین کو راستے ہی میں روکنے کی ترکیب کی جائے ، لیکن صاف باطن اور نیک طبیعت فیروز نے اس کی ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی اور علاءالدین کی طرف سے اس کے دل میں کوئی شبہہ یا ملال پیدا نہیں ہوا - بلکہ وہ اس امید میں رہا کہ علاءالدین کڑے سے دہلی آکر یہ سب خزانہ اس کے سامنے پیش کرے گا -

اُدھر علاءالدین جب اطمینان سے اپنے مستقر میں پہنچ گیا تو اس نے فریب اور چاپلوسی سے پر، خط اپنے چچا کو لکھنے شروع کئے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی قدم‌بوسی کو دہلی آنا چاہتا ہے لیکن چونکہ اس کی بغیر اجازت دیوگیر پر چڑھائی کی تھی اس لئے شرمندگی اور خوف سے ہمت نہیں ہوتی - اس کا بھائی الماس بیگ ، جو بعد میں اولوغ خان کے لقب

سے مشہور ہوا ، دہلی میں موجود تھا ، یہ بھی فیروز خلجی کا داماد تھا اور اس کے خلاف سازش میں اپنے بھائی کا شریک کار ، اس نے علاءالدین کے خوف اور ہراس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کیا کہ وہ تو بادشاہ کی زیارت کے لئے بےقرار ہے لیکن اپنے کئے پر بے انتہا نادم ہے ، اسی لئے ہر وقت رومال میں زہر رکھتا ہے تاکہ اگر بادشاہ کی طرف سے ذرا بھی خفگی کا اظہار ہو تو زہر کھا کر اپنی جان دے دے ، غرض ان دونوں بھائیوں نے جلال‌الدین کو اتنا بیوقوف بنایا کہ وہ ان کے کہنے سے اس پر راضی ہوگیا کہ خود کڑے جائے اور علاءالدین سے مل کر اس سے اپنی خوشنودی کا اظہار اور اس کی خطاؤں سے در گذر کرنے کا اعلان خود اپنے منہ سے کرے ، چنانچہ وہ ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ کڑے روانہ ہوگیا ۔ اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں مفصل درج ہے ۔ دغا اور فریب کی ایسی مکمل کامیابی کی مثال کم ملے گی ، بوڑھا فیروز خلجی نہ صرف اپنی جان سے گیا بلکہ اس کے جائز وارث بھی تخت و تاج سے محروم ہوگئے ۔

یہ افسوسناک واقعہ دریا کے ایک کنارے پر ظہور میں آیا ۔ دوسرے کنارے پر فیروز خلجی کا وزیر احمد چپ اس تھوڑی بہت فوج کے ساتھ تھا جو بادشاہ کے جلو میں تھی اور اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ فوراً دہلی کی طرف روانہ ہو جائے ، ادھر دہلی میں اس حادثے کی خبر پہنچی تو ملکۂ جہاں کو بہت تشویش ہوئی بڑے بیٹے خان جہاں کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا ، دوسرا بیٹا ارکلی خاں جو سب بھائیوں میں زیادہ قابل اور جری تھا ملتان میں تھا ،

اس لیے ملکہ نے سب سے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم قدر خان کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور جو امرا دہلی میں موجود تھے انھوں نے بھی اس فیصلے کو منظور کر لیا ۔ یہ خبر ارکلیک خان کو ملی تو اسے چھوٹے بھائی کی بادشاہت اور اپنی محرومی شاق گزری چنانچہ ناراض ہو کر وہ ملتان ہی میں بیٹھا رہا اور اس نے علاءالدین کے خلاف کوئی فوری کار روائی کرنے کی طرف توجہ نہ کی ۔ اُدھر علاءالدین اپنے چچا کے خون میں ہاتھ رنگنے کے بعد فوراً دہلی کی طرف روانہ ہوگیا تھا ۔ وہ مال و دولت جو اسے دیوگیر سے حاصل ہوئی تھی اب اس کے خوب کام آئی ۔ کڑے سے لے کر دہلی تک وہ برابر روپیہ بانٹتا ہوا چلا گویا اپنی اس داد و دہش سے اس کلنک کے ٹیکے کو دھونا چاہتا تھا جو اس بےرحمانہ قتل سے اس کے ماتھے پر لگ گیا تھا ۔ دہلی کے قریب پہنچا تو حکم دیا کہ سواری کے آگے آگے منجنیق سے سونے چاندی کی بارش ہوتی چلے ۔ ہزارہا لوگ روپے کی لالچ میں جوق در جوق چلے آتے تھے اور علاءالدین کی سخاوت اور دریا دلی کے قصے دہلی پہنچ رہے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نا شکرگزاری اور احسان فراموشی کی وجہ سے جو انسان کی فطرت میں مضمر ہے لوگ سونے کی دل کش آب و تاب کو دیکھ کر اس خون آلود سر اور سفید داڑھی کو بھول گئے جو نیزے کی نوک پر سے انتقام کے لیے فریادی تھی ۔ امیر خسرو نے علاءالدین کی کڑے سے دہلی کی طرف اس یلغار کا ایک مثنوی میں ذکر کیا ہے ۔ اسی میں کہتے ہیں :

کشیدہ از کرہ تیغ فتح آختہ
بفتح افکنی رایت افراختہ

به یک دست آهن به یک دست زر

از این تاج داد و ازان برد سر (۱)

غرض یہ کہ خوف اور لالچ نے دهلی کے امرا کو علاءالدین کی طرف مائل کر دیا اور وہ اس سے ملنا شروع ہوگئے اس مضمون کو خسرو نے مثنوی عشیقہ میں یوں باندھا ھے :

ملوک و خان ز اندازہ فزون بود

که هر یک تخت رکنی را ستون بود

ز بانگ زر که در رقص آورد پای

ستونها جمله در رقص آمد از جای

ستونها چون سوی تخت دگر راند

ز ارکان تخت رکنی بے ستون ماند

اب بیچارے رکن الدین اور اس کی ماں کے لیے سوا‌ے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ارکلیک خان کے پاس ملتان میں پناہ لیں، چنانچہ یہ دونوں وهیں چلے گئے اور ۲۲ ذی الحجہ سنہ ۶۹۵ ھ کو علاء الدین باقاعدہ دهلی میں تخت نشین ہوگیا -

امیر خسرو کو اپنے ولی نعمت فیروز خلجی کا قتل گراں ضرور گزرا ہوگا - لیکن بہ حیثیت ایک درباری مصاحب اور شاهی ندیم کے اُنھوں نے اپنے جذبات کا اظہار مناسب نہیں سمجھا ، برخلاف اس کے جدھر ہوا کا رخ دیکھا اُدھر وہ بھی مڑ گئے - بلکہ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ھے کہ ابھی علاءالدین بادشاہ ہوا بھی نہ تھا کہ اُنھوں نے اس کی مدح سرائی شروع

---

(۱) دیوان بقیہ نقیہ (انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷)

کر دی تھی ' اس لیے کہ ایک مثنوی میں علاءالدین خلجی کو یوں خطاب کرتے ہیں :— (۱)

نہ من بودم از طبع دریا نشان جلوس ترا اولین در فشان ؟
مبارک زبانی من بین کہ بخت بدرگاہ دہلی ترا داد تخت !

قسمت کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور ایک بادشاہ کے بعد دوسرے کی تعریف اور ستائش شروع کر دینا شاید چنداں قابل اعتراض نہیں ' لیکن تعجب یہ ہے کہ خسرو نے فیروز خلجی کے بیٹوں کی مصیبت اور ادبار کا ذکر ایسے پیرائے میں کیا ہے جو یقیناً کسی منصف مزاج آدمی کے لیے اور خصوصاً خسرو کے لیے جو ان کے زیر بار احسان رہ چکے تھے ' شایان شان نہیں ہوسکتا ' چنانچہ خزائن الفتوح میں کہتے ہیں کہ :—

" جتنے خوش نصیب لوگ تھے سب نے بادشاہ کے آگے گردن جھکا دی ' ایک بدبخت میر ملتان (ارکلیک خان) باقی رہ گیا - چونکہ یہ دشمن اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ بادشاہ خود اس کے خلاف چڑھائی کرتا اس لیے اولوغ خان اس رکاوٹ کو راستے سے دور کرنے کے لیے روانہ ہوا ' ایک لشکر جرار جو ستاروں کی طرح منظم تھا اور جس سے آسمان بھی پناہ مانگتا تھا برستے ہوئے بادلوں کی طرح دنیا کو موج تیغ سے غرقاب کرتا ہوا - آگے بڑھا ' جب دشمن کو اس فوج کی آمد کی خبر ملی تو اس نے چیونٹی کی طرح اپنے کو ادبار کی دیوار میں پوشیدہ کر لیا (یعنی قلعہ بند ہوگیا) اور اولوغ خان

(۱) دیوان بقیہ نقیہ (انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷)

اپنا کام کرنے آگے بڑھا - وہ قلعے کی فصیلوں تک پہنچ گیا اور چاہتا تھا کہ دشمن کو قعر ہلاکت میں گرا دے اور اس کو اپنے قلعہ شکن آلات کے صدموں سے سرنگوں کر دے ' لیکن پھر اسے یہ خیال آیا کہ دونوں طرف کے لڑنے والے مسلمان ہیں اور اس نے اپنے غصے کو ذرا دھیما کیا - قلعے میں جو لوگ محصور تھے اُنھوں نے بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ ذرہ آفتاب کی برابری کا دعویٰ کرے اور دو تین ہفتے کے مقابلے کے بعد وہ اپنے گمراہ سردار سے بیزار ہوگئے - قلعہ بند فوج نے افسر آپس میں مشورے کے بعد پناہ اور امان مانگتے ہوئے باہر نکلے - اب دشمن (ارکلیک خان) کو بھی اندیشہ پیدا ہوا اور اس نے خلوت نشینوں سے مدد کی درخواست کی ' ان بزرگوں میں سے ایک دونوں شہزادوں کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور شاہی فوج کے سپہ‌سالاروں کے سپرد کر دیا ' اس طرح خان مبارک فتح اور کامیابی کے ساتھ درگاہ بادشاہی کی طرف واپس لوٹ آیا " -

خلوت نشینوں سے خسرو کی مراد ملتان کے صوفیۂ کرام ہیں - شہزادوں کو یہ خیال تھا کہ ان لوگوں کی سفارش اور توسط سے ان کی جان بخشی ہو جائے گی - چنانچہ شیخ صدرالدین کے بیٹے شیخ رکن‌الدین اولوغ خان سے ملے اور جب اس نے ان شہزادوں کی جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کر لیا تو انھوں اپنے ساتھ لاکر اس کے حوالے کر دیا - خسرو نے یہ نہیں بتایا کہ ان بدنصیب شہزادوں کا انجام کیا ہوا ' لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں دھلی لاکر پہلے تو اندھا کر کے قید کر دیا گیا اور اس کے کچھ عرصے بعد انھیں چپ چپاتے قتل کر دیا گیا '

ارکلیک خان کے دو خورد سال لڑکوں کا بھی یہی حشر ہوا
اور اس طرح جلال الدین کی اولاد میں سے کوئی تخت کا
دعویدار نہ رہا - خسرو کا وہ قصیدہ جس میں انہوں نے
علاءالدین کو وہ خوش خبری یا مژدہ سنایا" تھا جس کا ذکر
مندرجہ بالا اشعار میں کیا گیا ہے ان کے دیوان غرۃ الکمال
میں موجود ہے ' اس میں وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ :
خدا کرے کہ تو دہلی کے خطبے کی عزت سے سرفراز ہو -
میں یہ فال نیک تو قرعۂ آسمان سے لیتا ہوں " - یہی
خسرو جلال الدین کی زندگی میں اس کے دوام سلطنت
اور عروج اقبال کی دعائیں کئی مرصع قصیدوں میں مانگ
چکے تھے ' چنانچہ ایک قصیدے میں جو خاقانی کے ایک
مشہور قصیدے کی طرز میں لکھا گیا ہے یوں سخن پیرا ہوتے
ہیں :

" اگر اُستاد خاقانی شیروان کی شان و شوکت پر فخر
کیا کرتا تھا تو میں ہندوستان کے جاہ و حشم پر نازاں ہوں '
اس کے بادشاہ جلال الدین کا تاج اور اس کی شان و شوکت
اب خاک میں مل چکی ہے ' مگر خدا کرے ہمارا جلال الدین
اس عظیم الشان سلطنت کے سر پر ہمیشہ قائم رہے - اور ہماری
ثناء اور ستائش سے اس کی سخاوت کے کارنامے دنیا کی
تاریخ میں ثبت ہو جائیں " - (۱)

---

(1) دیوان غرۃ الکمال - قصیدے کا مطلع ہے :
عید است و خوبان نیمشب در کوی خمار آمدہ
سر مست گشتہ صبحدم غلطان ببازار آمدہ '

لیکن خسرو کے اس طرز عمل کا ہمیں سختی سے جائزہ نہیں لینا چاہیے اس لیے کہ یہ قصیدے ان کی درباری زندگی کا ایک جزو تھے۔ اُن سے شاعر کے اصل جذبات کا اندازہ ہرگز نہیں لگایا جا سکتا ' باقی رہا یہ سوال کہ اگر دل میں وہ علاءالدین کے فعل کو قابل نفرت خیال کرتے تو اس کی خوشامد میں یوں رطب‌اللسان کیوں ہوتے اور کیوں اس کی ملازمت اختیار کرتے ' اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ بھی ایک امیر تھے اور اس حیثیت سے اپنے زمانے کے اور امرا کے طرز عمل سے ان کا رویہ مختلف نہیں ہوسکتا تھا '۔

چھٹا باب

علاءالدین کا دورِ حکومت ' خسرو سے اس کا سلوک ' اس بادشاہ کے
عہد میں خسرو کا اپنے منتہائے کمال کو پہنچنا ' دیوان غرۃالکمال
کی ترتیب اور خمسہ وغیرہ کی تصنیف

علاءالدین نے بادشاہ بننے کے بعد کچھ عرصے تک خوب داد عیش و طرب دی ' لیکن اس کے بعد اسے اپنی ذمہ‌داری کا احساس پیدا ہوا اور اس نے امور سلطنت کی طرف اپنی توجہ مصروف کی ' دہلی کے تخت پر ایسی آسانی سے قبضہ ہو جانے کی وجہ سے اس کا حوصلہ بلند ہوگیا تھا اور ہمت بہت بڑھ گئی تھی ' چنانچہ اب اس کے دماغ میں یہ خبط سمایا کہ سکندراعظم کی طرح دور دور کے ملکوں کی تسخیر کے لیے نکلے اور اسی لیے اپنا لقب اسکندر ثانی تجویز کیا " ایک نئے مذہب کی بنا ڈالنے کا بھی کچھ دنوں شوق رہا " لیکن غنیمت ہے کہ نہ تو اس نے اکبر کی طرح واقعی کوئی دین الہی قائم کیا اور نہ اس کی نوبت آئی کہ محمد تغلق کی طرح چین اور تبت کی فتح کے لیے کوئی مہم روانہ ہوتی ' اس کے مشیر اور وزیر سمجھدار لوگ تھے اور انہوں نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ ابھی ایک طرف تو مغلوں کے حملوں سے ہندوستان کا بچاؤ کرنا ہے اور دوسری طرف خود اس ملک میں اپنی سلطنت اور حکومت کو بڑھانے کی کافی گنجایش موجود ہے ' اور یہ بات علاءالدین کی سمجھ میں آگئی -

اس کے عہد میں مغلوں کے کئی حملے ہوئے - پہلے تو سنہ ۶۹۷ھ میں ایک مغل سردار کدر نامی جودی پہاڑ کے راستے بیاس، جہلم اور ستلج کو پار کر کے قصور اور جالندھر (جارن منجور) کے علاقوں پر حملہ آور ہوا وہاں خوب لوٹ مار مچائی، لیکن اولوغ خان نے مغلوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس کے بعد سنہ ۶۹۸ھ میں ایک اور سردار قتلغ خواجہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی کے بہت قریب آ پہنچا، چنانچہ خسرو "عشیقہ" میں کہتے ہیں:

ازاں پس بود قتلغ خواجہ گستاخ قوی تر شجرۂ ملعونہ را شاخ
بحد کیلی آمد کافر آن سال شہ آن جرأت مبارک دید دو فال

اس مرتبہ بادشاہ کو خود مغلوں سے مقابلے کے لیے نکلنا پڑا، اب کے بھی شاہی فوجوں کو فتح حاصل ہوئی لیکن لڑائی میں علاءالدین کا ایک بہت بہادر سپہ سالار یعنی ظفر خان مارا گیا - تیسرا حملہ بہت سخت تھا اور ترغی کی قیادت میں مغل دہلی تک آ پہنچے - انھوں نے شہر کو تقریباً محصور کر لیا - شہر میں فوجوں کی بھی قلت تھی اور سامان خورد و نوش کی بھی، اس لیے بادشاہ اور رعیت دونوں بہت پریشان اور ہراساں تھے، لیکن معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ مغل دو مہینے کے محاصرے کے بعد خود بخود ہی اپنے ڈیرے خیمے اٹھا کر چل دیے - خوش عقیدہ لوگ اس واقعے کو حضرت نظام الدین اولیا کی کرامات میں سے شمار کرتے ہیں - باقی خدا بہتر جانتا ہے، تیسری مرتبہ سنہ ۷۰۵ھ میں ترغی، علی بیگ اور تورتاق ایک بڑی فوج لے کر حملہ آور ہوئے اور سوالک کی پہاڑیوں کا رخ کیا،

امروهے تک پہنچ کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا - اس مرتبہ ملک مانک ' جو بعد میں ملک کافور کے لقب سے مشہور ہوا ان کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا اور اس نے مغلوں کو شکست فاش دی ' ترغی تو پہلے ہی واپس چلا گیا تھا ' علی بیگ اور ترتاق دونوں قید ہوئے اور انہیں دہلی لایا گیا ' اور اگرچہ فرشتہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہاتھیوں سے کچلوا کر قتل کیا گیا ' واقعہ یہ ہے کہ ان کی جان بخشی کی گئی اور وہ دہلی میں مقیم ہوگئے - بعد میں ان میں سے ایک کسی بیماری سے فوت ہوگیا - لیکن ان کے ساتھیوں پر اس قسم کا کوئی رحم نہیں کیا گیا بلکہ زیادہ تر کو تلوار کے گھاٹ اُتار کر ان کے سروں اور دوسرے اعضاء سے برجی وغیرہ میں مینار بنائے گئے - اس حملے کے تھوڑے ہی عرصے بعد کبک نے ہندوستان پر حملہ کیا اور ناگور تک پہنچ گیا - اس مرتبہ بھی ملک کافور مقابلے پر گیا اور کبک خان کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا -

علاءالدین کے عہد کا پانچواں مغل حملہ دو سرداروں اقبال اور تایبو کی سرگردگی میں ہوا - لیکن مغل سندھ کے پار زیادہ دور نہ آنے پائے تھے کہ ملک کافور اور ملک غازی (تغلق) نے انہیں سخت ہزیمت کے بعد بھگا دیا - سیکڑوں مغل قید ہوئے - انہیں دہلی لاکر یا تو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا گیا یا قلعے کی دیواروں پر لٹکا دیا گیا اور بقول خسرو :

شد از حصار تتاری و چوبی آویزان چو زنگیان نگونسار از عمارت تہ

اب کے بھی بدبخت مغلوں کے سروں سے ایک بڑا مینار کھڑا کیا گیا ' اور اس حملے کے بعد کم از کم علاءالدین کے عہد تک مغلوں کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ پھر ہندوستان کا رخ کریں -

علاءالدین کے بخت اور اقبال کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس کے ہندو غلام بھی مغلوں جیسی جری اور دلیر قوموں کو یوں پے در پے شکستیں دے سکیں، چنانچہ خسرو بھی اپنے ایک قصیدے کے مطلعے میں اسی خیال کو یوں ظاہر کرتے ہیں :— (۱)

اے لوائے فتح و فیروزی بہ چار ارکان زدہ
بندگان ہندوت بر قلب ترکستان زدہ

ایک اور جگہ کہتے ہیں :— (۲)

بہ ترکستان چنان ہندی نمودہ   کہ از ترکان بہ ہندی جان ربودہ

بادشاہ کی ان کامیابیوں سے رعایا کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت اور زیادہ ہوگئی۔ مغلوں کو جس بری طرح قتل کیا گیا اس کا منظر دیکھ کر لوگ خوش ہوتے تھے اور ان زبردست دشمنوں کی تذلیل و توہین پر دہلی اور ہندوستان کے اور شہروں میں شادیانے بجتے تھے، خسرو کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشی مغلوں سے خاص طور پر تنفر تھا جس کی وجہ غالباً وہی ملتان کا واقعہ تھا جس میں وہ ان کے ہاتھ گرفتار ہوگئے تھے۔ چنانچہ خزائن الفتوح میں یوں لکھتے ہیں :—

"خدا کا شکر و احسان ہے کہ میں نے ان کتوں کو اونٹوں پر بندھا ہوا دیکھا جن کے ہاتھوں اونٹ بھی فریادی تھے" اگر اب سے پہلے "شتر گربہ" ایک عام مثل تھی تو اب سے "شتر سگ" کی مثل دنیا میں مشہور ہو جائے گی، ان کی گردنوں میں جو دو شاخ پڑے ہوئے تھے وہ ایسے معلوم

---

(۱) بقیہ نقیہ (انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷) - (۲) عشیقہ

ہوتے تھے جیسے کوئی عاشق زار اپنے معشوق کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے - اسی طرح اعجاز خسروی میں لکھتے ہیں کہ : " وہ پیسر جو ہر سال سمرقند کے پاس سے سختی کی زنجیریں لے کر ہندوستان سے قیدی پکڑنے کے لئے آیا کرتے تھے ' خود یا تو تیغ تیز سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور جہلم رسید ہوئے یا قید کر کے ان کی جان بخشی کی گئی ' لیکن چونکہ جن لوگوں کو اس طرح چھوڑ دیا گیا تھا اُنھوں نے اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش کی اور فساد برپا کیا تو بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ ان میں سے بعض کو دریا میں پھینک دیا جائے اور بعض کی گردنوں سے خون کی بارش زمین پر کی جائے " ان کے گندم گوں جسموں کو زمین میں دبا دیا گیا اور ان کی خاکستر سے گلاب اور مرغ کس کے پھول کھلنے لگے ' اس کے بعد اُن مرپخی کتوں کے سروں سے ایک مینار (دہلی میں) تعمیر کیا گیا اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی مینار کھڑے کئے گئے " (۱)

لیکن علاءالدین جب مغلوں کی روک تھام کر رہا تھا اور سرحدی قلعوں کو مستحکم اور مضبوط بنانے کی فکر میں تھا تو اُس نے ہندوستان کے اُن حصوں کی فتح کے خیال کو بھی فراموش نہیں کیا جو اب تک دہلی کی سلطنت کے زیر نگیں نہ تھے - اس سلسلے میں سب سے پہلے سنہ ۶۹۸ ھ میں اولوغ خاں اور نصرت خاں کو گجرات کی طرف روانہ کیا گیا - بادشاہی فوج " ابر باراں کی طرح بڑھتی ہوئی سومنات پہنچی

(۱) اعجاز خسروی ج ۱ ص ۱۵ و ما بعد - دیکھیے ایضاً برنی : ص ۳۲۱ -

اور بہت سا مال غنیمت اسے ھاتھ لگا، اس کے بعد کھنبایت اور نہروالہ پر یورش کی گئی اور ان دونوں جگہوں کو تسخیر کر لیا گیا، آخر میں رنتھنبور کے مستحکم قلعے کا محاصرہ شروع ہوا۔ یہاں کے راجہ نے بہت بہادری سے مقابلہ کیا اور تیغ ھندی کے خوب جوہر دکھائے لیکن پانچ مہینے تک محاصرے کی سختیاں جھیلنے کے بعد اسے راجپوتوں کی قدیم روایت کے مطابق جوہر کی رسم ادا کرنا پڑی، عورتوں کو سپرد آتش کر کے راجہ خود لڑتا ہوا مارا گیا، اور شاھی سپہ سالار اب بہت سا مال غنیمت، ھاتھی، گھوڑے اور لونڈی غلام لے کر دارالسلطنت کی طرف واپس روانہ ہوگئے۔ اس مال غنیمت میں نہروالہ کے راجہ کرن کی خوبصورت رانی کنولا دی یا دیوی بھی تھی جو بعد میں علاءالدین کے حرم میں داخل ہوئی، اور ملک مانک بھی، جسے بادشاہ نے اپنا مقرب خاص بنا کر ملک کافور کا لقب دیا۔

اس کامیابی کے بعد سنہ ۷۰۲ھ میں بادشاہ خود چتوڑ کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا اور اس مہم میں خسرو بھی بادشاہ کے ہمرکاب تھے، اس مضبوط مقام کو سر کرنا آسان نہ تھا، بادشاہ ۸ جمادی الثانی کو دھلی سے روانہ ہوا اور ۱۱ محرم کو قلعہ فتح ہوا۔ اس عرصے میں محاصرین کو برسات کی وجہ سے خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، اسی لیے معلوم ہوتا ھے کہ خسرو بھی گھبرا اٹھے کیونکہ خزائن الفتوح میں کہتے ہیں کہ :—

"میں جو کہ اس سلیمان کا ھدھد ہوں ساتھ تھا، اور اگرچہ لوگوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میں دھلی واپس چلا جاؤں

میں برابر وہیں رہا اس لیے کہ مجھے اپنے آقا کی ناراضگی کا ڈر تھا، کیونکہ اگر وہ کہیں پوچھ بیٹھتا کہ کیا بات ہے مجھے کہیں ادھر ادھر نظر نہیں آتا ؟ کیا وہ کہیں چل دیا ہے ؟ تو مجھے خطرہ تھا کہ مجھ سے کوئی معقول جواب نہ بن پڑے گا اور بادشاہ کے اس حکم کی کہ " اسے کوئی بھی وجہ اس غیر حاضری کی پیش کرنا چاہئے " میں تعمیل سے قاصر رہوں گا "

اس طرح خسرو نے چتوڑ کی مہم کے سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے، قلعے کی تسخیر کے بعد راجہ کی جان بخشی ہوگئی، لیکن چتوڑ کا قلعہ اس سے چھن گیا، بادشاہ نے اپنے بیٹے خضر خان کو اس کا حاکم بنا کر اسے دورباش اور چتر لعل عطا کیا اور شہر کا نام بجائے چتوڑ کے خضر آباد رکھا گیا،

ان فوجی مہموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد علاءالدین ملک کے انتظام اور امن امان قائم کرنے میں مشغول ہوا اور اپنے وزیروں سے مشورہ کیا کہ سلطنت میں بےچینی اور بدنظمی کے بڑے اسباب کیا ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ شراب اور دولت کی افراط سے زیادہ تر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، چنانچہ علاءالدین نے دل میں ٹھان لی کہ شراب خوردی اور دولت کی کثرت کو ہر ممکن طریقے سے روکا جائے، پہلے تو خود شراب ترک کی اور اس کے بعد عام طور پر ملک میں اس کی ممانعت کر دی، شراب کے ذخیرے جہاں بھی ملے ضبط کر لیے گئے، ملوں شراب بازاروں اور گلیوں میں لنڈھا دی گئی یا ہاتھیوں کو پینے کے لیے دے دی گئی، چنانچہ مصنف تاریخ فرشتہ بظاہر بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ " اس زمانے کے ہاتھی بھی کیا خوش قسمت تھے کہ انہوں نے

ایسی کامرانیاں کیں - (۱) تاجروں اور سوداگروں کے پاس زیادہ روپیہ جمع ہونے کی روک تھام یوں کی گئی کہ بادشاہ نے سب چیزوں کے نرخ مقرر کر دیے اور دہلی میں ایک بازار یا منڈی دارالعدل کے نام سے بنائی جس میں مقررہ نرخوں پر ہر قسم کی چیزیں مل سکتی تھیں ناجائز نفع کمانے والوں کے لیے بہت سخت سزائیں مقرر کیں اور اس کی خاص نگرانی رکھی جاتی تھی کہ وہ کسی کو دھوکا نہ دے سکیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ہندوستان میں رعیت کی خوش‌حالی اور تاجروں کے ہتھکنڈوں سے غریب رعایا کے بچاؤ کی تدابیر سوچیں اور اُن پر عمل پیرا ہوا ۔ اسی لیے جب خسرو یہ کہتے ہیں کہ " عدل فاروقی کو سات سو سال انتظار کرنا پڑا جب جا کر اُسے ایک نیا مربی ملا " تو اس کو محض شاعرانہ بلند پروازی اور مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے -

اسی طرح اگرچہ بظاہر علاءالدین خاص طور پر دیندار آدمی نہ تھا اور نہ غالباً اُس میں کوئی مذہبی جوش تھا لیکن ایک بیدار مغز حاکم کی طرح وہ یہ خوب جانتا تھا کہ اخلاق کی درستی اور مذہبی عقائد کی استواری بھی سلطنت کے نظم و نسق کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے معاشرتی حالات کی اصلاح ۔ ملک بھر میں عموماً اور دہلی میں خصوصاً کیقباد کے وقت سے لوگوں کی اخلاقی حالت بہت پست ہوگئی تھی اور وہ عیش و طرب کے ضرورت سے زیادہ گرویدہ ہوگئے تھے - اب بقول خسرو " زنان بازاری جو اپنی حلقہ حلقہ زلفوں

(۱) فرشتہ ج ۱ ص ۱۰۹ .

کا جال اِدھر اُدھر پھیلاتی پھرتی تھیں اور شہر میں جہاں
بھی چاہا ایلی گیلی پڑی پھرتی تھیں ' مجبور کی گئیں کہ
گھروں کی چار دیواری میں بیٹھیں اور اب افسوس اور ندامت
کے باعث وہ اپنے ہاتھ مل مل کر اپنے نقابوں کے تار بٹتی تھیں "

اسی طرح فرقۂ اسماعیلیہ کے کچھ لوگ ہندوستان کے بعض
حصوں میں آکر آباد ہوگئے تھے اور اباحتیہ کے نام سے مشہور تھے '
علاءالدین نے اس فرقے کا بھی قلع قمع کیا ' اور جادوگر اور
جادوگرنیاں بھی جو بقول خسرو "اپنے دانتوں کو بچوں کا خون
پینے کے لیے تیز کیا کرتی تھیں بادشاہ کی توجہ سے نہ بچیں '
ان کو سخت سزائیں دی گئیں اور بعض کو سنگسار کیا گیا '
"تاکہ وہ خون جو انہوں نے پیا تھا ان کی ناپاک کھوپڑیوں
سے واپس نکالا جائے" (۱)

علاءالدین کی اولوالعزمی نے شہر دھلی کی توسیع اور وہاں
کی عمارتوں کی اصلاح اور تجدید کی طرف بھی عنان توجہ موڑی
سلطان التمش کے زمانے سے ' جس نے قطب مینار ' مسجد
قوۃ الاسلام ' اور حوض شمسی تعمیر کیا تھا ' دھلی کے قدیم اور
تاریخی شہر میں کئی تغیرات رونما ہو چکے تھے ' غیاث الدین بلبن
نے اپنی رہائش کے لیے رائے پتھورا کے پرانے قلعے ' اندر پرت
یا اندر پرستھ ' کو چھوڑ کر جہاں قطب الدین ایبک اور التمش
نے سکونت اختیار کی تھی ' اپنے لیے ایک اور قلعہ مرزغن
کے نام سے بنوالیا تھا اور ایک محل بھی تعمیر کیا تھا جو قصر لعل
کہلاتا تھا ' اس کے بعد کیقباد نے کیلوکھری کو آباد کیا ' یہ مقام

(۱) خزائن الفتوح

ھمایوں کے مقبرے کے جنوب مشرق میں دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا - اگرچہ اب جمنا کا رخ پلٹ جانے کی وجہ سے دریا سے دور ھوگیا ھے، یہی شہر بعد میں شہر نو کے نام سے مشہور ھوا - علاءالدین نے سیری میں ایک قلعہ بنا کر گویا ایک اور نئے شہر کی بنیاد قائم کر دی، کچھ عرصے کے بعد دھلی کا پرانا شہر اور سیری ملکر ایک ھوگئے اور ان دونوں کے درمیان کا حصہ جہاں پناہ کہلانے لگا، (۱) مسجد قوۃ الاسلام کے صحن میں علاءالدین نے اضافہ کیا اور ایک دروازہ جو عمارت گری کے فن کا ایک نادر نمونہ ھے اور آج کل علائی دروازہ کہلاتا ھے تعمیر کیا، اس کے بعد اسے خیال آیا کہ قطب مینار کا ایک جواب تعمیر کیا جائے جو گھیر اور بلندی میں قطب مینار سے بھی زیادہ ھو، اگرچہ یہ مینار ناتمام رھا، اور ایک کھنڈ یا منزل سے زائد بلند نہ ھوسکا تھا کہ علاءالدین کا دور حکومت ختم ھوگیا،

ان تعمیرات کے لیے دور دور سے پتھر اور کاریگر حاصل کئے گئے تھے - "ھند کے سنگتراش جو اپنے فن میں فرھاد کو مات کرتے تھے، پتھروں کو ایسا صاف اور چکنا بنا دیتے تھے کہ ان کی سطح پر سے خیال کا پاؤں بھی پھسل جائے" دھلی کے معمار جو فن عمارت میں نعمان منذر کو بھی جاھل محض سمجھتے تھے ایک پتھر کو دوسرے سے ایسی صفائی سے جوڑ دیتے تھے کہ اندیشۂ رازی بھی ان کی درزوں میں سے نہیں گزر سکتا تھا -" حوض شمسی سے اس زمانے میں دھلی کے باشندے

---

(۱) ان دھلی کے قدیم شہروں کے لیے دیکھیے : مآثر الامرا ج ۳ ص ۳۷۴، ظفر نامہ ص ۵۰، ایلیٹ ج ۳ ص ۴۴۷، ملفوظات تیموری، وغیرہ

زیادہ تر ضروریات کے لیے پانی لیتے تھے ' حوض میں مٹی بھرتے بھرتے پانی بہت کم رہ گیا تھا اس لیے علاءالدین نے اس کی صفائی کی طرف بھی توجہ کی اور بقول خسرو ہر مزدور کے ہاتھ نے عصاے موسی کا کام کیا اور جلد ہی حوض پھر پانی سے پر ہوگیا ' (۱)

بادشاہ جب ان کاموں سے مطمئن اور فارغ ہوا تو اسے پھر دکن اور جنوبی ہندوستان کے زرخیز اور مالدار علاقوں کا خیال آیا ' دیوگیر کا راجہ رام دیو جس نے علاءالدین کے پہلے حملے کے وقت خراج اور تاوان دے کر اپنی گلو خلاصی کر لی تھی ابھی زندہ تھا ' لیکن چونکہ اس نے خراج کی قسطوں کے ادا کرنے میں کچھ کوتاہی کی اس لیے علاءالدین کو ایک اچھا بہانہ ہاتھ لگ گیا اور سب سے پہلے ملک کافور کو سنہ ۷۰۶ ھ میں دیوگیر ہی کی طرف روانہ کیا گیا -

دیوگیر پہنچ کر ملک کافور نے راجہ رام دیو کو تنبیہ اور فہمائش کی اور اسے اپنے ساتھ دہلی لے آیا جہاں وہ کوئی چھ مہینے مقیم رہا - اس کے بعد بادشاہ نے اسے خلعت اور نیلا چتر دے کر اسے اس کے ملک واپس بھیج دیا - اسی اثناء میں علاءالدین خود سیوانے کی مہم پر روانہ ہوا ' سیوانہ دہلی سے کوئی سو میل کے فاصلے پر واقع تھا - وہاں کے راجہ ستل دیو نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی اس لیے علاءالدین نے اس کے قلعہ کا محاصرہ کر کے اسے سر کیا اور ستل دیو لڑتا ہوا مارا گیا -

---

(۱) خزائن الفتوح

سنہ ۷۰۹ ھ میں ملک کافور جنوبی ہند کی تسخیر کے لیے بڑے ساز و سامان سے روانہ ہوا۔ دیوگیر پہنچنے سے پہلے گجرات کے راجہ کرن کی بیٹی دیول دی الپ خان حاکم گجرات کی سعی سے اس کے ہاتھ لگ گئی۔ اسے دہلی بھیج دیا گیا اور جب وہ وہاں پہنچی تو شہزادہ خضر خان اسے دیکھ کر فریفتہ ہوگیا اور ان دونوں کے عشق و محبت کی وہ داستان شروع ہوئی جسے خسرو نے مثنوی خضر خان و دول رانی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شروع میں خضر خان کی ماں نہیں چاہتی تھی کہ اس کی شادی دیول دی سے ہو، چنانچہ اس نے اپنے بھائی الپ خان کی لڑکی سے بیٹے کی شادی ٹھہرائی اور شہزادے کو مجبوراً ماں کا حکم ماننا پڑا لیکن بعد میں اسے دیول دی سے بھی شادی کرنے کی اجازت مل گئی تھی، ادھر کافور دیوگیر پہنچ کر کچھ عرصے راجہ کا مہمان رہا اور اس کے بعد اس نے وارنگل کا رخ کیا، انم کنڈا یا ہانم کنڈا کے مشہور مقام تک پہنچ کر اس نے ردرا دیوا کو جسے امیر خسرو نے لدر دیو لکھا ہے شکست دی اور اسے مجبور کیا کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور شاہی بارگاہ میں اظہار عقیدت و اطاعت کے لیے حاضر ہو، ردرا دیوا نے بجائے خود آنے کے اپنا ایک سونے کا بت بنوا کر اور اس کے گلے میں ایک رسی ڈال کر بھیج دیا اور بہت سے تحفے تحائف دینے کا وعدہ کیا، ملک کافور نے اس کی درخواست کو منظور کر لیا اور وہاں سے بےشمار مال غنیمت، ہاتھی، گھوڑے، سونا چاندی، جواہرات وغیرہ لے کر دہلی واپس آیا، اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی علاءالدین نے اسے دوبارہ جنوبی ہندوستان کی طرف روانہ کیا، اب کے معبر اور تلنگ کی تسخیر منظور

تھی ' چنانچہ شاہی لشکر پھر دیوگیر وارد ہوا - اس شہر کی فوجی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ ہر مرتبہ جنوب کی طرف جاتے ہوے ملک کافور نے بھی راستہ اختیار کیا ' صنعت و حرفت اور تجارت کے لحاظ سے بھی دیوگیر خاص حیثیت رکھتا تھا - امیر خسرو نے اس شہر کی تعریف خزائن الفتوح میں کی ہے ' جس کے بعض فقروں کا ترجمہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ' چنانچہ کہتے ہیں :-

" جب شاہی فوج دیوگیر پہنچی تو ایک شہر نظر پڑا ' جو تازگی اور لطافت میں قصر شداد سے بھی بازی لے گیا تھا - ہر بازار ایک باغ معلوم ہوتا تھا جہاں جوہری اور صراف چھوٹے بڑے اچھوں (۱) اور سونے چاندی کے سکوں کے ڈھیر سامنے لیے بیٹھے تھے ' ہر قسم کے کپڑوں کے جو ہندوستان میں بہار سے لے کر خراسان تک کہیں نہ مل سکتے تھے دکانوں میں تھان کے تھان موجود تھے ' اور ایسے خوش رنگ کہ جیسے پہاڑوں پر گل لالہ یا چمن میں ریحان و نسرین ' ہر قسم کے خوش ذائقہ اور لذیذ پھلوں کے تودے لگے ہوئے تھے اور سپاہیوں کے لیے ہر طرح کا سامان ' سوتی ' اونی اور چمڑے کے کپڑے ' اور پیتل اور فولاد کی زرہیں تیار رکھی تھیں " - یہی وجہ تھی کہ کافور کو دیوگیر میں اپنی فوجوں کے لیے کافی ساز و سامان مل جاتا تھا - اس کے علاوہ راجہ رام دیو اس کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار رہتا تھا ' اس مرتبہ اس نے اپنے ایک نائب یا حاکم (دلوی) پرس رام کو شاہی لشکر کی رہنمائی اور اعانت کے لیے

(۱) اچھو : اُس زمانے کا ایک سکہ تھا -

خاص ہدایتیں دے دی تھیں ، اس کی مدد سے کافور بلال دیو کی راج دھانی دہور سمندر یا دھول سمندر تک جا پہنچا اور بلال دیو کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پیش کردہ شرائط کو منظور کرے یہاں سے بہت سا مال غنیمت لینے کے بعد وہ معبر کی طرف چلا اور راجہ بیر پنڈیا کی سلطنت پر تاخت کر کے لوٹ مار شروع کی ، راجہ جنگلوں کی طرف بھاگ گیا اور باوجود اس کے کہ کافور اس کی تلاش میں کھم اور کندور اور مدورا تک پہنچ گیا اس کا کچھ پتہ نہ چلا - آخر ملک کافور نے یہی غنیمت سمجھا کہ جو مال اور دولت راجہ کے علاقے سے وہ اب تک لے چکا تھا اسے ساتھ لے کر دھلی واپس روانہ ہو جائے ، اس لوٹ کے مال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ھے کہ ان ھاتھیوں کی قطار جو اس کے ساتھ لگے تھے تین فرسنگ لمبی تھی ، بےشمار عمدہ گھوڑے تھے اور پانچ سو من جواھرات اور سونا تھا ، جب کافور یہ سب بیش قیمت تحایف لے کر دھلی پہنچا تو علاءالدین نے ایک بڑا دربار کیا اور دل کھول کر انعام اکرام تقسیم کیا ، شاید اس وقت سے لے کر جب وہ کڑے سے دھلی سونا بکھیرتا ھوا آیا تھا اس نے کبھی ایسی سخاوت نہ دکھائی تھی ، ایک ایک امیر کو چار چار پانچ پانچ من سونا ملا ، اور اسی طرح تمام ملک میں خوشیاں منائی گئیں اور خیرات تقسیم کی گئی -

بداؤنی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھا ھے کہ امیر خسرو بھی اس آخری اور عظیم الشان مہم میں شاھی لشکر کے شریک تھے ؛ (۱) لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ، اس لیے کہ اگر

---

(۱) منتخب التواریخ

بادشاہ خود مہم میں شریک ہوتا تو خسرو کی شرکت کا بھی امکان تھا، لیکن ملک کافور کے ساتھ ان کا ایک ایسے دور دراز اور دشوار گزار سفر پر جانا بہت غیر اغلب معلوم ہوتا ہے، علاوہ اس کے خسرو نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ اس مہم میں شریک تھے حالانکہ انھوں نے خزاین الفتوح میں ملک کافور کی جنوبی ہندوستان پر چڑھائیوں کی بہت مفصل کیفیت لکھی ہے، خسرو کی اس وقت عمر کوئی ساٹھ سال کی تھی اور اس سن میں ان سے ایسی ہمت اور سفر و سیاحت کے اتنے شوق کی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔

یہ زمانہ علاءالدین کے عین عروج اور کمال قوت کا زمانہ تھا، اس کی سلطنت ایک طرف اڑیسہ سے گجرات اور سندھ تک اور دوسری طرف پنجاب سے تقریباً راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ غالباً بعض دور دراز حصوں مثلاً جنوبی ہند میں اس کی حکومت کبھی مضبوطی سے قائم نہ ہوسکی تو بھی یہ واقعہ ہے کہ اس حصۂ ملک کے حکمران بھی اس کے حلقہ بگوش اور باج گزار ہو چکے تھے، ملک میں عام طور پر امن و امان اور فارغ البالی تھی، خسرو کی زبانی اس کے عدل و انصاف کا تذکرہ آپ سن چکے ہیں، اب اس کے عہد کی عام معاشرتی اور معاشی حالت کے متعلق جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔

"کیا عجیب امن و امان کا زمانہ ہے کہ دہلی کی فصیلوں سے لے کر خراسان کے گرد و نواح تک سرخ چہرے والے چینیوں (تاتاریوں) کے خون سے ایک سرخ فرش بچھا ہوا ہے، چنانچہ سب فتنے محو خواب ہیں اور ہر قسم کی بدنظمی

اور فساں معدوم ...ایک طرف تو چنگیز خاں کی پہاڑ جیسی فوجوں کو اس کی یاد ہیبت نے اُڑا کر جیحون کے پار پھینک دیا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے وہ زبردست راجہ جو اپنے ہاتھیوں سے ترکوں کی صفوں کو پامال کیا کرتے تھے' ہاتھی اور خزانے دینے پر مجبور کر دیے گئے ہیں...انصاف اور رعایا کی بہبود کے لیے اس نے ایسے قواعد اور آئین قائم کر دیے ہیں کہ جن کی صورت نہ تو آئینۂ اسکندری میں نظر آ سکتی تھی اور نہ جام جمشید میں دکھائی دیتی تھی' اپنی صائب رائے سے اس نے اناج کے سستا کرنے کے لیے' جو سرمایۂ زندگی کا خمیر ہے' ایک ایسا قانون بنا دیا ہے کہ اگر سالوں تک ابر رواں اپنی پیشانی کا پسینہ نہ ٹپکائے' ہوا اپنا پنکھا نہ ہلائے' زمین سرخ سبزہ نہ پیدا کرے' اور گرم سورج فصلوں کو نہ پکائے' تو وہ عام رعایا کو اپنے غلے کے ذخیروں سے کھانا مہیا کر سکتا ہے۔ لوگوں کی اور ضروریات بھی' خواہ وہ کبریت احمر یا لعل سفید ہی کیوں نہ ہوں' ایسی ارزاں ہیں اور ایسی آسانی سے دستیاب ہوسکتی ہیں جیسے زرد عنبر یا سرخ اناج' علاوہ ازیں روپیہ جو خواہشوں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور لوگوں کو سب سے زیادہ عزیز ہے' اس کے گراں قدر عطیوں اور کثیر انعام و اکرام کی وجہ سے اتنا ارزاں ہوگیا ہے کہ کسی کو بھی چیزوں کی گرانی سے دقت محسوس نہیں ہوتی اور خوش حالی اور آسائش تمام سلطنت میں پھیلی ہوئی ہے...چور' روپے کے سایے سے بھی یوں بھاگتے ہیں جیسے سایہ سورج سے اور انصاف' ظلم کا یوں قلع قمع کر رہا ہے جیسے چراغ اندھیرے کا۔ زبردست ہاتھی کو یہ یارا نہیں کہ کمزور چیونٹی کے راستے میں اکڑ کر پاؤں رکھے

اور بھوکے شیر کی یہ ہمت نہیں کہ لنگڑے ہرن کی چال پر ہنسے " (۱)

خسرو نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ان کے ہم‌عصر برنی کے بیان سے بھی ہوتی ہے ' وہ کہتا ہے کہ : علاءالدین کے عہد کی پہلی تعجب خیز بات یہ تھی کہ اناج ' کپڑا اور ہر قسم کی ضروریات زندگی بہت ارزاں تھیں اور ان کی قیمتوں میں قحط اور خشک‌سالی کے باوجود کبھی کوئی فرق نہ آتا تھا ' جب تک علاءالدین زندہ رہا یہ ارزانی برابر قائم رہی - (۲) مگر تعجب ہے کہ یہی برنی کیقباد کے بادشاہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے - " بہت عرصے کے بعد جیتل اور تنکے تھیلیوں اور پاروں میں دکھائی دینے لگے...لوگوں کو علاءالدین کی بدمزاجی ' تندخوئی اور طرح طرح کے ٹیکسوں سے نجات مل گئی ' سونا چاندی گھروں کے اندر اور باہر ' بازاروں اور محلوں میں پھر نظر آنے لگا " - (۳)

واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین اپنے روپے کو بہت احتیاط سے صرف کرتا تھا ' اس میں وہ فضول‌خرچی اور فیاضی نہ تھی جو مثلاً فیروز خلجی یا کیقباد میں تھی ' اس کی حکمت عملی برابر یہ رہی کہ مال داروں سے روپیہ وصول کیا جائے اور غریبوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے ' چنانچہ خسرو بھی ایک جگہ کہتے ہیں کہ : " اس کی طبیعت کے تمام خواص قانون اعتدال کے مطابق تھے ' اس کا غضب ایسی آگ تھا جو پکاتی

(۱) اعجاز خسروی - دیباچہ (۲) برنی - ص ۳۳۹

(۳) برنی ص ۳۸۲ - ۳۸۳

ہے مگر جلاتی نہیں ، اس کا رحم ایسی نرم ہوا تھا جو ہر کس و ناکس پر چلتی ہے لیکن گرد نہیں اڑاتی ، اس کا مزاج پانی کی طرح تھا جو پیاس بجھاتا ہے لیکن ڈبوتا نہیں اور اس کی سخاوت ایسی کان کی مانند تھی جو خزانے کو جمع کرتی ہے اور اسے برباد نہیں کرتی " (۱)

یہ آخری فقرہ قابل توجہ ہے ، علاءالدین اپنے عطیوں اور انعام و اکرام میں یقیناً حد اعتدال کو ملحوظ رکھتا تھا ، بلکہ اپنے منصبداروں کو بھی بہت واجبی تنخواہیں دیتا تھا ، چنانچہ برنی نے علاءالدین کے عہد کے عجائب کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات خاص طور پر لکھی ہے کہ اس کے خدم وحشم بہت کثرت سے تھے لیکن سب کو بہت قلیل مشاہرے ملتے تھے ، واقعہ یہ ہے کہ جتنے بڑے بڑے ادیب ، عالم شاعر اور ہر نوع کے ارباب کمال اس بادشاہ کے عہد میں جمع تھے اس کے پیشرو بادشاہوں کے زمانے میں کبھی جمع نہ ہوئے تھے اور بظاہر علاءالدین کی جز رسی اور کفایت شعاری کے ان میں سے بہت سے دربار شاہی سے متعلق تھے اور بادشاہ کے مرہون احسان ثناخواں ، ان میں سے بعض کا ذکر آیندہ کسی جگہ ہوگا ، لیکن اس وقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خسرو اس بادشاہ کے عہد میں کس حالت میں رہے اور اس نے کہاں تک ان کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی -

اس میں تو کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا کہ علاءالدین کا عہد خسرو کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور ان کی زیادہ تر تصنیفات اسی زمانے میں مکمل ہوئیں ، چنانچہ غرۃالکمال ، جو خسرو

---

(۱) اعجاز خسروی ، دیباچہ

کا سب سے ضخیم دیوان ہے علاءالدین کے عہد میں مرتب ہوا ۔ اور اس کے بعد چوتھا دیوان بقیہ نقیہ کی تالیف بھی اسی دور میں عمل میں آئی ، ''خمسہ'' کی پانچوں مثنویاں ، عشقیہ کا زیادہ تر حصہ ، خزائن الفتوح اور اعجاز خسروی بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان کے کلام میں وہ پختگی اور متانت وہ سوز و گداز ، وہ دل فریبی اور جاذبیت پیدا ہوئی جو ہر ماہر فن اور صاحب کمال کو مرور زمانہ سے ہی حاصل ہوتی ہے ، علاوہ ازیں ، جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا ، علاءالدین ہی کے عہد میں خسرو کو حضرت نظام الدین اولیا سے بیعت کا شرف حاصل ہوا اور ان بزرگ کے فیض صحبت سے ان کے کلام میں ایک خاص لطافت اور شادابی آگئی جو اس سے پہلے ان کے کلام میں کمتر پائی جاتی تھی ، خسرو کی شہرت دور دور تک پہلے ہی پھیل چکی تھی لیکن اب انہیں ہندوستان کے شعرا میں ہی نہیں بلکہ تمام فارسی گو شعرا میں ایک ایسی حیثیت اور مرتبہ حاصل ہوگیا جس کو ہر وہ شخص جو ذوق ادب اور نظر حقیقت بیں رکھتا ہے تسلیم کرے گا ، ان کے اپنے زمانے میں دہلی شہر اہل کمال کی کان تھا ، خود ان کے الفاظ میں جس پتھر کو اٹھاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعری کا موتی نکل آتا تھا ، اور ہر گز زمین سے جو کھودی جائے خیالات کا ایک چشمہ ابل پڑتا تھا ، لیکن ان سب اہل کمال شاعروں اور ادیبوں میں جو عزت امیر خسرو کو حاصل تھی اور کسی کو نصیب نہ تھی ، اگرچہ خواجہ حسن بھی کافی شہرت رکھتے تھے اور غزل گو شعراء میں انہیں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا ۔ اس لیے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ بادشاہ امیر خسرو کی کماحقہ

تربیت اور قدردانی ضرور کرتا ہوگا ' مگر برخلاف اس کے خسرو کے اپنے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مالی حالت میں علاءالدین کے عہد میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا اور برنی کا یہ قول کہ علاءالدین نے خسرو کے لیے وہی ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا جو فیروز خلجی کے عہد میں انھیں ملتا تھا صحیح معلوم ہوتا ہے - چنانچہ ایک قطعے میں بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے خسرو کہتے ہیں :—

اے شہنشاہی کہ گردون رو بسویت کرد و گفت
بندۂ مستظہرم من از عطای عام شاہ
خواہشم از ختم شاہان شغل مصحف‌دار نیست
تا شود حرز دعایم جوشن اندام شاہ
ہست مقصود آنکہ باری دولتی حاصل کنم
خاصہ چون دریافت بختم نوبت و ایام شاہ

اور ایک مثنوی میں کہتے ہیں :—

بودۂ ز احسان جلالی بدوام تنکہ ز امر دہ ہزار انعام (کذا) (۱)
نیست از شاہ امید جانم کہ مقرر شود آن فرمانم

ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کو مصحف‌داری کا عہدہ اور اس کے ساتھ ایک ہزار تنکہ سالانہ کا وظیفہ بھی ان کی اپنی جد و جہد کے بغیر نہیں ملا -

اسی طرح ایک اور مثنوی میں جسے انھوں نے '' عرض حال '' کا نام دیا ہے وہ بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے اپنے شاعروں پر

---

(۱) برٹش میوزیم کے نسخے میں یہ مصرع اسی طرح درج ہے ' لیکن ظاہر ہے کہ عبارت صحیح نہیں -

داد و دهش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں ' یہ مثنوی علاءالدین کے دور حکومت کے چوتھے سال میں لکھی گئی تھی (۱) ' اور اس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم بادشاہت کے آغاز کے کچھ عرصے بعد تک علاءالدین نے خسرو پر کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی - چنانچہ کہتے ہیں :—

" جس سال ظل الہیٰ نے تخت پر جلوس فرمایا پہلا اعزاز جو مقدر سے مجھے ملا یہ تھا کہ دربار میں میری رسائی ہوگئی ' جہاں میں بادشاہ کے سامنے موزوں مقام خدمت میں کھڑا رہتا تھا - ایک دن جب ایک رنگین قصیدے سے میں نے بساط شاہی پر شکرفشانی کی تو بادشاہ عالم نے مہربان ہو کر مجھے بیٹھنے کا حکم دے دیا - فتح نامہ سن کر خان خانان نے بھی مجھ پر بہت عنایت کی اور مجھے ایک خاص خلعت عطا کیا اور پانچ سو چاندی کے تنکے بھی دیے ' اس احسان کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے ' خدا اس بزرگ خان کی روح کو اپنی مشعل عفو سے روشن کرے - اور خدا کرے کہ بادشاہ ' وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہو کر ہمیشہ تخت مسرت پر جلوہ افروز رہے - اے بادشاہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا عقلمند کوئی بادشاہ نہیں ہوا ' اس لیے کہ آپ ہنر کے پورے قدر شناس ' اشعار کے قابل نقاد اور شاعری کے دوست اور مددگار ہیں ' لیکن افسوس ! مجھ پر ایسا برا وقت پڑا ہے کہ تنگی سے کسب معاش بھی نہیں کر سکتا ' اگر آپ کے وقت میں بھی میری حالت نہ سدھری تو پھر کب سدھرے گی ؟

(۱) انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1177 (بقید تتمہ)

کیسے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسا بادشاہ ہو اور مجھ جیسا شاعر ایسی تنگی میں گزران کرے ، جو وظیفہ مجھے آپ سے ملتا ہے وہ میرا حق ہے اور میری خدمت کا صلہ ہے ، اس لیے کہ میں ہمیشہ رکاب شاہی کے ہمراہ رہتا ہوں...لیکن دل میں آپ کی ثناخوانی کی خواہش ہے ، بغیر صلے کے یہ خواہش کیونکر پوری ہوسکتی ہے ؟ آپ اس بخشش و کرم سے ناواقف نہیں جو پچھلے بادشاہ شاعروں پر کیا کرتے تھے ، جو بعض دفعہ ایک قصیدے کے صلے میں ایک خزانہ بخش دیتے تھے ! ایک قصیدہ لکھنے پر خاقانی کو فی بیت ایک ہزار دینار انعام ملے اور مرو میں معزی سونے کی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا - جب فردوسی نے شاہ نامہ لکھا تو بادشاہ نے اسے ایک ہاتھی کا بوجھ سونا دیا اور پھر بھی اس کے بخل کا افسانہ بن گیا - عنصری کو بھی سلطان محمود سے بےشمار انعام ملتا رہا یہاں تک کہ اس کے گھر کا سب سامان سونے کا تھا ، اس تربیت کی وجہ سے جو بادشاہ شاعروں کی کرتے تھے ، ہمیشہ رہنے والے قصیدے لکھے گئے اور اُن کی سخاوت کی شہرت کو دوام حاصل ہوگیا ، ہمیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کس زمانے میں تھے اور بادشاہوں نے ان کی کیسی تربیت کی ، مگر کل جب ہم مٹ کر فنا ہو جائیں گے تو ہمارے متعلق لوگ کیا بتا سکیں گے ؟ اے بادشاہ جہاں ، اس لیے شاعروں کو خیرات دینا بہت لازمی ہے - اگر اُس زمانے کے سحر آفریں شاعر بےمثل تھے تو میں بھی اپنے وقت میں ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں ، اور اگرچہ میرا نام عنصری نہیں میری شاعری اس کی شاعری سے ہرگز ادنی نہیں ہے ، وہ اپنی شاعری کے ہنر سے سونے کے پیالوں میں شراب

پہنچا تھا ' حضور کی عنایت سے مجھے بھی ایسا کرنے کی امید ہے ' اگر آپ کی تربیت شاہانہ میرے شامل حال ہو تو میں اس سے بھی بازی لے جاسکتا ہوں اس لیے کہ سبزہ بغیر بارش کے نہیں ہوتا اور شاعری بغیر سخی بادشاہوں کی مہربانی کے فروغ نہیں پاسکتی ' آپ جو توقع کی شکایت کو دور کر سکتے ہیں ' مجھے میری شاعری کی خوبی کے مطابق صلہ دیجیے - آج آپ کے گرد و پیش سینکڑوں غلام ہیں جو دن رات آپ کی خدمت میں مشغول ہیں - ان میں سب سے ادنٰے خادم میں بھی ہوں ' آج سے سو سال بعد دنیا ایک اور ہی دنیا ہو جائے گی اور جو لوگ بادشاہ کی ثنا و توصیف پڑھیں گے وہ میری خدمت کی قدر کریں گے ' آپ باقی رہیں گے اگرچہ میں نہ رہوں گا ! میں نہ ہوں گا مگر میری خدمت باقی رہے گی ....

ایک روز آپ نے مجھ پر مہربان ہو کر یہ فرمایا تھا کہ اے ہمارے عہد کے ثناخواں ' خوش ہو کہ تجھے ہماری حکومت سے بلندی نصیب ہوئی اور تو ہمارا مقرب بنا ہم تجھے اتنا مال و دولت دیں گے کہ تو ہر اندیشے اور فکر سے بےنیاز ہو جائے گا - اس وعدہ سے یہ کمترین خادم اب تک قانع رہا " لیکن اس بات کو چار سال گزر گئے ' حضور کا اقبال سینکڑوں برس قائم رہے ' اس خیال سے یہ یاد دہانی کرتا ہوں کہ شاید آپ وہ وعدہ بھول گئے ہوں ' اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ جیسا شخص جو وعدہ کرے وہ ضرور پورا ہوگا - آپ کے لطف و کرم سے ہزاروں غلام مرتبے میں آسمان کو پہنچ گئے ' انہی خوش قسمت غلاموں میں سے ایک مجھے بنا دیجیے " -

خسرو نے تقریباً اسی مضمون کو ایک اور مثنوی میں بھی

ادا کیا ہے، (۱) بقول ان کے پہلے بادشاہ شاعروں کی اتنی قدر کرتے تھے کہ رودکی کو ہر عمدہ شعر پر ایک "من" سونا مل گیا، خاقانی کے پاس اکسوں کے پردے، اطلس کے فرش، جواہرات سے مرصع سازہائی نشاط اور جام‌ہائی شراب تھے، اور رومی اور حبشی غلام اُسے سونے کی رکابیوں اور یاقوت کی قابوں میں کھانا کھلایا کرتے تھے، پھر بادشاہ سے یوں خطاب کرتے ہیں :—

"میں نے اس کوچے میں اپنا گھوڑا اس لیے نہیں ڈالا کہ بادشاہ کی داد و دہش سے مجھے بھی حصہ ملے، میں ان لالچی آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو حرص میں عزت بھی کھو بیٹھتے ہیں، میرا صلہ کم ہو یا زیادہ میں ہر طرح خوش ہوں، اور اگر کم اور زیادہ کچھ بھی نہ ہو تو بھی مجھے کوئی شکایت نہیں، اگر اپنی عنایت سے آپ مجھے بلند کریں تو میں آسمان تک پہنچ سکتا ہوں، لیکن اگر آپ میرا بالکل بھی خیال نہ کریں تو (کیا عجب ہے) اس لیے کہ کسی فقیر کے مرنے کا بادشاہ کو کیا خیال ہوسکتا ہے؟ میں اپنے افلاس اور اپنی تنہائی سے قانع ہوں، میرا بھروسا خدا پر ہے اور وہی مجھے میری روزی دے گا...لیکن بہت افسوس کی بات ہے کہ ساری دنیا تو یوں خوش ہو اور مجھسا شاعر فاقے کرے - میں اس پرند کی طرح ہوں جس نے ابھی ابھی گانا سیکھا ہو اور اس کی زبان باندھ دی جائے اور گلا سی دیا جائے، اب بھی جو شاعری کے

(۱) انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷ - مثنوی کو خسرو اپنا شاہنامہ بتاتے ہیں اس لیے کہ شروع میں علاءالدین کی فتوحات کا ذکر ہے :—

این نظم غیر نیست کہ شہنامۂ من است

خزانے میں لٹا چکا ہوں ان کے مقابلے میں میرا صلہ بہت ہی کم ہے، لیکن ابھی تو کتنے ہی آبدار موتی میرے دماغ میں چھپے پڑے ہیں، اگر میں رے یا روم میں پیدا ہوتا تو میری خار دار جھاڑیاں بھی موم کے درختوں کی طرح نرم اور نازک معلوم ہوتیں، اور جو بھی میرے اشعار پڑھتا اسے میری زیارت کا شوق ہوتا اور وہ دل میں یوں کہتا کہ واللہ وہ ساحر کیسا ہوگا جس نے اتنی کاوش سے ایسی سحر آفریں شاعری کی ہے! مگر اب تو میرے پھولوں میں سے بھی سرکہ ہی نکلتا ہے جس کا رنگ سیاہ اور بو ناگوار ہے، موتی قیمتی ہے اس لیے کہ ہر شخص کے ہاتھ نہیں لگ سکتا لیکن پانی جو کہ زندگی کا جوہر ہے ارزاں ہے اس لیے کہ اس کی اتنی فراوانی ہے۔

اے زبردست بادشاہ مجھے یوں نشانۂ ملامت نہ بنائیے، کیونکہ اپنے ہنر میں میں بے مثل ہوں، اور جو خدمت میں آپ کی کرتا ہوں اگر وہ اس قابل نہیں کہ آپ اس کی قدر کریں، تو بھی میں نے ان چند مہینوں میں جو میں نے آپ کی خدمت میں گزارے ہیں آپ کے قدموں میں اتنے خزانے نثار کئے ہیں کہ ان کی وجہ سے جناب خضر آپ کو آب حیات اس وقت تک دیتے رہیں گے جب تک کہ حرفوں کی سیاہی قائم ہے۔ شاعر جب اپنی قلم کو سیاہی میں تر کرتا ہے تو وہ دو سو برس کی خدمت ایک لمحے میں ادا کر دیتا ہے۔ شاعروں کے الفاظ کو حقارت سے نہ دیکھیے اس لیے کہ ان کے ہر ایک شیریں لفظ میں ایک زندگی مضمر ہے، زر خالص آپ کے کس کام کا ہے جب کہ مرنے کے بعد آپ اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے، آپ کو اس سونے سے حیات ابدی خریدنا چاہیے

تاکہ آپ کی شہرت ہمیشہ باقی رہے" -

معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین نہ صرف خسرو کو صلہ یا انعام دینے ہی میں کچھ بخل برتتا تھا بلکہ ان سے یہ بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ ایک منصب‌دار کی حیثیت سے دربار داری بھی کریں اور اس کی خدمت میں حاضر رہیں - ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شاعر کو بھی گوارا نہیں ہوسکتی اور پھر خسرو جیسے شاعر کے لیے تو یقیناً بہت تکلیف دہ ہوگی ، اپنے زمانے کے سب سے ممتاز شاعر ہوتے ہوئے بھی انہیں اس عہد میں اور منصب‌داروں کی طرح حاضری کی مجبوری اور فرصت اور فراغت سے محرومی جس قدر بھی شاق گزرتی ہو کم ہے - غالباً وہ اس کے عادی نہ تھے ، اس لیے کہ اس سے پہلے انہیں جن مربیوں سے واسطہ پڑا وہ سب ان کا بہت پاس اور لحاظ رکھتے تھے اور ان سے اس سے زیادہ توقع نہ رکھتے تھے کہ وہ ان کی مدح و ثنا کرتے رہیں اور ان کی خاص خاص خوش‌گوار صحبتوں میں ایک ندیم کی طرح شرکت کریں ، اپنے ان جذبات کو خسرو یوں ادا کرتے ہیں -

" اگر دن رات میں جہاں پناہ کے دربار میں اپنی حقیر خدمات انجام دینے کے لیے حاضر نہ رہ سکوں تو اس سے کیا حرج ہے ؟ اس لیے کہ جب سو تاج‌دار سر آپ کے سامنے روز جھکتے ہوں تو آپ ایک گدا کی غیر حاضری کو آسانی سے معاف کر سکتے ہیں ، میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں آپ کی خدمت نہیں کر سکتا ، بلکہ میں تو آپ کی خدمت میں دن اور رات ، صبح اور شام موجود رہ سکتا ہوں ، مجلس میں میں اپنے کلام کی جادو گری دکھا سکتا ہوں اور لڑائی کے وقت تلواروں سے کھیل سکتا ہوں ، بلکہ اگر چاند سے تیروں اور نیزوں کی

بارش ہو رہی ہو تو بھی میں آپ کی رکاب مبارک کو چھوڑ کر نہ جاؤں گا؛ لیکن مجھے تو موتی پرونا ہیں، اور دقیق باتوں کو تازگی خیال کے ساتھ ادا کرنا ہے؛ کبھی تو میں کسی چشمۂ رواں کا رخ کرتا ہوں اور کبھی کسی سرسبز مرغزار کی طرف جاتا ہوں اور آپ کے گوش مبارک کے شایاں کوئی موتی حاصل کرنے سے پہلے میرا خون سمندر کی طرح ابلتا ہے، اگر وہ موتی آپ کے قابل نہ بھی ہو تو بھی آپ کے غلام کے کان کے لایق تو ہوتا ہے؛ اور میں آپ کے حلقۂ خدمت سے اس لیے دور رہنا چاہتا ہوں کہ کہیں میرا موتی لوگوں کے انبوہ میں گم نہ ہو جائے، اگر میں دن رات آپ کی خدمت میں کھڑا رہوں تو میرے دماغ سے کیا شاعری ہوسکتی ہے؟ بغیر غور و فکر کے یقیناً میرے کلام میں نہ تو گہرائی ہوگی اور نہ متانت ''۔

اسی طرح مجنوں و لیلی کے خاتمے میں نظامی کا اپنے سے مقابلہ کرتے ہوئے مثنوی میں اس کی فوقیت اور برتری کے دو سبب بیان کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے صرف مثنوی میں طبع آزمائی کی اور اس لیے اس میں کمال حاصل کر لیا :

او بود بیک فنی نشانہ چوں یک فنہ بود شد یگانہ

اور دوسرے یہ کہ اسے نہ تو معاش کا فکر تھا اور نہ غم روزگار :

وانکہ ز جہان فراغ جستہ وز شغل زمانہ دست شستہ

بارے نہ بدل مگر ہمیں بار کاری نہ دگر مگر ہمیں کار

کوشش ہمہ در سخن سگالی خاطر ز ہر التفات خالی

گنجے و دلی ز محنت آزاد آسودگی تمام بنیاد

برخلاف اس کے اپنی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں :—

'' لیکن میں بیچارہ ضرورت مند اور بےہوش و حواس

رہتا ہوں اور فکر سے میرا خون دیگ کی طرح کھولتا رہتا ہے،
رات سے صبح تک اور صبح سے شام تک مجھے گوشۂ غم میں
آرام کرنے کی مہلت نہیں ملتی، اپنے اس سرکش نفس کی
وجہ سے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے کھڑا رہتا ہوں اور
جب تک سر سے پاؤں تک پسینے میں نہ بھیگ جاؤں میرا
ساتھ کسی کے پانی سے تر نہیں ہوتا (یعنی کوئی مجھے کھانا نہیں
کھلاتا) ۔ جو مزدوری مجھے ملتی ہے اسے لوگ اپنا احسان سمجھتے
ہیں اور جو محنت میں کرتا ہوں وہ سب بیکار محض سمجھی
جاتی ہے، میرا حال اس گدھے کی طرح ہے جو کہ اتنی مشقت
اور رنج سے چارہ لاد کر لاتا ہے اور اسے تھوڑے سے جو کھانے کو
دے دیے جاتے ہیں لیکن وہ بھی بہت ذلت کے ساتھ، اگر کبھی
چند دن کے لیے مجھے اطمینان اور فراغت ملتی بھی ہے تو اتنی
تنگ فرصت میں کیا یہ آسان بات ہے کہ کھودنے والا پتھر سے سونا
کھود کر نکال سکے؟ اس فرصت میں اپنے ممدوح خجستہ کو
بیان کروں (یعنی بادشاہ کی تعریف میں قصیدے لکھوں) یا اپنے
دل کی خواہش کو پورا کروں (یعنی غزلیہ اشعار کہوں)،
یہ تو غنیمت ہے کہ میرا کلام سبک عنان ہے، معانی کی کان دل
میں ہے اور گنجینہ زبان پر، اور میری قلم جس کی نوک
زبان غیب ہے کان غیب کی گنجینہ کشا بنی ہے، میں جب
جلدی میں آواز دیتا ہوں تو معانی لبیک کہتے ہوئے بھاگتے
چلے آتے ہیں چنانچہ میری گرم رفتار نظم کی حرکت پر دلالہ
فکر کی بھی نظر نہیں جم سکتی، اسی لیے باوجود ایسے مشاغل
کے جو دماغ کو پراگندہ کر دیتے ہیں ایک شاخ سے میں
اتنے نئے پھل پیدا کر سکتا ہوں اگر روٹی اور پانی کی تگ و دو

سے ذرا میری جان کو نجات ملتی تو پھر تمہیں معلوم ہوتا کہ ایسے موتیوں سے میں کس طرح آفاق کو پر کر دیتا "۔

ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ خسرو اپنی زندگی کے اس پہلو یعنی بادشاہوں اور امیروں کی مصاحبت اور ملازمت سے اب بالکل متنفر ہوگئے تھے اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ آخر دم تک کسی نہ کسی حیثیت سے دربار شاہی سے وابستہ رہے جس کی وجہ ایک حد تک کسب معاش ضرور تھی لیکن دوسرا سبب یقیناً یہ بھی تھا کہ اس طرز زندگی کے عادی ہوگئے تھے، اس لیے کہ اگر ایک طرف دربار داری اور خدمت شاہی میں پابندیاں اور ناگوار بندشیں تھیں تو دوسری طرف شاہی محفلوں کی دلچسپیاں اور دل‌فریب مشاغل بھی تھے، اور اگر ان کے احساس خودی کو بادشاہوں کی رعونت اور تلون مزاج سے کبھی کبھی ٹھیس لگ ہی جاتی تھی تو اس کا کفارہ اس تعریف اور قدر شناسی سے ہو جاتا تھا جو وقتاً فوقتاً بادشاہوں کی طرف سے ظہور میں آتی رہتی تھی، چنانچہ علاءالدین جیسے جز رس بادشاہ نے بھی ایک موقع پر انہیں ایک قصیدے کے صلے میں ایک گاؤں دے دیا تھا پھر بھی مذکورہ بالا اشعار سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خسرو میں اب زمانہ سازی اور دنیاوی مشاغل میں انہماک کا شوق کم ہوتا جا رہا تھا، ممکن ہے کسی حد تک یہ عمر کا تقاضا ہو مگر اس کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ حضرت نظام‌الدین اولیا سے اب باقاعدہ بیعت ہو چکے تھے اور ان بزرگ کے فیض صحبت سے ان کے خیالات اور جذبات میں ایک بڑا تغیر واقع ہونا شروع ہوگیا تھا، وہ اب بھی بادشاہوں کے دربار میں حاضری دیتے تھے اور اب بھی

ان کی مدح و ثنا میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کو تیار رہتے تھے، لیکن ان کی زیادہ تر توجہ اب دنیاوی معاملات سے ہٹ کر عاقبت سے پیچیدہ مسائل کی طرف منعطف ہوگئی تھی، انہیں شاہی محفلوں کی زیب و زینت، وہاں کے ناچ رنگ، وہاں کی دلچسپ صحبتیں پھیکی اور بےجان معلوم ہونے لگی تھیں اور اپنے پیر و مرشد کا غریبانہ مسکن اور درویشانہ نشیمن ان کے لیے زیادہ جاذبیت رکھتا تھا، اور جو سکون اور آرام انہیں وہاں میسر آتا تھا وہ کہیں اور نصیب نہ ہوتا تھا، دربار سے چھوٹتے تھے تو سیدھے حضرت نظام الدین کے زاویے میں پہنچتے تھے اور اس کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی درباری لباس کے ساتھ ہی طبیعت کا وہ بوجھ بھی جو جھوٹی خوشامد اور ریاکار ظاہر داری کا لازمی نتیجہ ہے اتر جاتا تھا، دل میں ایک نیا ولولہ، ایک نئی طاقت اور ہمت پیدا ہو جاتی تھی جو انہیں دنیاوی مصائب اور افکار کے مقابلے کے لیے قوی تر بنا دیتی تھی۔ یہ نظام الدین کون تھے اور خسرو سے ان کا تعلق کب اور کن حالات میں قائم ہوا؟ اس کا جواب آپ کو آیندہ باب میں ملے گا۔

ساتواں باب

حضرت نظام الدین اولیا اور خسرو ، علاءالدین کا خلجی کا انتقال اور ملک کافور کی سرکشی ، اس کا قتل اور قطب الدین مبارک شاہ کی تخت نشینی

حضرت نظام الدین اولیا کا پورا نام محمد بن احمد بن علی البخاری نظام الدین اولیا تھا اور آپ عام طور پر سلطان المشایخ یا سلطان الاولیاء کے لقب سے مشہور ہیں ، مصنف اخبار الاخیار کے قول کے مطابق آپ کے دادا خواجہ علی بخارا سے ہندوستان آئے اور کچھ عرصے لاہور میں قیام کرنے کے بعد بدایوں میں مقیم ہوگئے (۱) اور وہیں حضرت نظام الدین پیدا ہوئے لیکن مصنف تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اُن کے والد کا نام احمد بن دانیال تھا اور وہ غزنین سے ہندوستان آئے تھے ، بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا خاندان بدایوں میں آباد تھا اور یہی شہر آپ کی جاے پیدایش ہے ، ابھی آپ کا سن پانچ ہی برس کا تھا کہ آپ کے والد اس دنیاے فانی سے رحلت فرما گئے اور اب آپ کی تعلیم اور تربیت کا پورا بار آپ کی والدہ بی بی زلیخا پر پڑا ، یہ بی بی بے انتہا نیک اور فرشتہ خصلت تھیں اور حضرت نظام الدین کے دل پر ان کی تلقین اور تعلیم کا بچپن میں بہت

---

(۱) فرشتہ کے بیان کے مطابق آپ کے والد کا نام احمد بن دانیال تھا جو غزنین سے ہندوستان آئے تھے -

گہرا اثر ہوا اور شروع ہی سے ان کی طبیعت میں مذہب کی طرف میلان پیدا ہوگیا' شوہر کے انتقال کے کچھ عرصے بعد بی بی زلیخا حضرت نظام‌الدین کو لے کر دہلی آگئیں اور یہاں ایک مسجد کے زیر سایہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگیں' روپے پیسے کی تنگی کی وجہ سے ماں بیٹے بہت ہی عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے' لیکن حضرت نظام‌الدین کی تعلیم کی طرف سے ماں نے غفلت نہ برتی اور جو کچھ بھی تھوڑا بہت اس سلسلے میں کر سکیں کرتی رہیں'

اس زمانے میں دہلی میں ایک بڑے متقی اور عالم آدمی تھے جن کا نام شمس‌الدین خوارزمی تھا اور جن کو بعد میں بلبن نے اپنا وزیر بنا لیا تھا' خوش‌قسمتی سے حضرت نظام‌الدین کو ان سے استفادے کا موقع مل گیا اور اُستاد نے بھی شاگرد کو ذہین اور ہونہار دیکھ کر پوری توجہ سے تعلیم دی' نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ سال سے کم عمر میں ہی حضرت نظام‌الدین سب علوم ظاہریہ اور باطنیہ میں ماہر ہوگئے - ان کے ہمسائے میں ایک اور بزرگ رہتے تھے جن کا نام نجیب‌الدین المتوکل تھا اور جو خواجہ فریدالدین گنج شکر کے بھائی تھے' آپ ان بزرگ کے گھر اکثر آتے جاتے رہتے تھے' ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ آپ وہاں موجود تھے کہ ملتان سے ایک قوال جس کا نام ابوبکر تھا نجیب‌الدین المتوکل کی زیارت کو آیا' یہ اجودھن (پاک پتن) میں خواجہ فریدالدین کے پاس رہ کر آیا تھا اور اس نے خواجہ فرید کی دین‌داری اور بزرگی' اجودھن کی خانقاہ کے حالات اور وہاں کے مشاغل کی کیفیت کچھ' ایسے دلچسپ طریقے پر بیان کی کہ حضرت نظام‌الدین کو اجودھن جانے اور خواجہ فریدالدین

سے ملنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوگیا ، چنانچہ آپ اجودھن روانہ ہوگئے اور چند سال خواجہ فریدالدین کی خدمت میں گزار کر اُن سے معرفت کے حقایق اور تصوف کے رموز سیکھے - اُستاد اپنے ہونہار شاگرد سے ایسے خوش ہوئے کہ اُنہوں نے ایک جبّہ اور ایک سجادہ دیا اور دہلی میں اپنا نایب بنا کر اُنہیں رخصت کیا ۔

دہلی پہنچ کر حضرت نظام‌الدین کچھ عرصے اس شش و پنج میں رہے کہ شہر میں قیام کریں یا شہر سے کہیں دور ، اس لیے کہ دہلی کا شہر ان دنوں سب قسم کے لوگوں کا ملجا بن گیا تھا آوارہ اور اوباش ، بدچلن اور گمراہ غرض یہ کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل ملامت اشخاص کا وہاں بہت ازدحام تھا اور آپ ایسے لوگوں کی صحبت اور قرب سے دور بھاگنا چاہتے تھے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی خیال تھا کہ ایسے لوگوں کی اصلاح اور درستی کا بیڑا اگر آپ نہ اُٹھائیں گے تو کون اُٹھائے گا - آخر بہت غور اور فکر کے بعد آپ نے ایک ایسی جگہ کو پسند کیا جو شہر میں تو نہ تھی لیکن وہاں سے زیادہ دور بھی نہ تھی ۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں غیاث پور تھا اور یہ وہی مقام ہے جس کے گرد و پیش بعد میں کیلوکھری کا نیا شہر آباد ہوا - یہاں آپ نے اس زاویے یا خانقاہ کی بنیاد رکھی جو ان کی زندگی میں دہلی کے باشندوں کا سب سے بڑا مذہبی اور روحانی مرکز بن گئی اور ان کے انتقال کے بعد چھ سو سال تک ھندوستان بھر کے خوش عقیدہ مسلمانوں اور ھندوؤں کی زیارت گاہ رہی ہے ۔ جب خواجہ فریدالدین کا انتقال ہوگیا تو ان کی وصیت کے مطابق آپ ھندوستان میں چشتیہ فرقے کے صدر اور صوفیہ بزرگوں کے پیشوا کی حیثیت سے ان کے جانشین ہوگئے اور یہ کوئی

معمولی بات نہ تھی ، اس لیے کہ خواجہ فریدالدین کے اپنے بیٹے بھی موجود تھے جو یقیناً اس اعزاز کی تمنا رکھتے ہوں گے اور اُن کے ایک بھانجے خواجہ علاءالدین صابر کو تو ، ایک روایت کے مطابق ، اس وصیت پر خاصا اعتراض ہوا اور ناراض ہو کر وہ اجودھن سے کلیر چلے گئے - اس طرح گویا حضرت نظام الدین ہندوستان میں صوفیۂ چشت کے چوتھے پیشوا ہوئے اور آپ نے اپنے پیش روؤں کی گدی پر بیٹھ کر اس تلقین اور تبلیغ کے کام کو جسے سب سے پہلے خواجہ معین الدین نے شروع کیا تھا پہلے سے بھی زیادہ سر گرمی سے شروع کر دیا -

آپ کو غیاث پور میں قیام کئے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ آپ کے تقدس کا شہرہ تمام دہلی میں ہوگیا اور لوگ دور دور سے آپ سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے آنے لگے ، اُس زمانے کے مورخ برنی نے اپنی تاریخ میں حضرت نظام الدین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ، وہ کہتا ہے :—

" حضرت شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا دروازہ سب کے لیے کھول رکھا تھا اور سب گنہگاروں کو چغے اور معافی عطا کر کے اُنہیں اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے رہتے تھے ، خواص اور عوام ، دولت مند اور غریب ، امیر اور فقیر ، عالم اور جاہل ، نرم مزاج اور تند خو ، شہری اور دیہاتی ، آزاد اور غلام ، غرض سب قسم کے لوگوں کو آپ کلاہ چہار گوشہ اور مسواک طہارت عطا کرتے تھے اور ان کے لیے دعاے خیر کیا کرتے تھے ،... سب لوگ جو ان کے معتقد تھے تقوی اور پرہیزگاری میں آپ کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے تھے ، عورت اور مرد ، جوان اور بوڑھے ، ادنی اور اعلی ، خادم اور غلام بلکہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی باقاعدہ

نماز پڑھنے لگے تھے'... نیک دل امرا نے شہر اور غیاث پور کے درمیان کئی خوش گوار مقاموں پر چبوترے بنوا کر ان پر چھپر ڈال دیے تھے اور کوئیں کھدوا دیے تھے ان چبوتروں میں پانی کے بڑے بڑے مٹکے اور مٹی کے لوٹے رکھے رہتے تھے' چٹائیاں بھی موجود رہتی تھیں اور قاری اور حفاظ مقرر کر دیے گئے تھے تاکہ ' جو زائرین شیخ الاسلام کی خانقاہ کی زیارت کو آئیں انہیں آتے جاتے راستے میں نماز کے وقت وضو کی دقت نہ ہو' ان سب چبوتروں میں نمازیوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی تھی' لوگوں نے خلاف شرع باتوں کا ذکر یا ان پر عمل بالکل ترک کر دیا تھا اور اب زیادہ تر مذہبی معاملات ہی پر گفتگو کرتے تھے" تقوی اور پرہیزگاری کا جذبہ اس قدر ترقی پزیر تھا کہ" بادشاہ کے محل کے بہت سے منصب دار' سلاحدار' کاتب' اور غلام جو حضرت شیخ کے مرید ہوگئے تھے چاشت اور اشراق کی نماز پڑھنے لگے تھے اور ایام بیض اور عاشورۂ محرم کے روزے رکھا کرتے تھے" شہر کا کوئی محلہ ایسا نہ تھا کہ جہاں بیسویں دن یا ہر مہینے لوگ جمع ہو کر سماع میں شریک نہ ہوتے ہوں اور وجد کی حالت میں نالۂ و بکا نہ کرتے ہوں' خود سلطان علاءالدین" اپنے خاندان سمیت آپ کا بہت معتقد تھا اور سب قسم کے لوگوں کے دل نیکی اور راستبازی کی طرف مائل ہو چکے تھے" چنانچہ علاءالدین کے عہد کے آخری دور میں یہ کیفیت تھی کہ شراب' عورت' جوئے یا اور بری باتوں کا نام بھی لوگوں کی زبان پر نہ آتا تھا' زیادہ تر امرا اور بڑے لوگ اور طالب جو شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے مذہبی کتابوں کے مطالعے میں مصروف نظر آتے تھے' ایسی کتابیں جیسے احیاءالعلوم

اور اس کا ترجمہ ، عوارف ، کشف المحجوب ، قوۃالقلوب ، شرح تعرف ، رسالۂ قشیری ، مرصاد العباد ، مکتوبات عین القضاۃ ، قاضی حمیدالدین ناگوری کی کتاب لوائح اور لوامع اور امیر حسن کی تصنیف فوائدالفواد کے بہت سے گاہک مشتاق رہتے تھے اور کتب فروشوں کی دکانوں پر لوگ زیادہ تر تصوف اور حقائق کی کتابیں تلاش کیا کرتے تھے ، کوئی پگڑی ایسی نظر نہ آتی تھی جس میں مسواک اور کنگھا آویزاں نہ ہو اور چمڑے کے بنے ہوئے لوٹے اور برتن صوفی خریداروں کی کثرت کے سبب بہت گراں ہو گئے تھے ''۔ (۱)

برنی کے اس بیان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت نظام الدین کا روحانی اثر خصوصاً علاءالدین کے زمانے میں ، بہت وسیع تھا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ایک ایسے دور میں جب کہ سیاسی سازباز ، کشت و خون اور لڑائی جھگڑے اس قدر عام تھے آپ کی خانقاہ ایک ایسی جائے پناہ تھی کہ جہاں ان کے مرید دنیا کے ان جھگڑوں کو بھول کر کم از کم کچھ عرصے کے لیے وہ اطمینان قلب حاصل کر سکتے تھے کہ جو انہیں اور کہیں میسر نہ ہو سکتا تھا ، حضرت نظام الدین کی اپنی نیک اور راہبانہ زندگی سب قسم کے لوگوں کے لیے ایک مشعل ہدایت تھی - آپ نے عمر بھر شادی نہیں کی اور آپ کے زیادہ تر اوقات عبادت میں گزرتے تھے ، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ رات رات بھر جاگ کر یاد خدا میں مصروف رہتے تھے ، لیکن اس کے ساتھ ہی آپ میں خاص صفت یہ تھی کہ آپ

---

(۱) برنی : ص : ۳۴۳ و ما بعد

زہد و تقویٰ کے ساتھ ایک زندہ دل رکھتے تھے ؛ وہ مذہبی تقشف جو بعض خشک زاہدوں میں پیدا ہو جاتا ہے آپ میں بالکل نہ تھا ؛ خوش مزاج اور ظریف طبع تھے ؛ شعر شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اپنے فرقے کے عقائد کے بموجب سماع کو جائز سمجھتے تھے ؛ چنانچہ آپ کے زاویے میں اکثر اچھے اچھے قوال دف یا ڈھولک کے ساتھ امیر خسرو ؛ سید حسن اور اور شعرا کی غزلیں پڑھتے تھے اور آپ ان سے حظ اُٹھاتے تھے ؛ اگرچہ بعض خلاف شرع عادتوں مثلاً تالی بجانا یا مزامیر کے استعمال کو برا سمجھتے تھے ؛ آپ کا یہ وصف ایسا تھا جس نے آپ کو لوگوں میں اور بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا ؛ سب طبقے کے لوگ آپ کے معتقد تھے ؛ شہزادہ خضر خان تو باقاعدہ مرید ہوگیا تھا چنانچہ خسرو کہتے ہیں : خضر دستش گرفت و خضر خان[۲] یافت ؛ مگر شاہی خاندان کے تقریباً سب لوگ ہی آپ کے عقیدت مند تھے - خود علاالدین فکر اور پریشانی کے زمانے میں اکثر آپ کی طرف رجوع کرتا تھا ؛ ایک موقع پر اس نے اپنے مقرب خاص قرا بیگ کے ہاتھ دو لاکھ تنکے آپ کی خدمت میں بھیجے اور ایک اور موقع پر جب ملک کافور جنوبی ہندوستان کی مہم پر گیا ہوا تھا اور کچھ عرصے تک شاہی فوج کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی تو اس نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ دعا کریں کہ خدا اس مہم میں کامیابی عطا کرے - بعض ایسے طبقوں کے لوگ بھی کہ جن کو جرائم پیشہ کہا جاسکتا ہے جیسے ٹھگ وغیرہ بھی آپ کے ارادت مند تھے اور سب قسم کے لوگوں کی طرف سے آپ کو برابر نذریں اور تحایف پہنچتے رہتے تھے ؛ جو کچھ بھی آپ کے ہاتھ میں آتا تھا آپ اسے غریبوں اور درویشوں

پر صرف کر دیتے تھے ' لنگر خانہ برابر جاری رہتا تھا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے اخراجات کے لیے آپ کو کسی قسم کی تنگی محسوس ہوئی ہو -

خسرو بھی اُن خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو حضرت نظام الدین کی بزرگی کے معترف اور ان کے فیض صحبت سے بہرہ مند تھے ' بعض تذکرہ نویسوں نے تو لکھا ھے کہ وہ آٹھ سال کی عمر میں ھی حضرت نظام الدین کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے ' لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ' بلکہ خسرو کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ھے کہ وہ سنہ ۶۷۱ھ میں باقاعدہ مرید ہوئے اگرچہ غالباً اس سے پہلے بھی اُنھیں شیخ الاسلام سے ملنے کا شرف ضرور حاصل ہو چکا ہوگا ' اُدھر حضرت نظام الدین بھی طوطی ہند خسرو سے ناواقف نہ تھے اور ان کے کلام کی شیرینی سے اکثر چاشنی گیر ہوتے رہے تھے ' اس لیے جب خسرو مرید ہونے کے ارادے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ ایک ترک ہم سے ملنے آیا ھے اسے اندر بلالو - جب خسرو آئے تو آپ نے انھیں بہت لطف و کرم سے اپنے پاس بٹھایا اور ان سے باتیں کیں - اس کے بعد ان سے بیعت لی اور انھیں ایک بارانی اور کلاہ چہار ترکی عنایت کیا - آپ تھوڑے عرصے بعد ھی خسرو سے بےحد مانوس ہوگئے ' انھیں آپ نے ترک اللہ کا لقب دیا تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اور سب سے اُکتا جاتا ہوں لیکن خسرو سے کبھی نہیں اُکتاتا ' اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز مجھے یہ امید ھے کہ اس ترک کے دل میں جو آگ سلگ رہی ھے اس کی گرمی سے میرا نامۂ اعمال پاک ہو جائے گا ' خسرو کی تعریف

میں آپ نے ایک رباعی بھی کہی تھی جو حسب ذیل ہے :—

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیست کہ ملک سخن آن خسرو راست
آن خسرو ما ست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ما ست (۱)

یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک قبر میں دو آدمیوں کو دفن کرنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ چاہتا کہ خسرو کو میرے ساتھ دفن کیا جائے ' چونکہ یہ ممکن نہ تھا اس لیے آپ نے یہ وصیت کی تھی کہ خسرو کی قبر آپ کے پہلو میں بنے ' لیکن بعد میں اس پر عمل نہ ہوسکا اس لیے کہ بعض لوگوں کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ اس طرح حضرت نظام‌الدین اور امیر خسرو کی قبر میں مغالطے کا امکان رہے گا -

حضرت نظام‌الدین کی نظر میں خسرو کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ جو بات آپ کے سامنے اور لوگ نہ کرسکتے تھے خسرو کرسکتے تھے اور اسی لیے لوگ خسرو کے ذریعے ہی اکثر آپ سے عرض معروض کیا کرتے تھے ' خسرو کی گوناگوں صفات کا آپ سے بڑھ کر کون قدردان ہوسکتا تھا ' جب خسرو نے اپنا تذکرہ جو افضل‌الفوائد کے نام سے مشہور ہے لکھنا شروع کیا تو اس کے چند اوراق آپ کے ملاحظے کے لیے پیش کئے - آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ " نیکو نوشتۂ و نیکو نام کردۂ " (یعنی تو نے خوب لکھا ہے اور نام بھی اچھا رکھا ہے) - آپ نے اس مسودے کو جگہ جگہ اپنے ہاتھ سے درست بھی کیا اور پھر حاضرین سے

(۱) ہفت اقلیم

کہنے لگے کہ خسرو کے لیے واقعی یہ بات قابل فخر ہے کہ اس نے اتنی باتیں یاد رکھیں اور لکھیں حالانکہ وہ ہر وقت سر سے پاؤں تک خیالات کے سمندر میں غرق رہتا ہے، لیکن خدا نے خسرو کے تمام اعضا کو علم اور دانش سے خمیر کیا ہے کیونکہ وہ دن رات خیالات کے بحر میں شناوری کرتا ہے اور ہزاروں موتی نکال کر لاتا ہے - یہ سن کر خسرو تعظیم بجا لائے اور کہنے لگے کہ "یہ سب خیالات جو میرے دماغ میں آتے ہیں آپ ہی کی برکت سے ہیں، اس لیے کہ آپ ہی نے اپنی بابرکت تلقین سے میری تربیت کی ہے" - (۱)

دوسری طرف خسرو کے دل میں جو عقیدت مند اور نیازمندی اپنے مرشد کی طرف پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے کلام سے بخوبی عیاں ہے - بیعت کے بعد کوئی ایسی تصنیف نہیں ہے جس میں حضرت نظام الدین کی بزرگی اور کرامات کا ذکر یا ان سے اپنی ارادت کا اظہار نہ ہو، چنانچہ "نہ سپہر" میں کہتے ہیں :

خوش آن دم کہ من ز اعتقاد ضمیر
گرفتم بحق دست آن دست گیر

بنہ بحر از آنجا مرا راہ شد
کہ کشتی مرا دست آن شاہ شد

من از وی لعاب دہن یافتم
کہ زین گونہ آب سخن یافتم

زلالم کہ خضر آب جوی ویست
بدان زندہ ام چون ز جوی ویست

---

(۱) افضل الفوائد ص ۱۰۰ و ما بعد

دو قطرہ کز آن در دوات افگنم
بظلمت در آب حیات افگنم

چو آن قطرہ از خامہ رانم برون
ازان قطرہ دریا فشانم برون

شد این قطرہا گرچہ گوہر نظام
نگردد مہیا صفتہاے پیر

ولی زین خجالت نیارم برو
کہ ہم ز آن او می نثارم برو

اسی جذبۂ عقیدت کے ماتحت خسرو نے حضرت نظام الدین کے اقوال کو جمع کرنا شروع کیا اور ایک مختصر سا رسالہ افضل الفواید جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے تصنیف کیا ' خسرو کو یہ خیال غالباً خواجہ حسن کی اسی نوعیت کی کتاب فوائدالفواد کو دیکھ کر پیدا ہوا - اس میں شبہ نہیں کہ حسن کی تصنیف زیادہ ضخیم اور جامع ہے لیکن خسرو کا رسالہ بھی بعض لحاظ سے قابل قدر ہے اور کم از کم اس حیثیت سے کہ یہ ایک نذرانۂ عقیدت تھا جسے شرف قبول بھی حاصل ہوا - اس رسالے سے بعض ان لوگوں کے نام بھی معلوم ہوتے ہیں جو حضرت نظام الدین کے اکثر گرد و پیش رہتے تھے اور ان میں خواجہ حسن' برہان الدین غریب ' شہاب الدین میرٹھی ' اور مغیث الدین ہانسوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

حضرت نظام الدین کی صحبت سے خسرو کو جو اطمینان اور سکون قلب حاصل ہو سکتا تھا اس کی انہیں ان دنوں ضرورت بھی بہت تھی ' اس لیے کہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے علاءالدین کے عہد میں وہ ایک حد تک اس فارغ البالی سے محروم

ہوگئے تھے جس کے وہ اس سے پہلے عادی رہے تھے، دوسرے اسی زمانے میں انھیں دو اور بڑے صدمے برداشت کرنے پڑے یعنی ایک سال کے اندر ہی ان کی والدہ اور چھوٹے بھائی حسام‌الدین قتلغ دونوں کا انتقال ہوگیا اور اس طرح خسرو اپنی والدۂ مہربان کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے اور ایک ایسے بھائی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے جو ان کے دست و بازو تھے، اس بڑے اور جاں‌کاہ صدمے کا ذکر اُنھوں نے اپنی مثنوی مجنون و لیلیٰ میں بہت دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار بے ساختگی کلام اور سادگی زبان کا بہت اچھا نمونہ ہیں، اس لیے ان میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں:—

ماتم‌کدہ شد جہان نہان نیست ماتم زدہ کیست کز جہان نیست
زان جملہ ستم یکی درین سوز از روزی خویشتن بدین روز
کامسال دو نور ز اخترم رفت هم مادر و هم برادرم رفت
ماتم دو شد و غم دو افتاد فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چو منی را یک شعلہ بسی است خرمنی را
یک سینہ دو بار بر نگیرد یک سر دو خمار بر نگیرد
چون مادر من بزیر خاک ست گر خاک بسر کنم چہ باک ست
اے مادر من کجائی آخر؟ رو از چہ نمی نمائی آخر؟
خندان ز دل زمین برون آی بر گریۂ زار من ببخشای
راندی بہ بہشت کشتی خویش رو تافتی از بہشتی خویش
هر جا کہ ز پاے تو غباریست ما را ز بہشت یادگاریست
شیرازۂ جزو من ز تقدیر آمیختہ خون تست با شیر
مہرے کہ بشیر شد فراهم تا جان نرود کجا شود کم
گیرم کہ شدی ز دیدہ مستور از سینۂ من کجا شوی دور

زانجا که نوازشت فزون بود | گستاخی من ز حد برون بود
زان بی ادبی که بیش کردم | اینک ز فراق زخم خوردم
با ناز نماند دولتم جفت | ناز از چه کنم چو دولتم خفت
لیکن که ترا چو نام زنده است | خود دولت من همان بسنده است
نام تو پناه خویش سازم | تعویذ کلاه خویش سازم
روزی که لب تو در سخن بود | پند تو صلاح کار من بود
امروز همم بمهر و پیوند | خاموشی تو همی دهد پند
دانم که تو در بهشت جاوید | رخشنده‌تری ز ماه و خورشید
چون ست بر تو همسر من | فرزند تو و برادر من
قتلغ که مرا ز حق تبارک | بوده است چو نام خود مبارک
در معرکه اژدها نظیرے | در مستی باده شیر گیرے
رو از همه سو برزم چون تیغ | تیغ از همه رو چو برق در میغ
آئین غزا تمام کرده | دولت لقبش حسام کرده
در حمله درست چون پدر شیر | نے هم چو من شکسته شمشیر
چون حرف پدر همه زبر کرد | هم عزم ولایت پدر کرد
شد جان پدر ز جان او شاد | لیکن غم او بجانم افتاد
اے مونس و یاورم غم تو | نه از دل که ز جان خورم غم تو
بے مونس بے رفیق و بے یار | چونی و چه میکنی در آن غار
رفتی و توان ز بازوم رفت | نقد شرف از ترازوم رفت
خواهم که بجستنت شتابم | جویم ولی از کجات یابم
بسیار شبت بشادمانی | آمد بصبوح کامرانی
دوران که قدح لبالبت داد | در خوردن نشستن شبت داد
چه شد که تنک شراب گشتی | پیش از دگران خراب گشتی
هر نیم‌شبی و صبحگاهی | از حسرت تو بر آرم آهی

چون تو نکنی بسوی من راه　　از آه چه خیزدم همان آه
دانم که بدین شغب فزائی　　ز انجا که تو رفتهٔ نیائی
لیکن چه کنم که ناشکیبم　　خود را به بهانه می فریبم
نائی چو بکوششم فراچنگ　　از بی‌گہری بدل نہم سنگ
سنگین کنمُ این دل پر آتش　　کآتش باشد بسنگ در خوش
در سینه نہم ز سوگواری　　غمہای ترا به غم‌گساری
نقش تو بدل نگار سازم　　وز یاد تو یادگار سازم

یارب که برحمت گنه شوی　　از گرد گنه بشوی شان روی
آمرزش خویش یار شان کن　　بخشائش خود نثار شان کن
میدار بخلد شان فراهم　　نوبت چو بمن رسد مرا هم

لیکن اب علاءالدین خلجی کا وقت بھی قریب آ پہنچا تھا وہ بیمار پڑا اور ایسا بیمار ہوا کہ صاحب فراش ہوگیا ' بڑھاپے میں آدمی کی قدر یوں بھی کم ہو جاتی ہے اور جب وہ بیکار ہو جائے تو ظاہر ہے لوگ اور بھی اس کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں ' چنانچہ اس کی اس علالت کے زمانے میں گھر کے لوگوں نے اس کی طرف خاص توجہ نہ کی اور اتنا عظیم‌الشان بادشاہ اپنے غلام ملک کافور کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ' اس کی بیویوں کو اپنے بچوں کی بیاہ شادی کے مشغلے سے فرصت نہ ملتی تھی ' بڑا لڑکا خضر خاں امروہے میں تھا ' اور لڑکے ابھی نسبتاً ناسمجھ تھے اور اس کے بھائی الماس بیگ اولوغ قتلغ کا ' جو اس کا بڑا ہمدرد اور بازوے کار تھا ' انتقال ہو چکا تھا ' اب لے دے کر ملکۂ جہاں کا بھائی الپ خاں ایک

قابل اور وفادار ملک رہ گیا تھا - وہ اس زمانے میں گجرات کا حاکم تھا ' ملک کافور کی نظر میں یہ ملک بہت کھٹکتا تھا ' چنانچہ اس نے اُسے آخر کسی حیلے سے قتل کروا دیا ' اس قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ گجرات میں شورش اور فساد رونما ہوگیا اور ملک بھر میں ایک عام بےچینی رونما ہوگئی - اُدھر خضر خاں کی طرف سے ملک کافور نے بادشاہ کو ایسا بدظن کر دیا کہ اس کا دہلی میں داخلہ بند ہوگیا اور اس نے یہ غلطی کی کہ وہ باپ کی اجازت کے بغیر اس سے ملنے دہلی چلا آیا جس سے علاءالدین کے شبہات میں اور اضافہ ہوگیا '

واقعہ یہ تھا کہ خضر خاں کو خبر ملی کہ علاءالدین کی حالت اب بہتر ہے ' اس کی علالت کے سلسلے میں دعا کرنے کے لیے وہ مختلف زیارت گاہوں کا دورہ کر رہا تھا اگرچہ بظاہر اس دورے میں بھی اس نے اپنے معمولی طریقے ترک نہ کئے تھے ' چنانچہ خسرو کہتے ہیں کہ :

چو بر رسم زیارتگاہ میرفت ہزاران رہزنش ہمراہ میرفت
بدستش طرۂ سیمین عذاران چو سبحہ در کف پرہیزگاران (۱)

بہر حال اسی چکر میں وہ ہستناپور بھی پہنچا لیکن تعجب یہ ہے کہ اس نے اپنے پیر حضرت نظام‌الدین کی طرف رجوع نہیں کیا اور چونکہ دہلی قریب تھا اس نے سوچا کہ باپ سے بھی ملتا جاؤں - اب ملک کافور کو بادشاہ کے کان بھرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا اور اس نے خضر خاں کے لیے علاءالدین سے گوالیار بھیج دیے جانے کا حکم حاصل کر کے اُسے

(۱) عشیقہ

دہلی بھیجتا گیا ' علاءالدین خضر خاں کو بہت چاہتا تھا مگر اس وقت کچھ تو اس کی فطری سخت گیری اور کچھ بدگمانی دونوں مل کر جذبۂ محبت پر غالب آگئیں - علاءالدین کے اس فعل پر تعجب کرتے ہوئے خسرو کہتے ہیں :

" معاذاللہ ' نہ جانے علاءالدین کا کیسا دل تھا کہ ایسا موتی اس کے نزدیک مٹی کے برابر تھا ' ایک ایسے قطرے کو جو سمندر کی طرح تھا اور اُسی سے ٹپکا تھا ' اس نے یوں دور پھینک دیا جیسے ماتھے سے کوئی پسینے کی بوند کو پھینک دے ' اس کا ضبط اور تحمل ایسا تھا کہ اگرچہ اس کی جان رخصت ہو رہی تھی اس کا دل نرم نہ ہوا ' اس کا عزیز بیٹا اس کی نظروں سے غائب ہو رہا تھا لیکن اس نے اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ بہنے دیا " - (۱)

خضر خاں کے گوالیار جاتے ہی علاءالدین کا انتقال ہوگیا ' خسرو کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین سے جلدی پیچھا چھڑانے کے لیے غالباً ملک کافور نے اسے زہر دے دیا ' کیونکہ وہ اکثر علاءالدین کو شاہ شہید لکھتے ہیں اور ایک جگہ ملک کافور کو مہدی کش کے نام سے یاد کرتے ہیں - بہر حال اب ملک کافور کا راستہ صاف ہوگیا ' اس نے خضر خاں کی ولی عہدی سے برطرفی کا حکم تو علاءالدین سے لے ہی لیا تھا اس کے ایک خورد سال بھائی شہاب الدین کو تخت پر بٹھا کر خود پوری سلطنت کا مالک بن بیٹھا ' اور اپنے ہم قوموں اور ہم شہریوں کو بڑے بڑے عہدے دینے شروع کر دیے - بقول خسرو :

---

(۱) عشقیہ

بہار فتنہ خلق، از دور دیدند کہ بار سنبل و کافور دیدند (۱)
کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ تخت دہلی کو اس کے
پنجے سے نجات دے ' لیکن کافور کی قسمت میں زیادہ دن
حکومت نہ لکھی تھی ' ۷ شوال سنہ ۷۱۵ھ کو علاءالدین کا انتقال
ہوا اور کافور نے حکومت سنبھال کر پہلا کام یہ کیا کہ خضر خاں کو
گوالیار کے قلعے میں اندھا کر کے قید کر دیا ' اس کے دو اور
بھائیوں شادی خاں اور فرید خاں کا بھی یہی حشر ہوا ' ایک
اور بھائی مبارک شاہ ابھی باقی تھا اور یقین ہے کہ اس کا
انجام بھی ایسا ہی افسوسناک ہوتا ' لیکن اس سے پہلے کہ
کافور اُسے کوئی گزند پہنچا سکے اس کے اپنے بعض خاص مقربین
نے سازش کر کے اُسے ہزار ستون کے محل میں قتل کر دیا '
اور اس طرح مبارک شاہ جس کی عمر اس وقت کوئی بیس سال
کی تھی کافور کی ایک مہینے کی مختصر حکومت کے بعد تخت
سلطنت کا وارث بن گیا '

---

(۱) مشیقہ ۔

آٹھواں باب

مبارک شاہ سے خسرو کے تعلقات، مثنوی نہ سپہر کی تصنیف، مبارک شاہ کا خسرو خاں کے ہاتھوں قتل، تغلق شاہ کا انتقام اور تخت نشینی، حضرت نظام الدین کا وصال اور خسرو کا انتقال۔

مبارک شاہ ۲۴ محرم سنہ ۷۱۶ھ کو قطب الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا اور ملک بھر میں عام طور پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا گیا اس لیے کہ ایک تو علاءالدین کی بیس سال کی سخت گیر حکومت سے بعض لوگ تنگ آگئے تھے اور دوسرے ملک کافور نے اپنی چند روزہ حکومت میں بے انتہا تشدد اور ظلم سے کام لیا، نیا بادشاہ نوجوان، خوش مزاج اور شوقین طبیعت کا تھا، برائے نام تو سلطنت میں شراب خواری ممنوع رہی لیکن لوگوں نے بادشاہ کی مثال کو پیش نظر رکھ کر چوری چھپے خوب رنگ رلیاں منانا شروع کیں اور بقول برنی کوئی ایسا گھر نہ تھا جس پر میخانے کا گمان نہ ہوتا ہو، خوبصورت غلاموں اور لونڈیوں کی اتنی مانگ بڑھی کہ ایک ایک کی قیمت بیس ہزار تنکے تک پہنچ گئی اور لوگوں نے عیش و عشرت کے لوازمات میں دل کھول کر روپیہ لٹانا شروع کر دیا، مگر آخر کس باپ کا بیٹا تھا، جہانگیری کا شوق اس کے دل میں بھی سمایا، کبھی سوچتا تھا کہ مغلوں کی سرکوبی کے لیے ایک بڑی مہم لے کر روانہ ہو، کبھی

ہندوستان کے بعض دور دراز حصوں کی تسخیر کے منصوبے باندھتا تھا - آخر رائے یہی ٹھہری کہ جنوبی ہند کا رخ کیا جائے ' چنانچہ بادشاہ خود مع ایک بڑے لشکر کے دہلی سے روانہ ہوا اور دیوگیر پہنچا ' یہاں راجہ رام دیو کے نائب راگھو نے مقابلہ کیا ' مگر شکست کھا کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا ' اور بادشاہ دیوگیر میں داخل ہوئے - خسرو بادشاہ کے ہمرکاب تھے اور اس موقع پر اُنھوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جس میں اس شہر کی بہت تعریف اور توصیف کی ہے - اس قصیدے سے علاوہ اور دلچسپ باتوں کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین نے دیوگیر کا نام اپنے نام پر قطب آباد رکھا تھا ' چنانچہ اُس زمانے کے ایک سکے سے بھی خسرو کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے ' (۱)

دیوگیر سے بادشاہ نے اپنے خاص مقرب خسرو خاں کو جو گجرات کی قوم پروار یا براؤ سے تھا اور مسلمان ہوگیا تھا چتر اور فوج دے کر تلنگ کی جانب روانہ کیا اور خسرو خاں نے ادر دیو (ردرا دیوا) کی فوج کو شکست دے کر وارنکل یا ارنکل کا محاصرہ کر لیا ' راجہ نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور علاوہ کئی بیش قیمت تحائف کے بیس لاکھ اچھو سالانہ خراج دینا منظور کیا ' اپنے ملک کے پانچ موضعوں کو بھی بادشاہ کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا لیکن بعد میں صرف بدرکوٹ یا بدرکوب کے حوالے کر دینے پر مصالحت ہوگئی اور خسرو خاں سب مال غنیمت

---

(۱) دیکھو - Thomas : Chronicles of the Pathan Kings ص : ۱۷۹-۱۸۰ - مصنف ' قطب آباد کو دہلی کے مضافات میں کسی مقام کا نام سمجھا ہے - لیکن اُس کا خیال یقیناً صحیح نہیں ہے -

لے کر دیوگیر پہنچا، وہاں سے بادشاہی لشکر بڑے ترک و احتشام کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ دہلی میں بادشاہ کے استقبال کی خوب تیاریاں کی گئی تھیں، شہر کو قیمتی اور بیش قیمت کپڑوں سے مزین کیا گیا تھا اور کئی دن تک فتح کی خوشی میں جلسے ہوتے رہے۔

مبارک شاہ نے ابتدائے عہد ہی سے خسرو پر خاص مہربانی شروع کر دی تھی، اس مہم سے واپسی پر ایک دن کئی شعرا موجود تھے اور یہ ذکر چلا کہ پہلے شاعروں کی بادشاہ کیسی قدر کرتے تھے اور ان کو کیا کیا انعام و اکرام عطا کرتے تھے، مبارک شاہ نے کہا کہ ہم پچھلے بادشاہوں سے کم نہیں ہیں اور روپیہ کی بھی ہمارے پاس کمی نہیں ہے، اگر کوئی شاعر ہمارے عہد کی داستان کو نظم کرے تو ہم اسے ہاتھی کے برابر تول کر سونا دیں گے، آخر یہ کام خسرو کے سپرد ہوا اور انہوں نے مشہور مثنوی "نہ سپہر" مرتب کی جو بعض لحاظ سے فارسی مثنویوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کے صلے میں خسرو کو ہاتھی کے وزن کا سونا ملا یا نہیں، یہ بہت مشتبہ بات ہے۔ اگرچہ محمد سعید مارہروی، مصنف حیات خسرو، اور شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ انہیں واقعی یہ گراں قدر صلہ ملا تھا۔ خسرو محض یہ کہتے ہیں کہ:

چنیں بخششی کز تو چم یافتم ز شاہان پیشینہ کم یافتم

جس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خاطر خواہ انعام ضرور ملا ہوگا، ان کی عمر اس وقت ساٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی، خیال ہوسکتا ہے کہ ان کا جوش شاعری اب تک سرد ہوگیا ہوگا لیکن مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے نے خسرو کی

طبیعت میں کوئی افسردگی پیدا نہیں کی، وہی کلام کی بےساختگی اور روانی، اسلوب کی دل‌کشی اور جدت، الفاظ کی مناسبت اور ترنم اس مثنوی میں بھی پایا جاتا ہے جو خسرو کے کلام کا خاصہ ہے، بلکہ ان کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان کے صندوق۔ استخوانی میں بہت سے تحفہ‌ہائے آسمانی ایسے تھے جو اُنھوں نے اس دن کے لیے بچا رکھے تھے، (۱)

دکن کی مہم کے بعد مبارک شاہ کو سوائے عیش و طرب میں وقت گزارنے کے اور کوئی کام نہ رہا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو وہ بہت سی بری عادتوں کا شکار بن گیا اور دوسری طرف مزاج میں رعونت اور تیزی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اپنے کو نہ صرف دنیاوی حاکم بلکہ مذہبی پیشوا بھی سمجھنے لگا اور "خلیفۃ رب‌العالمین" ہونے کا دعویٰ کرنے لگا، ایک سازش کی وجہ سے جو علاءالدین کے چچا زاد بھائی اسدالدین نے کی تھی، اپنے بھائیوں خضر خاں وغیرہ سے جو گوالیار کے قلعے میں قید تھے بدگمان ہوگیا اور ان سب کو قتل کروا دیا اور پھر حضرت نظام‌الدین سے عناد اور مخالفت پر کمر باندھی، جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ بدقسمت خضر خاں ان کا مرید رہا تھا، ان کی اہمیت اور رسوخ کم کرنے کے لیے شیخ جام اور ملتان کے شیخ رکن‌الدین کو دہلی بلوا کر رکھا اور شراب کے نشے میں کئی مرتبہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی حضرت نظام‌الدین کا سر کاٹ کر لا دے تو اسے ایک ہزار سونے کے تنکے انعام دوں۔

(۱) نہ سپہر: دریں صندوق خسرو کاستخوانیست
فراوان تحفہ‌ہائے آسمانیست

اس کے ساتھ ہی مذہب سے بالکل لاپروائی برتنے لگا اور دربار میں بھانڈوں اور بازاری عورتوں کا راج ہوگیا ' خود زنانے کپڑے پہن کر دربار میں چلا آتا تھا اور ہزار ستون کی چھت پر سے رنڈیاں اور ڈومنیاں بڑے بڑے ملکوں اور امیروں کو جن میں عین الملک ملتانی بھی شامل تھا فحش گالیاں سنایا کرتی تھیں ' توبہ قامی بھانڈ بعض مرتبہ دربار میں مادر زاد ننگا ہو کر آیا کرتا تھا اور بڑے بڑے درباریوں کے سامنے بہت ناشائستہ حرکتیں کیا کرتا تھا ' (۱)

خلیفہ ہونے کے دعوے کے ساتھ یہ نا زیبا حرکتیں ظاہر ہیں کہ حضرت نظام الدین کو پسند نہ آتی ہوں گی اور چونکہ وہ ان پر معترض ہوتے تھے اس لیے بادشاہ کا بغض اور بڑھتا گیا ' بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ اور مشائخ کی طرح وہ بھی اس کے دربار میں حاضری دیا کریں لیکن جب دربار کی یہ حالت تھی تو حضرت نظام الدین وہاں جانا کیسے پسند کر سکتے تھے ' بادشاہ نے بلایا تو انھوں نے انکار کیا ' نوبت یہاں تک پہنچی کہ جمادی الاول کے مہینے میں بادشاہ نے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ اس مہینے کے آخری دن تک نہ آئے تو غیاث پور کی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا ۔ اس دھمکی سے حضرت کے مریدوں میں بہت تشویش پیدا ہوئی اور انھوں نے انھیں سمجھا بجھا کر بادشاہ کے حکم کو مان لینے کی ترغیب دی ' لیکن حضرت نظام الدین برابر انکار کرتے رہے ' آخر وہ آخری دن بھی آ پہنچا لیکن اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی مبارک شاہ کی زندگی کا ایک دم خاتمہ ہوگیا ۔ اور خاتمہ بھی اس کے

---

(۱) برنی ص ۳۹۶ ۔ مقابلہ کیجیے فرشتہ ۔

چاہتے غلام خسرو خان کے ہاتھوں -

خسرو خان نے آہستہ آہستہ اپنے ہم قوم لوگوں کو اپنے گرد و پیش جمع کر لیا تھا اور موقع کا منتظر رہتا تھا جس دن یہ واقعہ ہوا اس روز رات کے وقت بادشاہ ہزار ستون کے ایک حصے میں خسرو خان کے ساتھ تخلیہ میں تھا ' اس کے ساتھیوں کو پہلے سے اشارہ ہو چکا تھا ' وہ ایک دم درانہ محل میں گھس آئے ' دربانوں کو قابو کر کے وہ اس حصے میں پہنچے جہاں بادشاہ اور خسرو خان تھے ' بادشاہ نے بھاگ کر حرم میں پناہ لینا چاہی مگر خسرو خان نے اسے اس کے بالوں سے جو لمبے لمبے تھے مضبوط پکڑ لیا اور بھاگنے نہ دیا یہاں تک کہ اس کے ساتھیوں نے آکر اس کا سر کاٹ لیا اور چھت پر سے نیچے پھینک دیا ' یہ خون آلود سر محل کے پاسبانوں کے درمیان جاکر گرا جو ابھی تک بےخبر تھے کہ محل میں کیا ہو رہا ہے - ان میں بھاگڑ مچ گئی اور خسرو خان کا بہت آسانی سے محل پر قبضہ ہوگیا ' اب اس نے دہلی میں جتنے بڑے بڑے امرا تھے سب کو پکڑوا بلایا اور مجبوراً انہیں خسرو خان کو بادشاہ تسلیم کرنا پڑا ' یہ زمانہ بہت پرآشوب تھا ' حرم شاہی کی بےحرمتی ' مذہب کی توہین ' امرا کی پکڑ دھکڑ ' قتل و غارت ' غرض کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو اس دو تین مہینے کے اندر دہلی کی سلطنت پر نہ نازل ہوئی ہو - مگر ظاہر ہے کہ خسرو خاں کی یہ کامیابی دیرپا نہ ہوسکتی تھی ' ملک تغلق جو اس وقت تجربہ کار شاہی سپہسالاروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھا مغلوں کی روک تھام کے لیے دیبال پور (قصور) کی حکومت پر متعین تھا - اس کا بیٹا جونا خاں ' جو بعد میں محمد تغلق کے نام

سے بادشاہ ہوا ' دہلی میں تھا اور دیگر امرا کی طرح حراست
میں لے لیا گیا تھا ' لیکن وہ موقع پاکر بھاگ نکلا اور دیپال پور
پہنچ کر اس نے سب کیفیت اپنے باپ کو سنائی - اپنے آقاؤں
کے قتل اور تذلیل کی داستان سن کر ملک تغلق کا خون کھولنے
لگا اور اس نے فوراً دہلی پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں '
اس کے ساتھ ہی اس نے سب بڑے بڑے صوبہ داروں کو خط بھیج
کر انھیں اس کام میں اس کی مدد کرنے کی دعوت دی '
جن میں سے بعض نے اس کی درخواست پر لبیک کہا لیکن
بعض ایسے بھی تھے کہ جو اپنے فرض منصبی کو بھول گئے اور
اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے خاموش رہے ' عین الملک ملتانی
دہلی میں تھا اس لیے اس کے لیے کھلم کھلا بغاوت ناممکن تھی لیکن
اس نے ملک تغلق کو اطمینان دلایا کہ اگر وہ دہلی پہنچا تو
وہ خسرو خان سے علاحدہ ہو کر اس کے ساتھ مل جائے گا '
ادھر خسرو خان نے جب ملک تغلق کے ارادوں کی خبر پائی
تو اس نے بےدھڑک خزانہ لٹانا شروع کیا تاکہ امرا کو اپنا ہمدرد
بنا لے اور یہی نہیں بلکہ دہلی کے مشائخ کو جن میں حضرت
نظام الدین بھی شامل تھے ' بڑی بڑی رقمیں دیں کہ وہ اس کی
کامیابی اور فتح کی دعا کریں '

ملک تغلق اپنی تیاری مکمل کر کے دہلی کی طرف بڑھا
اور جلد ہی شہر کے قریب آ پہنچا - اس سے پہلے خسرو خان
نے اپنے بھائی کو جسے اس نے خان خانان کا لقب دیا تھا '
ایک بڑی فوج کے ساتھ جس میں مسلمان اور ہندو دونوں تھے
آگے روانہ کیا تھا اور یہ فوج سرسوتی تک پہنچ گئی تھی لیکن
ملک تغلق نے دریائے بہت (بیاس ؟) کے کنارے پر اس لشکر

کو شکست فاش دے کر پراگندہ کر دیا تھا ' اب جب تغلق کی فوج دھلی سے کچھ فاصلے پر رہ گئی تو وہ خود مقابلے کے لیے نکلا ' تغلق اس وقت حوض سلطانی کے پاس لہراوت میں خیمہ‌زن تھا ' ۳۰ رجب ۷۲۱ھ کو دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی ' بہت سخت معرکہ ہوا اور قریب تھا کہ تغلق کی فوج کو شکست ہو جائے لیکن ملک تغلق کی بہادری نے لڑائی کا رنگ بدل دیا - اور خسرو خاں ' اس کے بھائی اور ایک دو مسلمان سرداروں کے زبردست مقابلے کے باوجود ' دھلی کی فوج میں بھاگڑ مچ گئی ' بہت کشت و خون ہوا ' اور خسرو خاں اور اس کا بھائی بھی جان بچا کر بھاگ نکلے ' لیکن دوسرے دن دونوں گرفتار ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچے ' اسی ہزار ستون کی چھت پر سے جہاں سے دو مہینے پیشتر بدنصیب مبارک شاہ کا خون آلود سر نیچے گرا تھا اب اس کے بےرحم قاتل کا سر نیچے لڑھک رہا تھا -

یکم شعبان سنہ ۷۲۱ھ کو تغلق دھلی میں داخل ہوا اور چونکہ علاءالدین خلجی کی اولاد میں سے اب کوئی وارث تخت و تاج کا نہ رہا تھا اس لیے سب ملوک اور امرا نے متفقہ طور پر اس سے درخواست کی کہ وہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے اور بہت کچھ تامل کے بعد اس نے یہ منظور کر لیا - اس طرح ہندوستان کا تخت و تاج اب خلجیوں کے ہاتھ سے نکل کر تغلق خاندان کے پاس آگیا اور تغلق شاہ غیاث‌الدین کے لقب کے ساتھ اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہوا - تغلق منکسر مزاج اور خوش خلق آدمی تھا ' مذہب کا پکا تھا اور شعائر اسلامی کا بہت پاس کرتا تھا ' اس کے بادشاہ ہونے سے ملک میں عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا گیا . اور چونکہ اس نے علائی

خاندان کا انتقام لیا تھا اس لیے لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی تھی، چنانچہ خسرو نے بھی نئے بادشاہ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ایک مرثیے میں جو اُنھوں نے مبارک شاہ کے قتل اور تغلق کی تخت نشینی کے بعد کہا تھا تغلق شاہ کی یوں تعریف کرتے ہیں :-

" بادشاہ غیاث الدین ابو مسلم ثانی ہے جس نے اپنی تلوار کے وار سے ثانی حیدر کے خون کا انتقام لیا ہے، یہ وہ حامی اسلام تغلق شاہ ہے کہ ستاروں نے سالہا سال کی گردش کے بعد ایسا دین پرور بادشاہ پیدا کیا ہے " - (۱)

تغلق شاہ بھی بظاہر اُن کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا اور وہ اس کے عہد میں بھی اپنے منصب پر فایز رہے - لیکن برخلاف اس کے بادشاہ حضرت نظام الدین کی طرف سے بدگمان رہا جس کے دو سبب تھے - ایک یہ کہ خسرو خاں نے جو بڑی بڑی رقمیں امرا اور مشائخ کو دی تھیں تغلق شاہ نے بادشاہ ہونے پر وہ واپس طلب کیں کیونکہ خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا اور بغیر روپے کے حکومت کا انتظام محال تھا، ان میں سے بعض رقمیں اسے واپس بھی مل گئیں، لیکن حضرت نظام الدین کو جو کچھ ملا تھا وہ اپنے لنگر خانے اور مستحق لوگوں کی امداد میں صرف کر چکے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ تغلق شاہ کے حکم کی تعمیل سے قاصر تھے، اور اس سے بادشاہ کو ان کی طرف سے سوء ظن پیدا ہوا - دوسرا سبب یہ ہوا کہ دہلی کے بعض اور مشائخ نے جو یقیناً

---

(۱) حامی اسلام تغلق شاہ کہ انجم سالہا
چرخ می‌زد تا فلک زین‌گونہ دین‌پرور کشید

اُن سے رقابت اور رشک رکھتے تھے بادشاہ کا میلان مذہب کی طرف دیکھ کر حضرت نظام‌الدین کی شکایتیں شروع کر دیں کہ وہ سماع کو جائز سمجھتے ہیں اور ان کی خانقاہ میں گانا بجانا ہوتا رہتا ہے، بادشاہ نے حضرت نظام‌الدین کو دربار میں بلا بھیجا اور دوسرے مشائخ کے سامنے ان سے اُن کے عقائد کے متعلق بہت سے سوال کئے جن کے اُنہوں نے بہت معقول جواب دیے اور اس کے بعد بادشاہ کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان سے مزید تعرض کرتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری تشفی نہیں ہوئی اور وہ آخر تک حضرت نظام‌الدین سے منحرف ہی رہا۔

سنہ ۷۲۳ھ میں تغلق شاہ نے اپنے بڑے بیٹے جونا خان کو جسے اس نے چتر اور اولوغ خان کا خطاب دے کر اپنا جانشین مقرر کیا تھا دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ اور وہ پہلے دیوگیر اور پھر وہاں سے وارنگل کی طرف روانہ ہوا، اور دیو کی سر زمین مقصود تھی اس لیے کہ اس نے خراج کی رقم ادا کرنے میں لیت و لعل سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن جونا خان کو ناکام واپس آنا پڑا اس لیے کہ بعض مفسدہ پردازوں نے جن میں ایک شاعر عبید بھی شامل تھا، شاہی لشکر میں یہ افواہ مشہور کر دی کہ تغلق شاہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس خبر کے سننے سے سپاہیوں میں بد دلی پھیل گئی اور مجبوراً اسے دہلی کا رخ کرنا پڑا، دہلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ افواہ بالکل بے بنیاد تھی، اس کے پھیلانے والوں کو سخت سزا دی گئی، ان ہی میں عبید کو بھی قتل کا حکم ہوا۔ یہ شاعر ایرانی النسل تھا اور ایران سے ہندوستان آیا تھا، خسرو سے اُسے خاص پرخاش تھی اور اسی وجہ سے حضرت نظام‌الدین سے بھی معاندت رکھتا تھا،

تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق اسے زندہ در گور کر دیا گیا لیکن برنی نے لکھا ہے کہ اسے سولی پر چڑھایا گیا اور یہ روایت اس حکایت سے بھی مطابقت رکھتی ہے جسے مصنف تاریخ مبارک شاہی نے بیان کیا ہے، بدایونی نے بیان کیا ہے کہ اُسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندا گیا، بہرحال اسے اس بغض للہی کی جو اسے خسرو اور نظام الدین اولیا سے تھا، عبرتناک سزا ملی ۔ (۱)

کچھ عرصے بعد جونا خان پھر دکن کی طرف روانہ ہوا اور اس مرتبہ وارنگل کے راجہ کی سرکوبی کے بعد بہت کچھ مال و دولت ساتھ لے کر واپس آیا، اب تغلق شاہ نے تعمیر کی طرف جس کا اسے خاص شوق تھا، توجہ کی اور تغلق آباد کا قلعہ تعمیر کیا جو دہلی کی عمارتوں میں بعض لحاظ سے نمایاں خصوصیات رکھتا ہے - ابن بطوطہ کے بیان سے جو محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور خسرو کے ایک قصیدے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کے اندر جو رہائشی محل تھا اس کی دیواریں سنہری تھیں اور بیچ میں ایک حوض تھا، جب دیواروں پر سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی تھی اور اس محل کی زینت و آرایش کا باقی سب سامان بھی اسی مناسبت سے تھا، آج جب ہم تغلق آباد کے شکستہ دمدموں اور منہدم دیواروں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ذہن میں بھی نہیں آسکتی کہ کسی زمانے میں یہ قلعہ اور محل ایسا شاندار اور با رونق ہوگا، زمانے کی گردش نے جہاں بڑی بڑی

(۱) دیکھیے فرشتہ ج ۱ ص ۱۳۱، برنی ص ۴۴۹، بدایونی ج ۱ ص ۲۲۲ و مابعد و تاریخ مبارک شاہی -

سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیے وہاں ان سنگین عمارتوں کے سنگ و خشت کو بھی جابجا چلتے وقت ان کے معماروں کو یہ خیال ہوگا کہ وہ ابدالآباد تک قائم رہیں گی اُکھاڑ پھینکا۔ اور جہاں کسی زمانے میں خسرو اور حسن جیسے شیریں مقال شاعروں کی آواز سے جگمگاتی ہوئی محفلیں گونج اُٹھتی تھیں وہاں اب رات کے اندھیرے اور سناٹے میں بوم و شغال کی آوازوں کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا !

سنہ ۷۲۴ھ میں غیاث الدین تغلق ترہت اور سنار گاؤں کی مہم پر روانہ ہوا ، اپنے بیٹے جونا خاں کو دہلی میں اپنا نایب بناتا گیا اور امیر خسرو کو اپنے ساتھ لیا ، بادشاہ کا یہ آخری سفر تھا ، اس کے بعد اسے دہلی آنا نصیب نہیں ہوا - کہا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین سے جو مخالفت اسے تھی وہ اب کچھ اور بڑھ گئی تھی اور اس نے سفر پر جانے سے پہلے انہیں یہ فہمائش کر دی تھی کہ وہ اس کی دہلی واپسی سے پہلے دارالسلطنت سے کہیں دور چلے جائیں ، ورنہ ان کے لیے اچھا نہ ہوگا ، چنانچہ جب تغلق مہم پر سے واپس ہوا اور دہلی کے قریب پہنچا تو حضرت نظام الدین کے معتقدین نے ان سے کہا کہ اب آپ دہلی سے چلے جائیں کیونکہ بادشاہ اب شہر سے قریب آتا جاتا ہے - حضرت نظام الدین نے اس کا صرف یہ جواب دیا کہ : " ہنوز دہلی دور است " اور اپنی خانقاہ میں اطمینان سے حسب دستور اپنے مشاغل میں مصروف رہے ، اب دیکھیے کہ پردۂ قدرت سے کیا ظہور میں آتا ہے ، جب جونا خاں نے بادشاہ کی واپسی کی خبر سنی اور اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ جریدہ یلغار کرتا ہوا ایسی تیزی سے آ رہا ہے کہ دہلی پہنچتے تک شہر

جہاں اس کے استقبال کے لیے موزوں و مناسب انتظامات نہ
ہوسکیں گے، تو اس نے یہ کیا کہ بادشاہ کے استقبال کے لیے
دہلی سے کچھ دور نکل گیا اور افغان پور میں ایک عمارت عارضی
قیام کے لیے ماڑا ماڑ تیار کرا دی، تاکہ بادشاہ دو ایک روز
وہاں توقف کرے اور اتنے عرصے میں دہلی کے انتظامات مکمل
ہو جائیں، بادشاہ نے وہاں پہنچ کر اس عمارت میں قیام کیا
اور کھانا چنا گیا، کھانا ختم ہوا تو شہزادہ جونا خاں مع
چند امرا اور ملوک کے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا تاکہ ان ہاتھیوں
کو جو وہ تلنگ سے لایا تھا بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار
کرے، عمارت کے اندر تغلق شاہ اور اس کے خاص خاص آدمی
رہ گئے، اتنے میں ایک دم عمارت کی چھت آن پڑی اور قبل
اس کے، کہ بادشاہ کو ملبے کے نیچے سے نکالا جاسکے وہ راہی
ملک عدم ہو چکا تھا، یہ حالات اور واقعات ایسے ہیں کہ
جن کی وجہ سے جونا خاں پر شبہہ کیا جاسکتا ہے، اسی لیے
ابن بطوطہ اور بعض مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ
جونا خاں نے قصداً ایسی عمارت تعمیر کی تھی اور اس کا
باپ کے پاس سے بہانہ کر کے اٹھ جانا اس کی بدنیتی کا
مزید ثبوت ہے، لیکن میرے خیال میں یہ محض سوء ظن
ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا، برنی نے اس قسم کا
گمان اشارتاً بھی ظاہر نہیں کیا اور یوں بھی یہ بات مشکل سے
سمجھ میں آسکتی ہے کہ عمارت کو ایسی ترکیب سے بنایا گیا
ہو کہ ایک وقت معینہ پر اس کی چھت گر جائے یعنی اس
وقت جب جونا خاں باہر چلا جائے اور بادشاہ اندر موجود
ہو، اس واقعے کو محض اتفاق سے تعبیر کرنا زیادہ قرین عقل

و

ہے یا پھر اگر حضرت نظام الدین والی روایت کو صحیح مانا جائے تو خوش عقیدہ لوگ اسے ان کی کرامات سمجھ سکتے ہیں ' (۱) -

بہر حال بادشاہ کو یوں جان سے جانا تھا سو گیا اور اب اس کا بیٹا جونا خان ناصرالدین محمد تغلق کے لقب سے تخت دہلی کا مالک ہوا - یہ حادثہ ماہ ربیع الاول میں ہوا -

اس واقعے سے پہلے ہی حضرت نظام الدین اولیا ' جن کی عمر اب پچانوے سال کی ہو چکی تھی علالت کی وجہ سے صاحب فراش ہوگئے تھے اور آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب آپ کا طائر روح بھی جسد خاکی سے پرواز کر کے اس عالم بالا میں پہنچ گیا جس کا پرتو یقیناً ان کی دنیاوی زندگی میں ان کے لیے مشعل ہدایت رہا تھا ' مرنے سے پہلے آپ نے اپنے خادم خاص اقبال کو بلایا اور اس سے کہا کہ خانقاہ میں جو بھی اناج یا روپیہ ہے سب غربا اور فقرا میں تقسیم کر دیا جائے اور ایک دانہ اناج کا یا ایک پیسہ بھی باقی نہ رکھا جائے ' اس کے بعد اپنے خاص خاص مریدوں کو جمع کر کے انہیں وصیت کی اور انہیں مختلف جگہوں کے لیے اپنا نائب اور وارث نامزد کیا ' اپنی چادر ' عصا ' سجادہ اور کشکول وغیرہ حضرت نصیرالدین روشن چراغ دہلی کو عطا کر کے انہیں دہلی میں اپنا جانشین مقرر کیا اور ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئے - آپ کی تمام عمر زہد و عبادت میں اور برائی اور گناہ کے خلاف ' جنگ میں گزری اور آپ نے زمانے کے بہت

(۱) اس واقعے کے لیے دیکھیے : بدایونی ج ۱ ص ۲۲۵ ' ابن بطوطہ ج ۳ ص ۲۱۱ و ما بعد ' فرشتہ : ج ۲ ص ۳۹۸ وغیرہ -

سے انقلاب دیکھے ' ایک بادشاہ کے بعد دوسرا تخت نشین ہوا '
ایک خاندان کا دور ختم ہوا اور دوسرے خاندان کا چراغ روشن
ہوا ' جلسے اور لڑائیاں ' فتنے فساد سب کچھ ہی ہوئے اور
آپ کا قدم کبھی راہ راست سے نہ ڈگمگایا ' بعض کوتاہ اندیش
مورخین نے آپ کا اس زمانے کے بعض ناگوار واقعات سے تعلق
ثابت کرنے کی سعی غیر مشکور ضرور کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے
کہ کوئی قابل اعتماد تاریخی روایت ایسی نہیں ہے جس کی
رو سے آپ کے نیک نام پر کوئی دھبا آسکے یا آپ کے کردار اور
اطوار پر حرف‌گیری کا موقع مل سکے اور اگر شہرت جاوید
اور عقیدت عام سے کسی فرد کی بزرگی اور تقدس کا اندازہ لگایا
جاسکتا ہے تو بلا خوف تردید یہ کہ سکتے ہیں کہ حضرت نظام‌الدین
دنیا کے اولیا میں ایک بہت ہی ممتاز رتبہ رکھتے تھے ' حششیین
کے کسی داعی ' ٹھگوں کے کسی سرغنہ یا ایک ریاکار سیاسی
سازشی کے لیے یہ تو ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے
لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنی اصل شخصیت کو
ظاہری زہد اور تقوی کے پردے میں چھپا سکے لیکن زیادہ عرصے
تک کوئی اس ڈھونگ کو نہیں نباہ سکتا ' زمانے کی آواز سب سے
بڑی آواز ہے اور وقت کا فیصلہ سب سے اہم فیصلہ ' حضرت نظام‌الدین
کی اس قسم کے لغو اور رکیک‌الزاموں سے براءت کی اس سے
بڑھ کر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے کہ ان کے انتقال کے سات سو
سال سے زائد عرصے کے بعد آج بھی ان کی قبر زیارت‌گاہ خلق
ہے اور ہر ملت و مذہب کے آدمی پروانہ‌وار ان کی درگاہ
کی طرف چلے آتے ہیں ' ان کے ہم‌عصر بادشاہوں کی
شان و شوکت خواب و خیال ہوگئی ' ان کی سربفلک عمارتیں

کھنڈر بن گئیں ' ان میں سے بعض مزار بھی معلوم نہیں کہاں چلے اور کہاں غائب ہوگئے لیکن حضرت نظام الدین اور ان کے منظور نظر شاگرد امیر خسرو کے مزار پر اب بھی وہی رونق وہی چہل پہل اور عقیدت مندوں کا وہی ہجوم اور وہی کثرت ہے ' جو اب سے کئی سو سال پہلے تھی اور سبز چادروں پر پھولوں کی رنگین پتیاں اور اگر کے دھوئیں کی پھیلی خوشبو اب بھی اسی طرح جنت نگاہ اور فردوس مشام ہے جیسے ان کے انتقال کے چند روز بعد ہوگی -

خسرو جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ' شاہی لشکر کے ساتھ ترہت کی مہم پر گئے تھے ' اس لیے وہ حضرت نظام الدین اولیا کے انتقال کے وقت دہلی میں موجود نہ تھے ' جب دہلی میں آئے تو یہ اندوہناک خبر سن کر رنج اور غم سے وارفتہ ہوگئے ' کپڑے پھاڑ ڈالے اور منہ پر کالک مل کر ان کی قبر کی زیارت کو پہنچے ' وہاں آپ نے یہ دوہا پڑھا اور بے ہوش ہو کر گر گئے :

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھی سب دیس

اپنے مہربان پیر و مرشد کے انتقال کے بعد خسرو زیادہ عرصے زندہ نہ رہے ' طبیعت افسردہ اور ملول ہو چکی تھی اور اگرچہ محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد ایک آدھ قصیدہ اس کی تعریف میں کہا ' شاعری سے بھی اب ان کا دل سرد ہو چکا تھا - انھوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب میں زیادہ زندہ نہ رہوں گا ' چنانچہ وہی ہوا کہ ۱۸ شوال کو وہ بھی اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے -

حضرت نظام الدین نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے

پہلو میں دفن کرنا کیونکہ وہ میرا محرم اسرار ہے' چنانچہ خسرو کے انتقال پر لوگوں نے اس وصیت کے مطابق ان کی قبر حضرت نظام الدین کی قبر کے برابر بنانا چاہی لیکن ایک خواجہ سرا نے جو غالباً سلطان محمد تغلق کی طرف سے درگاہ کا متولی تھا اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس طرح ان کی اور خسرو کی قبر میں لوگوں کو مغالطہ ہوگا' اس لیے خسرو کو حضرت نظام الدین کی قبر کی پائینتی دفن کیا گیا' اور وہیں وہ اب محو خواب ہیں اور رہیں گے جب تک کہ صور قیامت کی آواز پر زمین اپنے دفینوں کو ظاہر نہ کر دے' اس دن وہ اور ان کے محترم استاد واقعی ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں گے اور جنت میں داخل ہوں گے' یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ ان دونوں کے نام ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں' جو قرب اور خصوصیت خسرو کو اپنی زندگی میں حضرت نظام الدین سے تھی وہی مرنے کے بعد بھی باقی ہے اور اب بھی عقیدت مند زائر اپنے دل کی مراد خسرو ہی کے توسط سے نظام الدین اولیا کے حضور میں پیش کرتا ہے اور ان کے مزار پر جانے سے پہلے عقیدت مندی اور ارادت کے پھول خسرو کے مزار پر ضرور چڑھاتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے زمانے سے پہلے خسرو کے مزار پر کوئی پختہ عمارت نہیں بنی' یا اگر بنی تھی تو اس زمانے تک مسمار ہو چکی تھی اس لیے کہ باہر کی چار دیواری اور لوح' بابر ہی کے عہد میں ایک امیر مہدی خواجہ کی زیرنگرانی تیار ہوئی تھی اور لوح پر جو کتبہ ہے اسی عہد کے ایک شاعر شہاب معمائی کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ ہے۔ اس کتبے

کی رو سے خسرو کا انتقال سنہ ۷۲۵ھ میں ہوا - اور اس کی تصدیق اور بیانات سے بھی ہوتی ہے ' لیکن تاریخ اور مہینے میں اختلافات ہے ' یعنی فرشتہ نے تاریخ وفات سے ۲۹ ذوالقعدہ سنہ ۷۲۵ھ ہجری لکھی ہے ' لیکن سفینۃ الاولیا میں تاریخ ۱۸ شوال دی گئی ہے اور غالباً یہ روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ خسرو کا عرس اسی تاریخ کو منایا جاتا ہے - '

مولوی ظفر حسن صاحب نے اپنی کتاب " A guide to Nizamuddin " میں خسرو کے مزار کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ حسب ذیل ہے -

امیر خسرو کا مزار ایک چھوٹے سے رقبہ میں جس کا طول اور عرض ۲۸ فٹ ۲ انچ اور ۲۰ فٹ ۷ انچ ہے واقع ہے ' اس کے چاروں طرف ایک سرخ پتھر کی جالی دار دیوار کھنچی ہوئی ہے ' اس احاطے کا فرش سنگ مرمر کا ہے اور اندر داخل ہونے کے لیے جنوب کی سمت ایک دروازہ ہے اور اس طرف کچھ حصے پر پتھر کی سلوں سے چھت بھی بنا دی گئی ہے ' روضہ شکل میں مستطیل ہے اور اس کا طول اور عرض ۱۲ فٹ ۲ انچ اور ۱۲ فٹ ۲ انچ ہے - یہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اس پر ایک گنبد دار چھت ہے جو بارہ ستونوں پر قائم ہے اور شمال اور جنوب کے رخ اس پر گلدستے بنے ہوئے ہیں - ستونوں کے بیچ بیچ میں جالی کے پردے لگے ہوئے ہیں ' صرف جنوب کی سمت بیچ کا در کھلا ہے جس میں سے مزار تک جا سکتے ہیں - روضے کے باہر شمال کی طرف ایک سنگ مرمر کی لوح رکھی ہوئی ہے جس پر کتبہ ہے ' یہ لوح ۷ فٹ ۱۱ انچ سے ۱ فٹ ساڑھے چھ انچ ہے اور بابر کے زمانے میں

نصب کی گئی تھی - جنوب کی طرف ایک قبر بغیر کسی کتبہ کے ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ خسرو کے ایک بھانجے ماہرو نامی کی ہے ' خسرو کی قبر سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور اس کے گرد سنگ مرمر ہی کا کٹہرا ہے - قبر ہمیشہ چادر سے ڈھنپی رہتی ہے اور اس کے اوپر ایک سوتی شامیانہ یا چھت گیری لگی رہتی ہے جس کے کونے روضہ کے چاروں کونوں سے بندھے ہوئے ہیں " -

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۹۳۸ھ یعنی سنہ ۱۵۳۱ عیسوی میں ہمایوں کے عہد میں باہر کی چار دیواری کے اندر ایک اور چار دیواری بنائی گئی اور اس کا فرش سنگ مرمر کا بنایا گیا ' قبر پر سنگ مرمر کا تعویذ بھی اسی زمانے میں رکھا گیا ' اس کے بعد سنہ ۹۹۹ھ یا سنہ ۱۵۹۱ع میں اکبر کے زمانے کے ایک امیر شہاب الدین احمد خان نے سرخ پتھر کی جالی دار دیواروں کے اوپر ایک قبہ بنوایا ' اس کے بعد جہانگیر کے عہد میں خواجہ عماد الدین حسن کی سعی سے نیا قبہ اور ستون تعمیر ہوئے اور اس امیر اور بادشاہ جہانگیر کے کتبے دیواروں کے اوپر کے سروں پر موجود ہیں - ان میں سے دو کتبے خسرو کے اپنے کلام میں سے ہیں - ایک میں تین شعر خواجہ نظام الدین کی تعریف میں حسب ذیل ہیں :-

اے شربت عاشقی بجامت   وز یار زمان زمان پیامت
شد سالک فرید از تو مفطوم   زانست کہ شد لقب نظامت
جاوید بقاست بندہ خسرو   چون شد بہزار جان غلامت

دوسرے کتبے میں دو شعر ہیں جن میں خسرو کا نام معمے کے طریقے پر بیان کیا گیا ہے ؛ یعنی :-

مرا نام نیکو ست و خواجہ عظام
دو شین و دو لام و دو قاف و دو جیم

اگر نام یابی تو زین حرفہا
بدانم کہ ہستی تو مرد فہیم

سنہ ۱۲۸۰ھ یا سنہ ۱۶۶۳ع میں ایک شخص مہاں جانہ نامی نے مقبرے کے لیے ایک جوڑی تانبے کے کواڑوں کی نذر کی اور پھر سنہ ۱۸۸۶ع میں حیدرآباد کے محی الدین خان نے قبر کے گرداگرد ایک جالی‌دار کٹہرا سنگ مرمر کا لگوایا - گویا مزار کے مختلف حصے مختلف زمانوں کی یادگار ہیں - مولوی ظفرالحسن صاحب کے بیان کو ان تاریخی معلومات سے ملانے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ لوح مزار تو بابر کے زمانے کی ہے، قبر کا تعویذ اور اس کے گرد کا سنگ مرمر کا فرش ہمایوں کے عہد کا ہے، باہر کی سرخ پتھر کی جالی دار دیواریں اسی بادشاہ یا اکبر کے عہد کی یادگار ہیں، قبر کے اوپر کا قبہ اور ستون وغیرہ جہانگیر کے دور میں بنائے گئے - اور قبر کے گرد کا کٹہرا بہت حال کے زمانے میں یعنی سنہ ۱۸۸۰ع میں بنا -

خسرو نے مرتے وقت دنیا میں کتنے ورثہ اور لواحقین چھوڑے اس کی صحیح تفصیل ہمیں معلوم نہیں - ان کی اولاد ضرور تھی دو لڑکے تو ان کے سامنے ہی انتقال کر گئے تھے، (۱) اور ان کا مرثیہ اُنھوں نے لکھا ہے، ان کے ایک بیٹے ان کے بعد زندہ رہے اور کچھ شعر شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے، لیکن اس فن میں

(۱) اُن کے نام حاجی اور مسعود تھے -

اُنہوں نے کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی" (۱) ان کی ایک بیٹی بھی تھی جسے اُنہوں نے اپنی مثنوی "ہشت بہشت" میں بہت سی نصیحتیں کی ہیں اور جو ممکن ہے ان کے بعد زندہ رہی ہو - والدہ اور چھوٹے بھائی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا - بڑے بھائی عزالدین علی شاہ غالباً ان کے بعد فوت ہوئے - خسرو کی رفیقۂ حیات کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں آتا - پرانے زمانے کے دستور اور قاعدے کی رو سے بیویوں کا ذکر معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے خسرو سے تو یہ توقع ہی نہ تھی کہ وہ اس کے متعلق کچھ لکھتے لیکن تعجب یہ ہے کہ برنی یا کسی اور مورخ اور تذکرہ نویس نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ان کی شادی کہاں ہوئی تھی اور ان کی بیوی اُن کے انتقال کے وقت حیات تھیں یا نہیں - لیکن اگر ہمیں خسرو کی اولاد ظاہری اور لواحقین کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں تو ان کی اولاد معنوی یعنی اُن کے کلام اور تصانیف کے متعلق خوش قسمتی سے ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور اب انہی کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا -

---

(۱) دیکھیے دیوان خسرو : ص ۱۶-۱۷ (بحوالہ بدایونی) - ان کا نام ملک احمد تھا -

حصۂ دوم

(تصنیفات)

—:o:—

نواں باب

خسرو کی تصانیف کی تعداد اور بعض ان تصنیفوں کا ذکر جو غلطی سے ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں -

خسرو کی تصانیف کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے اس لیے کہ اس کے متعلق مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف بیان دیے ہیں - ان کا ہم عصر مورخ برنی تو صرف یہ کہتا ہے کہ ان کی تصانیف اتنی تھیں کہ ان سے ایک کتاب خانہ بن سکتا تھا ' (۱) یہی مصنف سیرالاولیا نے بھی لکھا ہے ' (۲) جامی کا بیان ہے کہ ان کی تصانیف کی تعداد ننانوے (۹۹) تھی اور اسی بیان کو بعض اور تذکرہ نویسوں نے بھی نقل کیا ہے - (۳) امین رازی نے اس تعداد میں اور اضافہ کر کے مجموعی تعداد ایک سو ننانوے (۱۹۹) لکھی ہے ' چنانچہ انہی بیانات کو پیش نظر رکھ کر نواب اسحق خاں صاحب مرحوم نے مولوی سید حسن بلگرامی عمادالملک کے مشورے سے سنہ ۱۹۱۵ع میں خسرو کی تصانیف کی تلاش شروع کی - خیال یہ تھا کہ خسرو کی جس قدر بھی

---

(۱) تاریخ فیروز شاہی (۲) سیر الاولیا ص ۳۰۱-۳۰۵

(۳) مثلاً دیکھیے: نفحات الانس ص ۷۱۰ - گلزار ابراہیم ' آتش کدہ ' اسپرنگر وغیرہ -

تصانیف دستیاب ہوسکیں انہیں جمع کر کے مناسب تصحیح اور ترتیب کے ساتھ شائع کیا جائے ۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نواب مرحوم نے یورپ ، ترکی ، مصر اور ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرستوں کا مطالعہ کیا اور ہندوستان بھر میں اشتہارات کے ذریعے سے خسرو کی تصانیف کا کھوج نکالنے کی کوشش شروع کردی ، لیکن بہت جد و جہد اور کاوش و تلاش کے بعد انہیں صرف مندرجۂ ذیل کتابوں کے نام معلوم ہوسکے :—

(۱) تحفۃ الصغر ، (۲) وسط الحیواۃ (۳) دیباچۂ غرۃ الکمال
(۴) دیوان غرۃالکمال (۵) بقیۂ نقیہ (۶) مطلع الانوار
(۷) شیرین و خسرو (۸) مجنون و لیلی (۹) ہشت بہشت
(۱۰) آئینۂ اسکندری (۱۱) قران السعدین (۱۲) خضرخانی یا عشقیہ (عشقیہ)
(۱۳) نہ سپہر (۱۴) مفتاح الفتوح
(۱۵) مجموعۂ مثنویات (۱۶) مجموعۂ رباعیات (۱۷) کلیات
(۱۸) قصیدۂ امیر خسرو مشتمل بر داستان شاہ نامہ
(۱۹) اعجاز خسروی (۲۰) انشاے خسرو (۲۱) احوال امیر خسرو
(۲۲) نہایۃ الکمال (۲۳) خزائن الفتوح (۲۴) نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث
(۲۵) افضل الفوائد (۲۶) خالق باری
(۲۷) قصۂ چہار درویش فارسی (۲۸) باز نامہ
(۲۹) فرس نامہ یا اسپ نامہ (۳۰) بحرالعبر
(۳۱) مرآت الصفا (۳۲) شہر آشوب یا مجموعۂ رباعیات
(۳۳) تغلق نامہ (۳۴) تاج الفتوح (۳۵) تاریخ دہلی
(۳۶) مناقب ہند (۳۷) حالات کنھیا و کرشن
(۳۸) مکتوبات امیر خسرو (۳۹) جواہر البحر

(۴۰) مقالہ (تاریخ الخلفاء) (۴۱) راحۃ المحبین (۴۲) رسالۂ ابیات بحث: خسرو و جامی (۴۳) شگرف بیان (۴۴) ترانۂ ہندی (۴۵) مناجات خسرو ۔

ان کتابوں کی فہرست دینے کے بعد نواب مرحوم لکھتے ہیں کہ "باز نامہ، اسپ نامہ، بحر الابرار، مرآت الصفا، جن کے نام اس فہرست میں درج ہیں (مستقل تصانیف نہیں ہیں بلکہ) خسرو کی بعض تصانیف کا جزو ہیں ۔ شہر آشوب کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ میں مل گیا، تغلق نامے کے متعلق اس سے زیادہ اب تک کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ میر مہدی مجروح کے پاس اس کا ایک نسخہ تھا، باقی تصانیف (یعنی نمبر ۲۸ سے لے کر نمبر ۴۵ تک میں سے باقی) کی بابت ہمیں ابھی تک یہ بھی پتہ نہ لگ سکا کہ وہ کبھی ہندوستان میں موجود تھیں ۔"

اس طرح گویا ۴۵ میں سے ۱۶ تصانیف تو بالکل نکل جاتی ہیں، باقی رہیں ۲۹، ان میں سے بھی نمبر ۳ اور ۴ دراصل ایک ہی چیز ہیں ۔ نمبر ۱۵، ۱۶، اور ۱۷، یقیناً امیر خسرو کے کلام کے انتخابات ہیں اور علحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، نمبر ۱۸، ۲۰، اور ۲۷، خسرو کی تصانیف ہرگز نہیں ہیں اور نمبر ۲۶ کا بھی ان کی تصنیف ہونا بہت مشتبہ ہے ۔ اس طرح صرف اکیس تصانیف ایسی رہ جاتی ہیں جو یقین کے ساتھ خسرو کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں اور یہ سب کی سب اس وقت موجود ہیں، برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ان ۲۱ میں سے صرف تین یعنی نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث، شہر آشوب اور تغلق نامہ نہیں ہیں ۔ باقی سب موجود ہیں اور اسی طرح انڈیا آفس کے کتب خانے میں بھی زیادہ تر

موجود ہیں - اس فہرست کو مرتب کرنے کے بعد نواب اسحٰق خاں صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خسرو کی زیادہ تر تصانیف تلف ہو چکی ہیں ' (۱) کیونکہ اگر ۹۹ کی تعداد کو صحیح مانا جائے تو گویا آدھے سے بھی کم عدد رہ جاتے ہیں - لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ نتیجہ قرین قیاس نہیں اس لئے کہ :-

۱ - یہ صحیح ہے کہ خسرو بہت لکھنے والے تھے ' ان کے منہ سے اشعار اتنی جلدی نکلتے تھے کہ قلم اُن کا ساتھ نہ دے سکتی تھی ' یہ بھی مسلم ہے کہ اُنھوں نے بہت چھوٹی عمر سے مشق سخن شروع کردی تھی اور کم از کم سولہ سال کے سن سے ان کا کلام اس پایے کا ہوگیا تھا کہ وہ اُسے جمع کرنے کے قابل سمجھیں ' لیکن خسرو کی جو تصانیف اس وقت موجود ہیں وہ بھی اتنی ہیں کہ یہ خیال مشکل سے ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اس کے علاوہ بہت کچھ لکھا ہوگا - اور اس لئے اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی آخری عمر تک برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے تو بھی یہ سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ان کا آدھے سے زیادہ کلام تلف ہوگیا اور ہمارے پاس اس کا بہت تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے - خسرو نے اپنے مجموعی کلام کا کہیں کوئی اندازہ نہیں لکھا اگرچہ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ خسرو اپنے اشعار کی مجموعی تعداد چار لاکھ بہت سے زائد اور پانچ لاکھ سے کچھ کم بتاتے ہیں - (۲) لیکن میری نظر سے اُن کی کسی تصنیف میں یہ بیان نہیں گزرا اور اگر بالفرض خسرو نے ایسا کہا بھی ہے تو

(۱) Prolegomena از نواب اسحٰق خاں -

(۲) دولت شاہ : ص ۲۴۰ نیز دیکھیے مجالس العشاق ص ۱۳۰-۱۳۲ -

بقول شبلی بیت سے مراد مصراع بھی ہوسکتی ہے اور اس طرح خسرو کے کلام کی وسعت و کثرت کچھ زیادہ نہیں رہ جاتی، علاوہ ازیں اس بیان میں ان کی نثر کی تصانیف کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ خسرو نے اگر یہ لکھا تو کس زمانے میں لکھا - سوائے اس کے کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ یہ اُن کے مرتے دم کے الفاظ تھے - اس بیان سے کوئی نتیجہ اُن کی تصانیف کے متعلق نہیں نکالا جاسکتا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنے انتقال تک برابر شعر کہتے رہے اس لیے اُن کے کلام کی ضخامت کا صحیح اندازہ ان کے انتقال کے بعد ہی ہوسکتا تھا -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان کے انتقال کے کچھ عرصے بعد کوئی منظم کوشش ان کے کلام کو جمع کرنے کی کی گئی یا نہیں؟ جہاں تک ہمیں تاریخ سے پتہ چلتا ہے خسرو کے انتقال کے کوئی دو سو برس بعد میرزا بایسنغر کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ خسرو کے کلام کو جمع کیا جائے، چنانچہ انھوں نے بہت کوشش اور جستجو کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار بیت جمع کئے، لیکن اس کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ امیر خسرو کے کوئی دو ہزار بیت اور ایسے ہیں جو کسی دیوان میں درج نہیں ہیں - اس پر مرزا بایسنغر کو یہ محسوس ہوا کہ یہ کام یعنی خسرو کے تمام کلام کو جمع کرنا آسان نہیں ہے اور اُنھوں نے یہ جستجو ترک کردی، (۱) بالکل ممکن ہے کہ اس کام میں مرزا بایسنغر کو ایک شاعر سیفی نامی نے مدد دی ہو کیونکہ یہ

---

(۱) دیکھیے دولت شاہ ص ۲۳۰ -

اُنھی کے زمانے میں تھا اور کہا جاتا ھے کہ اُس نے خسرو کا کلام جمع کر کے اُس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا اور اُس کے اس مجموعے کا ایک نسخہ سینٹ پیٹرزبرگ (پیٹرو گراڈ) کے کتب خانے میں موجود بھی ھے - بہرحال یہ بات ظاھر ھے کہ خسرو کے بعد کسی کو ان کی سب تصانیف کو جمع کرنے میں کامیابی نہیں ھوئی اور اسی لئے یہ بیان کہ ان کی تصانیف ننانوے (۹۹) تھیں زیادہ تر فرضی اور قیاسی معلوم ھوتا ھے، خصوصاً اس لیے بھی کہ ان ننانوے تصانیف کے نام کسی نے بھی نہیں بتائے -

۲ - یہ ایک افسوسناک واقعہ ھے کہ مغلوں کے دور حکومت سے پہلے ھندوستان میں مسلمان بادشاھوں کے زمانے میں جو کچھ بھی ادبی اور علمی کام ھوا وہ ھم تک بہت کم پہنچا ھے، جس کی وجہ یا تو پٹھان بادشاھوں کی بے توجہی ھوسکتی ھے اور یا مغل بادشاھوں کا تعصب، یہاں تک کہ صرف شاعری ھی کی صنف میں بیسیوں نام ھمیں اُس زمانے کی تاریخ میں ملتے ھیں لیکن اب وہ ھمارے لیے محض نام ھی رہ گئے ھیں کیونکہ اُن میں سے زیادہ تر شعرا کے حالات زندگی یا اُن کے اشعار کے نمونے اب کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے، حالانکہ ان میں سے کئی صاحب دیوان تھے - بقول خسرو ان کے زمانے میں دھلی کا جو پتھر سرکاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعر نکل آتا تھا، چمن دھلی کی فضا شیریں نغموں سے معمور تھی اور ھر شاخ پر ایک بلبل خوش نوا غزل سرا تھا (۱) - لیکن ان سب کا کلام اب

---

(۱) دیباچہ وسط الحیات -

ایسا محو ہوگیا ہے کہ اس کے ملنے کی آیندہ کوئی توقع نہیں ہوسکتی ' اسی لیے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ خسرو کی بھی بعض تصانیف گردش زمانہ سے نیست و نابود ہوگئی ہوں گی ' یہ خیال ایک حد تک ضرور صحیح ہوسکتا ہے ' یعنی بالکل ممکن ہے کہ خسرو کی بعض "غیر اہم ' چھوٹی موٹی تصانیف جنھیں خود اُنھوں نے کوئی خاص اہمیت نہ دی ہو غائب ہوگئی ہوں - مگر اس کے مقابلے میں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے شعرا میں خسرو کی ایک خاص حیثیت اور مرتبہ تھا جسے اس تعلق کی وجہ سے جو ایک طرف اُنھیں دربار شاہی سے رہا اور دوسری طرف حضرت نظام الدین اولیا سے اور بھی تقویت ہوگئی تھی ' امارت اور ولایت کا یہ غیرمعمولی طرۂ امتیاز اور اس کے ساتھ خسرو کے کلام کی مسلمہ خوبی ' یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ جنھوں نے مل کر ان کے کلام کے بیشتر اور زیادہ قابل قدر حصے کو زمانے کے غارت گر ہاتھوں کی پہنچ سے ضرور بچا لیا ہوگا ' یہی باتیں ذرا کم حد تک خسرو کے ہمعصر خواجہ حسن کے کلام کی حفاظت کی بھی ضامن بن گئیں اور اسی لیے آج ہمارے پاس ان کا دیوان بھی کم و بیش مکمل حالت میں موجود ہے ' لیکن خسرو میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اُنھوں نے اپنے کلام کے بہت بڑے حصے کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا اور اپنے تصانیف کے دیباچوں میں اشعار کی تعداد ' سن تصنیف ' موقع تالیف وغیرہ بہت سی بیش قیمت معلومات بہم پہنچا دی تھیں اور اس طرح اُن کی ان تصانیف کے متعلق جو ہم تک پہنچی ہیں ' ہم یہ وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی قابل اعتنا کمی بیشی نہیں

ہوئی - نظم میں اس وقت ہمارے پاس خسرو کے پانچ دیوان، نو مثنویاں جن میں خمسہ بھی شامل ہے اور غزلیات کے متفرق مجموعے، جن میں سے غالباً ایک خسرو نے خود مرتب کیا تھا، موجود ہیں - ان تصانیف کی ضخامت اور حجم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ اُنھوں نے نظم میں کوئی اور بڑی تصنیف بھی کی ہوگی - اس لیے ہم صرف خسرو کے ہندوی کلام یا ان کی بعض غزلیات کے متعلق یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ تلف ہوگئیں کیونکہ ان دونوں کے متعلق خسرو خود یہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے ان کو کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا، اس لیے کہ وہ ان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے - لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ بعض غزلیں اور ہندوی کی بعض چیزیں بھی ان کی طرف منسوب کر دی گئیں حالانکہ وہ ان کی نہ تھیں، (۱) اس طرح اگر ایک طرف کمی ہوئی تو دوسری طرف زیادتی ہوگئی بہرحال غزلوں کے متعلق بھی یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زیادہ‌تر تعداد محفوظ رہی -

۳'۵ خسرو کی نثر کی تصانیف کا آغاز، خود ان کے بیان کے مطابق اعجاز خسروی یا رسائل‌الاعجاز سے ہوا جو سنہ ۷۱۹ھ

---

(۱) مثلاً عبید زاکانی کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے :

افتاد بازم در سر ہوای : دل باز دارد میلی بجای

برٹش میوزیم کے دو مخطوطوں میں (۲۱۱۰۳ و ۲۵۸۰۷) خسرو کی غزلیات میں درج ہے اور مقطع میں بجائے : چشم عبید از سیرش نہ بیند : چوں خسرو کا نام آیا ہے : گر چشم خسرو الخ -

میں پورے طور پر مرتب ہوئی - اس کے بعد (۱) وہ صرف پندرہ سولہ سال زندہ رہے، اس عرصے میں اُنہوں نے دو اور کتابیں یعنی خزائن الفتوح یا تاریخ علائی اور افضل الفوائد لکھیں، پندرہ سال کے قلیل عرصے میں خسرو سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اُنہوں نے ان تین کتابوں کے علاوہ کئی اور تصانیف کی ہوں - یہ بالکل ممکن ہے کہ کچھ چھوٹے موٹے رسائل خاص خاص مضامین پر جن میں اُن کو دلچسپی تھی لکھے ہوں لیکن اُن کی تعداد یا اہمیت زیادہ نہیں ہوسکتی، اسی لیے اس قسم کی روایتیں نا قابل قبول معلوم ہوتی ہیں کہ اُنہوں نے شیخ سعدی کی گلستان کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، (۲) - تاریخ الخلفا جس کا نام خسرو کی تصانیف میں لیا جاتا ہے واقعی ان کی تصنیف ہے یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے - اس کا ایک نسخہ میسور کی ٹیپو سلطان لائبریری میں ہے، لیکن بغیر دیکھے اس کے متعلق رائے قائم کرنا مشکل ہے، بہر حال اگر وہ خسرو کی تصنیف ہے تو موجود ہے اور ضائع نہیں ہوئی - ایک مضمون جس کے متعلق خسرو خاص طور پر لکھ سکتے تھے موسیقی ہے لیکن اس کے بارے میں ان کے اپنے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُنہوں نے کوئی کتاب، یا کم از کم قابل ذکر کتاب تصنیف نہیں کی چنانچہ ایک موقع پر ایک موسیقی دان سے اپنے مناظرے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

---

(۱) یعنی دیباچۂ اعجاز خسروی لکھنے کے بعد -

(۲) اسحاق خاں : Prolegomena ص ۲۰ -

نظم را کردم سہ دفتر ور بہ تحریر آمدی
علم موسیقی سہ دیگر بود از نادر بود" (۱)

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان غرۃالکمال کی تکمیل کے بعد انہوں نے موسیقی پر کوئی کتاب نہیں لکھی تھی -

ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ خسرو کے کلام کا ' خواہ وہ منظوم ہو یا منثور ' بیشتر حصہ اس وقت ہمارے پاس محفوظ ہے اور بہت کمتر حصہ ایسا ہوسکتا ہے جس کے تلف ہونے کا گمان کیا جائے ' لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تذکرہ نویسوں نے ننانوے تصانیف کیوں لکھی ہیں ؟ اس کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اُنھوں نے مبالغے سے کام لیا ہے ' دوسرے بالکل ممکن ہے کہ اس ننانوے کے عدد میں بعض تصانیف کے حصوں کو بھی علیحدہ اور مستقل تصنیف سمجھ لیا گیا ہو ' اور تیسرے یہ کہ غلطی یا غلط فہمی سے بعض ایسی تصانیف خسرو کی طرف منسوب کر دی گئی ہوں جو ان کی نہیں ہیں - چنانچہ مثال کے طور پر میں تین کتابوں کو لیتا ہوں جن کے نام بعض کتب‌خانوں کی فہرستوں میں خسرو کی تصانیف میں درج ہیں اور جن کے متعلق اب تک عام خیال بھی یہی تھا کہ وہ خسرو کے زور قلم کا نتیجہ ہیں لیکن وہ موجودہ تحقیق کی رو سے یقیناً ان کی نہیں ہیں - یہ تین کتابیں قصۂ چہار درویش فارسی ' انشاے خسرو اور قصیدۂ خسرو مشتمل بر داستان شاہنامہ ہیں -

قصۂ چہار درویش کی اصل فارسی کتاب سے عام طور پر

---

(۱) قطعہ دیوان غرۃ الکمال - دیکھیے ' آخری باب -

لوگ واقف نہیں ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کبھی چھپی نہیں اگرچہ اس کے قلمی نسخے کئی جگہ موجود ہیں - لیکن اس کے اردو ترجمے نے ' جو اردو نثر کی پہلی اہم تصنیف ہے ' کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی اور اس میں شبہہ نہیں کہ بعض لحاظ سے یہ ترجمہ بہت قابل قدر ہے ' میر امن دہلوی نے ترجمے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو نے فارسی میں لکھا تھا اور جب ایک مرتبہ حضرت نظام الدین بیمار تھے تو امیر خسرو انہیں یہ قصہ سنا کر اُن کا جی بہلایا کرتے تھے - یہ کہنا دشوار ہے کہ میر امن کے زمانے سے پہلے بھی اس قصے کی تصنیف کو امیر خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا تھا یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کا ترجمہ چھپنے کے بعد سے اس روایت کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا گیا اور ابھی حال کے زمانے تک کسی کو اس کے غیر معتبر ہونے کا شبہہ پیدا نہیں ہوا - ترجمے کو اصل سے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امن نے قصے کی ترتیب میں کچھ نہ کچھ تصرف ضرور برتا ہے اور ترجمہ لفظی نہیں ہے تو بھی اصل اور ترجمے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے - فارسی اصل کو پڑھنے کے بعد ہر سمجھ دار شخص آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ میر امن کا بیان قابل قبول نہیں یعنی یہ تصنیف خسرو کی نہیں ہوسکتی ' بلکہ اُن کے بہت بعد کے زمانے ' غالباً صفوی عہد میں ایران میں ' تصنیف ہوئی ہے - اور اس کے ثبوت میں مختصراً یہ باتیں کہی جاسکتی ہیں -

۱ - کتاب کی طرز تحریر خسرو کی طرز سے بہت مختلف ہے -

۲ - خسرو چونکہ شاعر تھے نثر نویسی میں بھی اُن کی یہ حیثیت باقی رہتی تھی ' یعنی اُن کی تحریر میں اشعار کثرت

سے ہوتے تھے - قصۂ چہار درویش میں اشعار بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے ایک بھی خسرو کا نہیں ہے - حالانکہ خسرو ہمیشہ اپنے ہی اشعار سے اپنی نثر کو بھی مزین کیا کرتے تھے -

۳ - بہت سے ایسے الفاظ اور محاورات ہیں جو خسرو اور ان کے ہمعصر ادیبوں کی تحریر میں نہیں ملتے ' مثلاً خوشامد گو ' حرامیان (بمعنی چور) ' چار سوق (بمعنی بازار) ' قورچیان ' تالار (بمعنی تالاب) ' انگشت قبول بر چشم نہادن ' اوطاق (بمعنی کمرہ) ' وغیرہ

۴ - بعض اصلاحیں ایسی ہیں کہ جو یقیناً خسرو کے زمانے میں رائج نہ تھیں ' مثلاً تومان (ایک سکہ ایران کا) ' دستر خوان ' اشرفی ' جوغہ ' شیرمال ' ترچکن (ایک کپڑا) ' قلیان ' قہوہ ' چارقب -

۵ - مصنف کو فرنگیوں کے رسم و رواج سے واقفیت معلوم ہوتی ہے (ظاہر ہے کہ خسرو کو کبھی اہل یوروپ سے سابقہ نہ پڑا ہوگا) چنانچہ ایک شعر ہے :

برھنہ سر بوت آیم برسم و راہ فرنگ
کہ من گدای فرنگم تو پادشاہ فرنگ

۶ - مصنف یقیناً شیعہ اثنا عشریہ عقیدہ رکھتا تھا ' قصے کے مطالعے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے -

دوسری کتاب جسے خسرو کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور ان کی نہیں ہے "انشاے خسرو" ہے ' یہ چند خطوط کا مجموعہ ہے جو بہت مرصع عبارت میں لکھے گئے ہیں ' تعجب ہے کہ اس کتاب کو کس طرح خسرو کی تصنیف سمجھ لیا گیا اس لئے کہ اس میں مصنف کا نام تک ملتا ہے ' یہ ایک

شخص عبدالباقی نامی منشی امین‌آباد (دکن) تھا جس نے اپنے آقا مرزا ابراھیم بیگ ولد حسن علی خاں ترکمان کی طرف سے یہ خط لکھے تھے اور جو غالباً سترھویں صدی عیسوی یا اس کے کچھ بعد زندہ تھا ' چنانچہ کتاب میں جو اشعار ھیں وہ مختلف شاعروں مثلاً خسرو ' حافظ ' نازنین ' اوحدی ' شاھی ' عرفی ' عارف اور جام وغیرہ کے کلام سے لیے گئے ھیں - مغالطے کی بنا غالباً اس کتاب کے ابتدائی چند الفاظ ھیں یعنی " عنوان نامۂ خیالات از مستوی (مثنوی) خسرو صوری و معنوی پیاراست الخ" اور اس کے بعد کے دو شعر جو خسرو کی مثنوی عشقیہ سے لیے گئے ھیں - یہی تصنیف رام پور کی لائبریری میں " خیالات خسرو " کے عنوان سے موجود ھے -

" قصیدۂ امیر خسرو مشتمل بر داستان شاھنامہ " کا خسرو کی طرف منسوب ہونا بھی حیرت انگیز ھے - اس لیے کہ اس نظم میں چند اشعار ایسے ھیں کہ جن میں مصنف نے سن تصنیف خود ھی بیان کر دیا ھے ' چنانچہ وہ کہتا ھے :

منت خدای را سخن سی ھزار بیت
گفتم بسہ صد و بدو سی بیت اندرا

بودہ‌است بر دو پنجصد از سال شصت و شش
کین صفحہ را زدم بسر انگشت مسطرا

مصنف کا پورا نام معلوم نہیں ' نظم میں صرف تخلص " دھلوی " موجود ھے :—

یا رب بحق آل پیمبر کہ دھلوی
زین گفتہ‌ها گرفتہ نکردد بہ محشرا

اسی طرح کیا عجب ھے کہ اور بہت سی تصانیف کو وقتاً فوقتاً خسرو کی طرف منسوب کر دیا گیا ھو اور یوں ان کو

تصانیف کی تعداد ننانوے بلکہ ایک سو ننانوے تک پہنچ گئی ہو! بہرحال اب میں خسرو کی فرضی تصنیفوں کا ذکر چھوڑ کر ان کی اعلی تصانیف کی طرف رجوع کرتا ہوں، ان تصانیف کی تقسیم یوں کی جا سکتی ہے:—

اول نظم - یعنی پانچوں دیوان، جن کے نام علی الترتیب تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیۂ نقیہ اور نہایۃ الکمال ہیں، خمسہ، تاریخی مثنویاں، غزلیات، ہندی کلام وغیرہ -

دوسرے نثر - یعنی اعجاز خسروی، خزائن الفتوح اور افضل الفوائد -

---

دسواں باب

خسرو کے پانچ دیوان

—— : o :——

پہلا دیوان : تحفۃ الصغر

یہ دیوان خسرو نے تقریباً سنہ ۶۷۱ھ میں مرتب کیا تھا اور ان کے اپنے بیان کے مطابق اس میں ان کے وہ قصائد وغیرہ درج ہیں جو اُنھوں نے سولہ سے انیس برس کی عمر تک کہے تھے - خسرو کو اپنے اس کلام کے متعلق قدرتی طور پر اطمینان نہ تھا، اس لیے کہ اُنھوں نے آغاز جوانی میں پرانے ایرانی اساتذہ مثلاً خاقانی، انوری اور سنائی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ ایک نو مشق شاعر کے لیے خواہ وہ کتنی ہی ذہانت طبع کیوں نہ رکھتا ہو ان استادوں کا کامیابی سے مقابلہ مشکل تھا، لیکن ان کے دوست تاج الدین زاہد نے ان کی ہمت افزائی کی اور اصرار کیا کہ اُنھیں اس کلام کو ضائع نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ ان کے نقاد دو قسم کے لوگ ہوسکتے ہیں - ایک تو وہ جو دانا ہیں اور ایک وہ جو نادان ہیں - دانا تو نکتہ‌چینی کے وقت ان کی نو عمری اور ابتدائی مشق کا ضرور لحاظ کریں گے اور جو نادان ہیں ان کا خیال کرنا خود نادانی ہوگی - چنانچہ تاج الدین زاہد نے انھیں " اس پراگندہ کلام کو مشاطۂ سخن بن کر موبمو ترتیب دینے میں

بہت مدد دی" - (۱) اور آخرکار پہلا دیوان مکمل ہوکر لوگوں کے سامنے آگیا - اس دیوان کے شروع میں خسرو نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں ان کی ابتدائی زندگی کے بعض دلچسپ حالات مندرج ہیں اور ہر ایک قصیدے یا ترکیب‌بند کے شروع میں ایک شعر ہے جو اس قصیدے یا ترکیب‌بند کے مضمون کو مختصر طور پر واضح کرتا ہے - یہ غالباً خسرو کی ایجاد ہے اور اس سے پہلے کسی شاعر کو اس کا خیال نہ آیا تھا - اگر ان سب شعروں کو جنھیں ابیات سلسلہ کہا جاتا ہے ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو ایک قصیدہ تیار ہو جاتا ہے ؛ یعنی سب شعر ایک ہی وزن میں ہیں اور ایک ہی ردیف اور قافیہ رکھتے ہیں -

دیوان تحفۃ الصغر میں کل پینتیس (۳۵) قصیدے ، پانچ ترجیع اور ترکیب بند ، متعدد چھوٹے بڑے قطعات اور ایک مختصر سی مثنوی ہے ، جس میں خسرو نے سرحدی علاقے کے ایک قلعے میں اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے - قصائد زیادہ‌تر سلطان غیاث‌الدین بلبن اور اس کے بڑے بیٹے سلطان نصیرالدین محمد قاآن کی مدح میں ہیں - بعض چند امرا مثلاً امیر علی سر جاندار عرف حاتم خان ، اختیارالدین کشلو خان ، شمس‌الدین ، قوام‌الدین ، عزیزالدین وغیرہ کی تعریف میں ہیں - ایک ترکیب بند میں عمادالملک کا مرثیہ ہے اور ایک میں دو پرندوں کا -

خاقانی کے کلام کی عظمت ، شکوہ الفاظ اور عالمانہ طرز بیان کو خسرو کے ان قصائد میں تلاش کرنا سعی لاحاصل ہے ؛

(۱) دیباچہ تحفۃ الصغر -

لیکن وہ شوخی تحریر، سلاست اور روانی اور خوبی اسلوب جو اس دیوان کے قصیدوں میں پائی جاتی ہے بڑے بڑے کہنہ مشق شاعروں کے کلام میں بھی مفقود ہے، مثلاً خسرو کے ان تین قصیدوں کا جن کے مطلعے ہیں :—

۱ - صبح از کوہ چو رخ بہ تماشا برآورد
چرخ آتشین حجاب بر اعضا برآورد

۲ - قلب خزان را شکست تاختن نو بہار

۳ - اے بستہ ماہ روی تو مہر اندر آئینہ

اگر خاقانی کے ان قصائد سے مقابلہ کیا جائے جن کے جواب میں وہ لکھے گئے ہیں اور جن کے پہلے مصرعے حسب ذیل ہیں :—

۱ - ہر صبح رخ ز گلشن سودا برآورم

۲ - کرد خزان تاختن بر سر خیل بہار

۳ - ما فتنہ بر تو ایم و تو فتنہ بر آئینہ

تو یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اگرچہ شاگرد بعض لحاظ سے استاد کی گرد کو نہ پا سکا تو بھی بعض اور لحاظ سے اُس سے بازی لے گیا - اسی طرح انوری کی طرز میں جو قصیدہ لکھا ہے اور جس کا پہلا مصرع یوں ہے کہ : باز بلبل در غزل خوانی شدہ است، وہ بھی اُس استاد کی ایک بہت ہی اچھی نقل ہے -

معمولی سی بات کو زور قلم سے خسرو ایک خاص شاعرانہ رنگ دے کر ایسا موثر اور پرکیف بنا دیتے ہیں کہ وہ ایک بڑا واقعہ معلوم ہونے لگتا ہے، چنانچہ دو پالتو پرندوں کا مر جانا کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی لیکن خسرو کا مرثیہ پڑھ کر یہ خیال ہرگز نہیں پیدا ہوتا کہ اُنھوں نے ایک غیر اہم چیز کو بیجا رنگ آمیزی سے اہمیت دینے کی کوشش کی ہے - بلکہ

واقعی ایک دردانگیز اور رقت خیز مرثیہ معلوم ہوتا ہے اور شاعر کے اصلی جذبات اور احساسات کا عکس اس میں جھلکتا ہے - چنانچہ کہتے ہیں :—

چون شد گه غروب همائی فلک نگون
رفتم سوی قفس که کنم دانهٔ فزون
دیدم فتاده هر دو نو از گرمی هوا
در آبدان و سرد شده هر دو در درون
بستند نول ز آبخور دانه چون دریغ
بگرفت روئی سرخی شان دانه چون دریغ
آن ترکها شگفته سر غنچه شان فسوس
و آن سینه‌ها شکفته تر از یاسمین دریغ
آن پایهائی لعل چو گنج گهر نژاد
و آن چشم‌هائی سرخ چو چشم نگین دریغ
پرهائی نرم و تر چو حریر خطا فسوس
پرهائی گرم و تازه چو دیبای چین دریغ

از آه گرم تاج بسوزند هدهدان
دمهای سرد تاج صفت بر سر آورند
از چشم چو ستارهٔ خود بلبلان مست
بس خون خار تازه که بر پیکر آورند
کنجشک‌های شانه شده داغ دل چو شمع
مقراضهائی نول بسوئی پر آورند
گردند جمع طایر ابابیل در عزا
وز نوحه رستخیز ز بستان برآورند

مرغان سربسر همه در سوگ مانده اند
در صبح و شام غیر دعا شان نخوانده اند
یا رب که آن دو تر به ارم جاودانه باد
در کشت زار رحمت شان جا (ی) روانه باد
آمد چو زندگانی ایشان به منتها
هر یک ازان دو در صف مرغان یگانه باد
بر هر درخت خلد که مرغان شوند جمع
یا رب که شاخ سدره شان آشیانه باد
و آن مرغ را که خدمت ایشان کند بصدق
از عون حق بناحیۂ نورخانه باد
هر تاز و یارئی که نمودند آن دو یار
اندر زبان جملۂ مردم فسانه باد
موئی ز وصف شان نکنم تا فرو گزاشت
یا رب زبان تیز درازم چو شانه باد
وانکس که خواند این سخنت با زبان تر
سلطانیا چو شعر توت جاودانه باد

اس دیوان کی نظموں میں خسرو اپنا تخلص اکثر سلطانی کرتے ہیں، چنانچہ اوپر جس ترکیب بند کے اشعار نقل ہوئے ہیں اس میں بھی یہی تخلص ہے - یہ دیوان اب تک نہیں چھپا، لیکن اس کے قلمی نسخے اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں -

---

دوسرا دیوان : وسط الحیوۃ

یہ دیوان بھی خسرو نے اپنے دوستوں اور قدر دانوں کے اصرار پر مرتب کیا تھا اور اگرچہ ان کے ایک بیان سے یہ پتہ چلتا

ھے کہ اس میں وہ نظمیں درج ھیں جو انھوں نے انیس سے لے کر چوبیس برس کی عمر تک کہی تھیں' دیوان کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس میں بعض ایسے قصائد وغیرہ بھی شامل ھیں جو خسرو نے بتیس بلکہ تینتیس سال کی عمر میں کہے تھے' اس طرح دیوان کی تالیف غالباً سنہ ۶۸۴ھ میں ھوئی ھوگی - دیوان کے نام کا ذکر پہلے ایک عربی عبارت میں یوں کرتے ھیں :-

بفضل اللہ قد سطرت ھذہ الصفحات و جعلتھا واسطۃ لبقاء الذات بعد الممات وترجمتھا بوسط الحیوٰۃ انصر اور اس کے بعد فارسی میں ان الفاظ میں : چون این لطائف زبدۂ لطف حیات بود بر مثال سواد جوانی و بر وسط زندگانی برنہج کامرانی نام این نوخ نامۂ درج صفات وسط الحیات کردہ شد '' -

یہ عبارتیں دیوان کے دیباچے میں ھیں جو تحفۃ الصغر کے دیباچے ھی کی طرز پر لکھا گیا ھے اور جس سے شاعر کی زندگی کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ھے - خسرو کو اس وقت غالباً یہ خیال نہ تھا کہ وہ اس کے بعد تین دیوان اور مرتب کریں گے ۔ اور نہ بظاھر ان کو یہ گمان تھا کہ ان کا زور سخن اور روانی طبع عمر کے ساتھ بڑھتی جائے گی' اس لیے کہ دیباچے میں کہتے ھیں کہ آدمی کی عمر کا وہ حصہ جس میں وہ بہترین کلام کہ سکتا ھے جوانی اور درمیانی عمر ھے اور اگر اس زمانے میں اس نے کوئی قابل قدر چیز نہیں کہی تو آیندہ بھی اس سے کوئی توقع نہیں ھوسکتی - بتیس سال کی عمر میں (بقول ان کے) ان کا کلام پورے شباب کو پہنچ گیا تھا - آغاز جوانی

کے کلام میں جوش اور ولولہ ضرور ہوتا ہے لیکن پختگی اور متانت نہیں ہوتی ' اسی طرح بڑھاپے کے کلام میں سنجیدگی اور پختگی ہوتی ہے لیکن وہ گرمی اور جوش مفقود ہوتا ہے جو جوانی کے کلام میں پایا جاتا ہے ' لیکن درمیانی عمر کے کلام میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوتی ہیں -

اس دیوان میں کل اٹھاون قصیدے ' آٹھ ترجیع بند اور متعدد قطعات اور رباعیات ہیں - دیوان کے کل اشعار کی تعداد آٹھ ہزار چار سو اکتالیس ہے جسے آخری قطعے میں یوں بطور معما بیان کیا ہے :

واسطہ است از پئی حیات ابد	این کتاب ازچنین خجستہ خطاب
در شمردن ز بیتہائی ترش	ہشت ابر آمدہ است بر یک آب
غیر یعنی کہ ہشت بار بخوان	ما بہ یکبار دیدہ ایم صواب
چارصد چہل یکست و ہشت ہزار	ہمہ بیت از جمل کشادہ نقاب
این شمار دست وضع بندہ کہ نیست	ہیچ کس را درو محل جواب

قصاید میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں :—

حکم الحکم ' (جس میں ملتان کے حادثۂ فاجعہ کا ذکر ہے) ' مروحۃ الروح ' (جس میں گرمی کے موسم میں ایک سفر کی مشقتیں بیان کی ہیں) ' علم العلم اور ازہار الانوار اور ترجیعات میں عین المعانی ' رویۃ الہلال اور حدیقۃ الحدائق شامل ہیں - قصائد زیادہ تر شہزادہ سلطان محمد شہید کی مدح میں ہیں ' باقی قصائد میں حمد و نعت کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا ' بلبن ' کیقباد ' بغرا خان ' اختیارالدین کشلو خان شمس الدین دبیر ' تاج الدین الپ بن ازدر ' جلال الدین فیروز خلجی وغیرہ کی مدح ہے - ترجیعات میں تین ایسی ہیں کہ جن میں

سلطان محمد شہید کا مرثیہ کہا ہے، تین اس شہزادے کو خطاب کر کے لکھی گئی ہیں، ایک میں کیقباد کی تخت نشینی کا ذکر ہے اور ایک کشلو خاں کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ قطعات کی تعداد بیالیس ہے اور ان میں سے بعض میں ہم عصر ملوک اور امرا کو خطاب کیا گیا ہے۔

اس دیوان میں بھی تحفۃ الصغر کی طرح ابیات سلسلہ موجود ہیں۔ دیوان کے قلمی نسخے کمیاب ہیں اور نئی کلیات میں دیوان موجود نہیں ہے۔

وسط الحیواۃ میں تاریخی نقطۂ نظر سے، اور ایک حد تک فنی نقطۂ نظر سے بھی، سب سے زیادہ دلچسپ وہی قصاید ہیں جن میں ملتان کے واقعے کا ذکر ہے، اگرچہ کیقباد کی تخت نشینی پر جو قصیدہ لکھا ہے اور جس کا مطلع ہے:

سلطان معز دنیا و دین کیقباد شاہ
یک دیدہ و دو مردمک چار پادشاہ

بھی فنی حیثیت سے نمایاں خصوصیات رکھتا ہے۔ تحفۃ الصغر کی طرح سے اس دیوان میں بھی بہت سے قصائد وغیرہ ایسے ہیں جن میں خاقانی کی پیروی کی گئی ہے، اسی طرح کمال اصفہانی کے مخصوص انداز میں بھی خسرو نے طبع آزمائی کی ہے، صنائع اور بدائع میں ایجاد کا خسرو کو ہمیشہ سے شوق تھا۔ اس دیوان میں بعض نئی صنعتوں کے نمونے ملتے ہیں جن میں شاذ ایک صنعت جسے وہ " حامل موقوف " کہتے ہیں قابل ذکر ہے، یہ تخلص یا گریز کا ایک نیا اسلوب ہے جو بعد کے زمانے میں خاصا مقبول ہوگیا تھا مثلاً ایک قصیدے میں خسرو یوں گریز کرتے ہیں:—

اکنون کہ آب چشم بلا گشت مر مرا
چشم مرا کہ باز خرد از بلائی آب
سلطان مکرمت شرف الدین فتح ملک
ای آنکہ ریزی از سخن جانفزای آب

یا ایک اور قصیدے میں کہتے ہیں :—

هنوز تا چہ کند کہنہ‌هائی غمزہ ورت
اگر بہ لطف بریں بندہ مہربان نہ بود
ستودہ نصرت دنیا محمد سلطان
کہ جز بذات وی از محمدت نشان نہ بود

شہزادہ محمد شہید کے بعض مرثیوں کا ترجمہ پہلے لکھا جا چکا ہے - ایک اور مرثیے کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتا ہوں :—

بکہ دفن ہمی گفت بدارید مرا
در گل تیرہ بخواری نسپارید مرا
کام از تلوسۂ مرگ لبالب خشک است
شربتی آب ز ہر دیدہ بیارید مرا
پدر و مادر من خون شمایم آخر
قطرہ سازید وپس از چشم ببارید مرا
خاک دانید کہ اندر جگرم خواہد داشت
این چنین در جگر خاک مدارید مرا
با شما داشتم آخر حق صحبت یکچند
یر مگردید و حق آن بگزارید مرا
دیر اگر نیست زمانی بہ نشینید بہ من
این چنین بیکس و تنہا مگزارید مرا

نقش گورم ز درون سو همه از خون منست
بیرونش از گریهٔ خونین بنگارید مرا
پشت میخاردم از شوره مگر خواهد ریخت
پشت از ناخن اشفاق بخارید مرا
از شما باری ز سرتا بقدم در خون ست
که من احوال شما هیچ ندانم چون ست
تنگ می آیم ازین خانه درم باز کنید
راه شد بسته ز هر رهگذرم باز کنید
آرزوهاست که یک دم بشما در نگرم
پردهٔ خاک ز پیش نظرم باز کنید
روزنی نیست که نظارهٔ عالم بکنم
یک دو خشت از سر بالای سرم باز کنید
رخنهٔ بار کنیدم که جهان تاریک ست
در توان بهشتوی بیشترم باز کنید
مردم دیدهٔ من عزم تماشا دارد
پلک باهم شده از یکدگرم باز کنید
بند دیگر نه نهید از گل و خشتم باری
چون نیارید که بند خطرم باز کنید
مهر مادر پدر اندر جگرم درمانده است
چون بدن می نرود از جگرم باز کنید
بشنوید از من افسانهٔ دوری پدر
چون شنیدید به پیش پدرم باز کنید

تیسرا دیوان : غرۃ الکمال

خسرو کا یہ تیسرا دیوان سنہ ۶۹۳ھ میں مرتب ہوا اور اس میں زیادہ‌تر ان کی وہ نظمیں شامل ہیں جو انہوں نے چونتیس سال کی عمر سے لے کر تینتالیس سال کی عمر تک کہی تھیں، اگرچہ بعد میں اس میں اور اضافہ ہوتا گیا اس لیے کہ خسرو دیوان کے دیباچے میں خود کہتے ہیں کہ :

سنہ ۶۸۵ھ سے لے کر جب میرا سن ۳۴ سال کا تھا سنہ ۶۹۳ھ تک جب کہ میں تینتالیس سال کا ہوں جو نظمیں بھی کاتبوں نے جمع کیں وہ سب اس مجلد میں درج ہیں اور اس کے بعد بھی جو کچھ جمع ہوگا اسی میں شامل کیا جائے گا (بعد ازین ہر چہ جمع افتد ہم درین کارخانہ خرج شود)

اس دیوان میں بھی ابیات سلسلہ موجود ہیں اور دیباچہ بھی ہے جو بہت مفصل ہے، اور جس سے شاعر کے سوانح حیات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ دیباچے میں کئی اور مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہے مثلاً فن شاعری کی خوبیاں کیا ہیں، فارسی شاعری کو کس بنا پر عربی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے، شعر کی اقسام کیا کیا ہیں، ہندوستان کی فارسی شاعری کو کیوں امتیاز حاصل ہے، شاعری میں مہارت کن طریقوں سے پیدا کی جاسکتی ہے وغیرہ - اور اس میں شبہہ نہیں کہ اگرچہ دیوان غرۃ الکمال کی نظمیں بہت قابل قدر ہیں لیکن اس کا دیباچہ زیادہ بیش قیمت چیز ہے - یہ دیوان خسرو کے پانچوں دیوانوں میں سب سے زیادہ بڑا ہے اور ان کے کلام کے بعض بہترین نمونے اس میں موجود ہیں چنانچہ خسرو کے مندرجۂ ذیل مشہور اور معروف

قصیدے اسی دیوان میں ہیں :—

۱ - جنات النجات - جس میں توحید خدا اور عقائد کا ذکر ہے اور جو سنائی کے قصیدے کے جواب میں لکھا گیا ہے -

۲ - مرآت الصفا - نعت اور پند و نصائح پر مشتمل ایک بہت طولانی قصیدہ ہے جو خاقانی کے مشہور قصیدۂ شوقیہ کے جواب میں لکھا گیا ہے - لیکن خاقانی کا قصیدہ تو چوبیس بیت کا ہے - خسرو نے ڈیڑھ سو اشعار لکھے ہیں اور انہی کی نقلوں میں جامی نے اپنا قصیدہ جلاء الروح (۱۳۰ بیت) لکھا اور اسی طرح فضولی بغدادی نے ایک سو چونتیس بیت کا قصیدہ انیس القلب کے نام سے لکھا اور عرفی نے چورانوے اشعار کا قصیدہ موسوم بہ عمان الجواہر تصنیف کیا -

۳ - دریاے ابرار - یہ قصیدہ حضرت نظام الدین اولیا کی مدح میں ہے اور اس کی نقل بڑی بڑی بڑے شاعروں نے کی ہے، چنانچہ جامی نے لجۃ الافکار اور نوائی نے بحر الافکار کے نام سے جواب لکھے ہیں - نوائی نے مجالس النفائس میں لکھا ہے کہ خسرو کہا کرتے تھے کہ اگر حوادث زمانہ سے میرا تمام کلام مفقود اور معدوم ہو جائے اور صرف یہ قصیدہ باقی رہ جائے تو مجھے کچھ فکر نہ ہوگا، اس لیے کہ جو کوئی اس قصیدے کو پڑھے گا وہ اقلیم سخن میں میرے مرتبے اور قابلیت کا معرف ہوگا (۱) - خسرو، جامی اور نوائی کے ان معرکۃ الآرا قصیدوں کے پہلے مصرعے علی الترتیب یوں ہیں :

۱ - کوس شہ خالی و بانگ غلغلش اندر سر است

---

(۱) مجالس النفائس ص ۳۲۹ -

۲ - کنگر ایوان شہ کز کاخ کیوان برتر است - اور
۳ - آتشین لعلی کہ تاج خسروان را زیور است
۴ - نظام الدرر - یہ قصیدہ بھی زیادہ‌تر مضامین تصوف اور پند و نصائح پر مشتمل ہے -

باقی قصاید زیادہ‌تر مدحیہ ہیں جن میں جلال الدین فیروز خلجی ' اس کے دو بیٹوں ارکلک خاں اور ابراہیم قدر خاں ' علاءالدین خلجی اور اس کے بھائی الماس بیگ اولوغ خاں ' اختیارالدین علی بن ایبک اور بعض اور امرا کی تعریف ہے - کل تعداد قصائد کی نوے ۹۰ سے زائد ہے - یعنی اگر ترجیعات کو بھی شامل کر لیا جائے - ترجیعات میں ایک بہت عمدہ نظم خاقانی کی تقلید میں لکھی گئی ہے جس کا مضمون نعت رسول صلعم ہے ' ایک ترجیع جس کا نام نورالنور ہے جلال الدین فیروز خلجی کے نام ہے ' ایک میں علاءالدین خلجی کی مدح ' اس کے ایک لڑکے کی پیدائش اور اس موقع پر دہلی کی آرایش اور آئینہ‌بندی کا ذکر ہے ' ایک شہزادہ محمود خان ' خانان کا مرثیہ ہے جو فیروز خلجی کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ایک میں خود خسرو کے ایک بیٹے کا مرثیہ ہے -

قصائد اور ترجیعات کے علاوہ اس دیوان میں کوئی نو مثنویاں ہیں جن میں مثنوی مفتاح الفتوح بھی شامل ہے - اس مثنوی کو بعض تذکرہ‌نویسوں نے ایک مستقل تصنیف خیال کیا ہے لیکن بیت سلسلہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی دیوان غرۃ الکمال کا ایک جزو ہے - اگرچہ اس مثنوی کا حجم اور اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس پر علیحدہ تبصرہ کیا جائے اور اسی لیے تاریخی مثنویوں کا ذکر کرتے ہوئے میں اس

مثنوی پر بھی روشنی ڈالوں گا - ایک مثنوی ۲۶۳ اشعار کی ھے جسے اودھ سے تاج الدین زاھد کو شاعر نے ایک خط کی شکل میں لکھ کر بھیجا تھا - اس خط کا ذکر پہلے آ چکا ھے - یہ مثنوی سنہ ۶۷۶ھ میں لکھی گئی تھی - ایک اور مثنوی میں خسرو نے امیر علی سرجاندار عرف حاتم خاں کو مخاطب کر کے ایک گھوڑے کی مصیبت کی داستان لکھی ھے جو اس امیر نے خسرو کو دیا تھا - یہ مثنوی خسرو کی مخصوص ظرافت طبع کا اچھا نمونہ ھے اور بہت دلچسپ پیرایے میں لکھی گئی ھے -

دیوان میں بہت سے قطعات، رباعیات اور غزلیں بھی ھیں -

خسرو نے غرۃ الکمال کے قصائد میں بھی حسب معمول پرانے اساتذہ کی پیروی کی ھے - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ھے کہ دیوان کے سب قصائد دوسرے شعرا کے کلام کے جواب میں لکھے گئے ھیں بلکہ بہت سے قصیدے ایسے بھی ھیں جو طرز اور اسلوب میں بالکل اچھوتے ھیں اور جہاں کہیں خسرو نے کسی شاعر کی نقل کی ھے، وھاں بھی اپنے خاص انداز کو ترک نہیں کیا مثلاً ایک قصیدے کی تشبیب جو ظہیر فاریابی کے مشہور قصیدے کے جواب میں لکھا گیا ھے، یوں ھے :—

شیرین دھان یار کہ راحت بجان دھد
آب حیات زان لب شکر فشان دھد
اینک ز کشتگان جفایش یکی منم
کس را مباد کان لب شیرین زبان دھد
عمری رود کہ یاد نیارد ز دوستان
آن شوخ را خدای دل مہربان دھد

شهریں سوار من چه خبر دارد از جہان
مسکین کسی که بیندش از دور و جان دهد
گم شد دلم کنون من و شبہای کوی دوست
باشد کسی ز گمشدهٔ من نشان دهد
اے باغبان ز سوز دل بلبلان بترس
گل را رها مکن که صبا را عنان دهد
پر خون شد از پیاله درونم نه تا چرا
هر لحظه بوسهٔ باب آن جوان دهد
ساقی نگر چه دشمن جان شد مرا که من
مست و خراب و او همه رطل گران دهد
کار من از شراب بدین جایگه رسید
و آن نا خدای ترس مرا خود همان دهد
آخر رسید دور من آن مست ناز کو
تا یک مئی بدست خودم در دهان دهد
کارم شده است سم نزیم گر پیاله را
خود چاشنی کند به من ناتوان دهد
ز آب حیات شست دهن را هزار بار
تا بوسه بر رکاب شه کامران دهد
سلطان جلال دین که گه تخت بر شدن
چرخش ز هفت کرسی خود نردبان دهد
فیروز شه که صیت بلندش زمان زمان
از شرق تا بغرب ندائی امان دهد

اگر خسرو کے اس قصیدے کا ظہیر کے قصیدے سے جس کا
مطلع ہے :

شرح غم تو لذت شادی بجان دهد

لعل لب تو طعم شکر در دهان دهد

مقابلہ کیا جائے تو خسرو کی فن‌کاری اور ذوق شعر کی خوبی کا اندازہ اچھی طرح ہوسکتا ہے - اسی طرح ایک اور قصیدے کی تشبیب میں عید کی آمد کا ذکر یوں کرتے ہیں :—

عید است و خوبان نیم شب در بوی خمار آمده

سرمست گشته صبحدم غلطان ببازار آمده

عید آمد از چرخ برین پر شادمانی شد زمین

مه را چو زرین طاس بین از بهر خمار آمده

با ظلمت شب شکل مه چون ناخن شیر سیه

آهوی مشرق در بغه افتان و خون‌بار آمده

گوئی که ابر اندر فلک پهلی است آن بی هیچ شک

و آن پیال را زرین کزک بر سر نگون‌سار آمده

هر کس بکف کرده ملی هر دل شکفته چون گلی

وز کوس هر سو غلغلی بر چرخ دوار آمده

شب کس بخسته خواب را جویان گلاب ناب را

برگ می و جلاب را هر سو خریدار آمده

آنکه سجده کرد اثر در صبح عیدی کن نظر

وز می رخ مستان نگر چون برگ گلنار آمده

در خانه هر خورشیدوش گلگونهٔ نه کرده خوش

مژگان چو تیر نیم‌کش لبها چو سوفار آمده

زده نگارین دست و پا بر بانگ دف نغمه سرا

وز نغمه های دلربا بر جان ستم‌کار آمده

باز از لطافت هر پسر کرده لباس نغز و تر
هر یک بر آئین دگر چون ریز و عیار آمده

در عهد گه گشته روان هر سوی چون سروی روان
هم عقل برده هم روان شُل دزد و طرار آمده

بر بافته جعد سیه وز ناز کژ کرده کله
از روی ایشان عهدگه یغما و فرخار آمده

والاده براق صف شکن در عهدگه شاه زمن
بسته بگردش انجمن شوران پیکار آمده

ترکان عنان کرده یله کوس آمده در غلغله
در دشت و صحرا زلزله از قلب جرار آمده

ایک اور قصیدے کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں - یہ قصیدہ بظاہر رمضان کے مہینے میں لکھا گیا تھا ——

مدار جان من از بهر جان من روزه
ازان که جانی و جان را عنا دهد روزه

لبت پر از می و گوئی که روزه می دارم
تو خود بگوی که باشد چنین روا روزه

اگر تو روزه برای خدای می داری
مدار بهش برای خدای را روزه

ز دیده ساخته ام شربتی و می نخوری
اگر ز روزه ترا خوش بود خوشا روزه

شدی ز روزه هلالی ز ابر دیدهٔ من
نهان مباش و مکن عهد من مها روزه

ز تاب روی تو شبهای روزه جمله برفت
بماند متصل از نور روزه با روزه

بخانهٔ که تو باشی چو شب نخواهد شد
بہوش روی چو خورشید و برکشا روزہ
بیک ابروت نگرم روزہ گیرم از پی وصل
بدیدن دگر ابرو رها کنم روزہ
کمر ببند و مهار آفتاب در جوزا
مکن دراز برین جان مبتلا روزہ
ببرد تشنگی خلق را که از لب تو
بآب چشمهٔ حیوان شد آشنا روزہ
ندانم از چه چنین دیر می رود مانا
شد از لب تو شکرپا شکرلبا روزہ
دری کشا و دهانت دکان حلوا را
که کرد حلقهٔ آن باز لیبها روزہ

غرۃ الکمال کے دیباچے میں خسرو نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غزل کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے، اس لئے کہ جو دو چار شعر موزوں کر سکتا ہے وہ غزل‌گو مشہور ہو جاتا ہے اور اسی لئے دیوان میں انہوں نے غزلوں کو جگہ نہیں دی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انہوں نے اپنی راے میں تبدیلی کر کے کچھ غزلیات بھی اس دیوان میں شامل کر دیں جو اب دیوان کے نسخوں میں موجود ہیں کیونکہ ابیات سلسلہ کے دو شعر ایسے ہیں جو یقیناً غزلوں کے مجموعے ہی کے لئے لکھے گئے تھے - وہ شعر یہ ہیں :-

درد دلیست هر غزلم زان سبب که هست
خلق بتان بلای دل و فتنه این خیال

ابیات عاشقانہ نگہ کن کہ ہر یکی
دارد سواد کوتہ و خوش چوں شب وصال

بلکہ غالباً نہ صرف دیوان غرۃ الکمال کے ساتھ بلکہ اپنے ہر ایک دیوان کے ساتھ خسرو نے غزلیں ضرور شامل کیں ' اگرچہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان غزلوں کی تعداد میں مختلف نسخوں میں کمی بیشی ہوگئی ہو - اسی طرح اس دیوان کے ساتھ بہت سی رباعیات بھی ہیں جو ممکن ہے کہ اُس " شہر آشوب " کا ایک جزو ہوں جس کا ذکر خسرو کی تصانیف میں کیا جاتا ہے -

غرۃ الکمال کے دیباچے میں ایک بات خاص طور پر دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ خسرو ایک تو ہندوستانی شعرا کی ذہانت اور موزونی طبع کو سراہتے ہیں اور دوسرے ہندوستان کی فارسی زبان کو اور ملکوں کی فارسی سے خالص‌تر بتاتے ہیں - چنانچہ کہتے ہیں :—

ہندوستان کے عالم ' خصوصاً وہ جو دہلی میں مقیم ہیں ' ان تمام اہل ذوق سے جو دنیا میں کہیں بھی پائے جاتے ہیں فن شعر میں برتر ہیں ' عرب ' خراسانی ' ترک وغیرہ جو ہندوستان کے ان شہروں میں آتے ہیں جو اسلامی حکومت میں ہیں مثلاً دہلی ' ملتان یا لکھنوتی اگر ساری عمر بھی یہاں گزار دیں تو اپنی زبان نہیں بدل سکتے اور جب شعر کہیں گے تو اپنے ملک کے محاورے ہی میں کہیں گے ' لیکن جو ادیب ہندوستان کے شہروں میں پلا بڑھا ہے ' خصوصاً دہلی میں ' بغیر کسی ملک کو دیکھے یا وہاں کے لوگوں سے ملے جلے ' اس ملک کے لوگوں کی طرز میں لکھ سکتا ہے بلکہ

ان کی نظم و نثر میں تصرف کر سکتا ہے اور جہاں بھی چلا جائے وہاں کی روش کے مطابق بخوبی لکھ سکتا ہے - یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے بعض علما نے عرب جائے بغیر عربی میں ایسی دسترس حاصل کر لی ہے کہ عرب کے بڑے بڑے اساتذہ کو نصیب نہ ہوئی ہوگی... میں نے بہت سے ایسے ترک اور تاجیک دیکھے ہیں کہ جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر ترکی زبان کو ایسی اچھی طرح سیکھ لیا اور ایسی روانی سے بولنے لگے کہ خالص ترک جو خراسان سے آتے تھے حیران رہ جاتے تھے - اسی طرح اگرچہ فارسی زبان کا اصل وطن ایران تھا اب اس زبان کی پاکیزگی سب جگہ ' سوائے ماوراء النہر کے ' معدوم ہو چکی ہے اور ماوراء النہر کی زبان وہی ہے جو ہندوستان کی ہے - مثلاً خراسانی چہ کو چی کہتا ہے اور بعض کجا کو کجو کہتے ہیں حالانکہ ابھی یہ الفاظ لکھے ٹھیک جاتے ہیں... لیکن ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ سے لے کر سمندر کے ساحل تک ایک اور یکساں ہے - چونکہ ہمیں محاورے کی یہ یکسانیت حاصل ہے اس لیے ہماری شاعری کا عظیم المرتبہ ہونا باعث تعجب نہیں - علاوہ ازیں ہماری فارسی وہی قدیم پارسی دری ہے - ہندوی زبان تو ضرور ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہے لیکن فارسی زبان ایک سرے سے دوسرے تک بالکل ایک ہے اور جس طرح لکھی جاتی ہے ویسے ہی بولی بھی جاتی ہے - یہ فارسی آذربیجان کی زبان کی طرح نہیں ہے جس میں کردہ کے بدلے " کردہ کن " کہا جاتا ہے یا سیستانیوں کی بولی نہیں ہے جن کے افعال لفظ " سین " پر ختم ہوتے

ہیں ، مثلاً کردۂ سن ، گفتۂ سن "۔ باوجود اس کے جب کچھ یالائی یہاں آکر مقیم ہوئے تو دہلی کے ادیبوں نے از راہ طنز و تمسخر ان کی زبان سیکھ لی اور اسی زبان میں ایسا لکھنے لگے کہ وہ لوگ ان کی تحریر پر کہیں حرف گیری یا نکتہ چینی نہیں کر سکتے تھے ۔"

خسرو کا یہ بیان ماہران علم لسان کی توجہ کا مستحق ہے اور ان لوگوں کے لیے خاص طور پر قابل غور ہے جو ہندوستان کی فارسی کے متعلق حقارت آمیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

چوتھا دیوان : بقیۂ نقیہ

یہ دیوان خسرو نے چونسٹھ برس کی عمر میں ، یعنی سنہ ۷۱۶ھ میں علاءالدین کے انتقال کے کچھ عرصے بعد مرتب کیا ۔ اس دیوان میں بھی ایک دیباچہ اور ابیات سلسلہ موجود ہیں اور اگرچہ ضخامت میں یہ دیوان غرۃالکمال سے بہت چھوٹا ہے تاہم اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ خسرو کے پختہ کلام کے بعض نادر نمونے اس میں موجود ہیں ، غرۃ الکمال کی تالیف کے بعد خسرو کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ وہ ایک اور دیوان مرتب کریں گے ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ خسرو کا ملکۂ سخن گوئی بڑھتا جاتا تھا جو یقیناً غیر معمولی ذہانت اور خداداد قابلیت کی دلیل ہے ، چنانچہ اس دیوان کے دیباچے میں کہتے ہیں :—

میرے نفس میں شعر شاعری کی ہوس بڑھتی ہی جاتی ہے ، بتیس سال کی عمر میں ایک رباعی کہنے کے بعد مجھے غور اور تامل کی ضرورت ہوتی تھی اور پھر دوسری رباعی کہہ سکتا تھا ، لیکن اب جب کہ میرا سن چونسٹھ کا

ہو چکا ہے اور میرے در دندان گرنے کے قریب ہیں، میرا نفس مجھ سے کہتا ہے کہ یہی وہ خاص وقت ہے جب میرے منہ سے شعر کے موتی جھڑنے چاہئیں، میں اپنے منہ کو جتنا بند کرتا ہوں اتنی ہی کثرت سے یہ موتی نکلے چلے آتے ہیں، میں اکثر ایسے سمندروں میں غوطہ زن ہو جاتا ہوں کہ جن کی تہ کو پرانے بڑے اساتذہ بھی نہ پاسکے تھے اور چند لمحوں میں بلا کسی خاص زحمت کے اتنے درخشاں موتی نکال لاتا ہوں کہ انہیں جمع کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن چونکہ اب اشعار کی تزئین اور آرائش کا زمانہ نہیں رہا میں صرف ایک یا دو موتی چن لیتا ہوں جو چننے کے قابل ہوں اور انہیں منظوم کر دیتا ہوں اور باقی میرے ذہن کی مٹی پر گرد آلودہ اور کس مپرسی کی حالت میں پڑے رہتے ہیں کیونکہ اگر میں ان سب موتیوں کو اکٹھا کرنے لگتا تو چار دیوان نہیں چار سمندر جمع ہو جاتے ...... میں اتنی تیزی سے فی البدیہہ شعر کہتا ہوں کہ جتنی دیر میں کوئی بہت کا لفظ کہے میں ایک شعر بنا لیتا ہوں بلکہ اندیشۂ تیز گام بھی میرے فی البدیہہ کلام کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس لیے کہ میں نے کئی ایک رباعیاں اتنی جلدی کہی ہیں کہ مجھے خیال یا غور کا وقت ہی نہیں ملا - اپنے قلم کے حق کی قسم بہت دفعہ کاتب تقدیر کی تیز اور رواں قلم بھی میری قلم کی سرعت کو نہیں پاسکی اور بادشاہوں کی مجلسوں میں زیادہ تر میں فی البدیہہ کہنے ہی پر قناعت کرتا ہوں اور قلم کو یک قلم ترک کر دیتا ہوں... "

شعر میں ایسی مہارت، کلام پر اتنی قدرت اگر خسرو کے دل میں جذبات غرور اور فخر پیدا کر دیتی تو تعجب کی بات نہیں،

چنانچہ اسی دیباچے میں اپنے متعلق نظریہ انداز میں یوں گویا ہوتے ہیں :—

'' یہ بندہ خسرو خدای اقلیم بخش کی برکت سے اقلیم سخن میں یکہ و تنہا ہے ' اس کی ہر رباعی نہ افلاک پر نوبت پنجگانہ بجاتی ہے اور اس کی قلم کا خطی نیزہ جس پر اشعار رنگین کا آسمان سای پرچم لگا ہوا ہے ' گنبد فیروزۂ آسمان تک جا پہنچا ہے - اس کے شاہی سکے جن میں سے ہر ایک پورے چاند کی طرح کامل اور درخشاں ہے - شہر بہ شہر رائج ہیں ' نہیں بلکہ سورج کے قرص سیمین کی طرح اُنہوں نے مشرق اور مغرب کو تسخیر کر لیا ہے...دوراندیش دانا جانتے ہیں کہ اس کے کلام میں ایسی بلند پایہ کی نظم اور نثر ہے جو سوائے قرآن ' حدیث نبوی یا کلام علماے دین کے اور کسی کلام کی برتری کو تسلیم نہیں کر سکتی - ''

لیکن اُن نظریہ جذبات کے انفعال سے بھی خسرو کے لمحات فرصت خالی نہ تھے ' ہر روشن دماغ آدمی کی طرح اُنہیں کبھی کبھی اپنی یہ سعی بیکار محض اور یہ کامیابی ایک ایسا رنگین کھلونا معلوم ہونے لگتی ہوگی جسے دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں ' چنانچہ اسی انفعالی جذبہ کے ماتحت دیباچے کے خاتمے میں یوں لکھتے ہیں :—

'' سیاہ و سفید کی اس گہنگار جستجو میں میری ڈاڑھی جو کبھی سیاہ تھی سفید ہوگئی ہے اور میرا سفید چہرہ سیاہ ہو چکا ہے لیکن نادان بچوں کی طرح میں اس خیال سے اطمینان کی نیند سوتا ہوں کہ میری غزلیں بچوں اور بوڑھوں کو بیدار رکھتی ہیں ' میری مثال اس بچے کی سی ہے جسے نقل

سیکھنے کی غرض سے مکتب بھیجا جائے لیکن جو اس کی بجائے طفلانہ نے سواری کی طرف مایل ہو اور اس طرح عمر بھر تک پیادہ ہی رہے ' میں خوب جانتا ہوں کہ قلم کا صحیح استعمال یہ ہے کہ مذہبی علوم کی طرف اس کا رخ پھیرا جائے اور اس کی کسی اور فضا میں پرواز محض بازی طفلانہ ہے - میں بوڑھا بچہ ' وہ ہوں کہ میں اس نے کو جسے میں قلم کہتا ہوں گمراہی کے صحرا کی طرف دوڑاتا رہا ہوں اور نہیں جانتا کہ وہ مجھے دوزخ کے کس ویرانے میں لے جائے گی - میرے دل میں جب کبھی یہ تکلیف دہ خیال آتا ہے تو میرے تمام بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے ' میرے اس سیاہ نامۂ اعمال کے محو ہو جانے کی صرف یوں امید ہے کہ میرے عقیدے کے مطابق عفو (خدا) سحاب رحمت ہے اور رحمت ایزدی سرچشمۂ چشم پوشی اور اس بادل کے ایک چھینٹے یا اس چشمے کی ایک رو سے میرا نامۂ اعمال اور میں سیہ‌کار خود دونوں دھل کر پاک اور صاف ہو جائیں گے ' ورنہ میں تو اس کا مستحق ہوں کہ وہ نامہ میرے گلے میں لٹکا کر اور میرا منہ کالا کر کے مجھے دور و نزدیک پھرایا جائے اور پھر مجھے سپرد جہنم کر دیا جائے تاکہ میرا نامۂ اعمال اور میں دونوں جل کر راکھ ہو جائیں ''

دیوان بقیہ نقیہ میں خسرو کے اپنے بیان کے مطابق ترسٹھ قصیدے ' چھ ترجیعات ' ایک‌سو پینسٹھ بیت مثنوی کے ' دوسو قطعات اور پانچ‌سو ستر غزلیں اور تین‌سو ساٹھ رباعیات ہیں - قصائد زیادہ‌تر سلطان علاءالدین خلجی کی مدح میں ہیں ' لیکن چند میں قطب‌الدین مبارک شاہ کو بھی خطاب کیا گیا ہے ' بادشاہوں کے علاوہ بعض قصیدے اس زمانے کے

امرا مثلاً الماس بیگ اولوغ خان، تاج الدین دبیر، حمیدالدین، نصیرالدین عارض وغیرہ کی تعریف میں ہیں - اس دیوان کے بعض قصائد بھی پرانے اساتذہ کے جواب میں لکھے گئے ہیں مثلاً عبد الواسع الجبلی کے ایک قصیدے کا پہلا مصرع ہے:

که دارد چون تو معشوقی نگار و چابک و دلبر

خسرو کا ایک قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

کجا خیزد چو تو سروی جوان و نازک و دلبر

اسی طرح ظہیر فاریابی کا جو قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے کہ:

سپیدہ دم که زند ابر خیمه در گلزار

خسرو اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

سپیدہ دم که گہر بارد ابر در گلزار،

لیکن زیادہ تر قصیدے ایسے ہیں کہ جن میں خسرو نے اپنے کسی پیشرو کا تتبع نہیں کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس دیوان کی بعض نظمیں پختگی کلام، حسن ادا اور زور تخیل میں غرۃ الکمال کے قصیدوں سے بھی بازی لے گئی ہیں - چنانچہ اُن میں دو قصیدے ایک جو رمضان کے موقع پر لکھا گیا تھا اور جس کا مطلع ہے:

نوبہار امسال ما را روزہ فرماید ہمی

گل چنان تر دامن از می لب نیالاید ہمی

اور دوسرا قصیدہ عیدیہ جس کا مطلع ہے:—

عید است و ساقی در قدح صہبا ز مینا ریخته

در ساغر الماس گون لعل مصفا ریخته

صنعت شعر کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں -

ترجیعات میں ایک علاءالدین خلجی کے انتقال پر کہی

گئی تھی اور تین میں اس بادشاہ کو مخاطب کیا ھے - ایک الماس بیگ کی مدح میں ھے اور ایک میں ناصرالدین محمود کا مرثیہ ھے ' مثنویوں میں سے ایک خضر خان کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی اور ایک علاءالدین کے نام ایک عرض حال کی شکل میں ھے (۱) - غزلیات حمد سے شروع ھوتی ھیں - اس حمد کا انداز کچھ ایسا موثر اور دل پذیر ھے کہ اس کا جواب کہیں مشکل سے ملے گا - اس لیے اسے نقل کرتا ھوں :—

اے ز خیال ' ما برون در تو خیال کے رسد
با صفت تو عقل را لاف کمال کے رسد
گر همه مردم و ملک خاک شوند بر دوت
دامن عزت ترا گرد ملال کے رسد
کنگر کبریای تو هست فراز لامکان
طائر ما در آن هوا بی پر و بال کے رسد
بر در بی نیازیت صد چو حسین کربلا
تشنه بماند بر گذر تا بزلال کے رسد
هست به تخت گاه دل جلوهٔ قرب روز و شب
لیک بجلوهٔ چنان چشم خیال کے رسد
در چمنی که بلبلش روح قدس نمی سزد
گل خنیان خاک را بوی وصال کے رسد
توسن چابکان سبک عرصهٔ کوی نیکوان
آنکه فتاد مرکبش بر سر حال کے رسد

---

(۱) اس مثنوی کا ذکر اوپر ھوچکا ھے -

حربۂ رد عاشقان بر سر چون منی سزد
راہروان پاک را لوث وبال کے رسد
آیت رحمت از حرم ہست برای حاجیان
خسرو بت پرست را جز خط و خال کے رسد

خدا کی بےنیازی اور انسان کے بےبسی اور سعی لاحاصل کی تصویر الفاظ میں اس سے بہتر طریقے پر نہیں کھینچی جاسکتی ۔

علاءالدین خلجی کے مرثیے کے یہ چند بند بھی دل‌چسپی سے خالی نہ ہوں گے :—

کو آن سپہ کشیدن و کشور گرفتنش
گیتی بتخت خود بۂ لشکر گرفتنش (۱)
کو آن گرفتنش بہ سر کافران زمین
کو آن سران لشکر کافر گرفتنش
کو آن نہادنش سر مریخوان بخاک
وز صد ہزار سر ہمہ یکسر گرفتنش
کو آن بہ گوجرات فرستادنش سپاہ
دریا بموج قطرۂ خنجر گرفتنش
کو آن ہزار پیل و ہزاران ہزار اسپ
زینک ز بندگان مظفر گرفتنش
کو آن ز جود خود کہ امساکہای ابر
قحط از تمام روی زمین بر گرفتنش
کو آن ز خود رود کہ جہان گیرد آن کجا ستت
بنشستہ شرق و غرب سراسر گرفتنش

---

(۱) کذا ۔ یہ مصرع مشکوک ہے ۔

کو آن که اوج گهر شد آن شاه تازه ملک
از رو (؟) فرشته به شهر گرفتنش

از بس بزرگی که نه گنجید در جهان
شد زین جهان تنگ بسوی آن جهان روان

اے شب بر آفتاب چه بندی نقاب را
یک سو فگن ز نور اعظم سحاب را

چون روشن است برهمه عالم که کیست این
اے آسمان مپوش ز خاک آفتاب را

شاها بگو چگونه آخر که بندگان
حاضر نشسته اند ز بهر جواب را

در آرزوی روئی تو دریا ست چشم خلق
برخیز و رو بسوی فرو مال خواب را

هر خدمتت که باید آنجا سزای خویش
فرمای روح بهمن و افراسیاب را

اے سخت گردنان که ز تقدیر سر کشید
گو بنگرید این شه مالک رقاب را

بو القاسم است برسر خاکش شفیع تا
وز مکه و ز بولهب این بوتراب را

انجم که داشتند علای ز آسمان
هم ز آسمان سپرده بما انقلاب را

سلطان شهاب دنیا و دین یادگار اوست
ایزد چو او بلند کند این شهاب را

اینک ز صدق دل حق اخلاص او کنم
بهر دو شاه ختم سخن بر دعا کنم

آن مرغ عرش را بسر سدرہ جای باد
سدرہ ہمیشہ سایہ طلب زین ہمای باد
او را بگوش نغمۂ مرغان جنت است
این را بہ نزد زہرہ ترنم سرای باد
چون ظل آن محمد از آفاق شد نہان
این سایۂ خدا بجہان دیرپای باد
چو او ز جای بار بہ صف ملک رسید
این را ملوک صف زدہ دربار جای باد
او این سرای را چو بفرزند خود سپرد
وقف مداد مرقد او آن سرای باد
چون بر عمر رسید خلافت ز ملک او
ملک از خلافت عمرش عدل زای باد
تا بخت این سریر نشین پرورد بچرخ
سرہا بزیر پایۂ او چرخ پای باد
ہم از کمند نصرت و ہم از کلید فتح
ہموارہ بند خصم و ولایت کشای باد
در بالش سیاہ شہ این نور دیدہ را
از چشم بد ہمیشہ نگہبان خدای باد

جس خوبی سے خسرو نے اس آخری بند میں مرثیہ اور مدح کو ساتھ ساتھ نباہا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی -
خسرو کا یہ دیوان بھی اب تک شائع نہیں ہوا - قلمی نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں -

---

پانچواں دیوان : نہایۃالکمال

یہ دیوان خسرو نے سلطان غیاث‌الدین تغلق کے انتقال اور محمد تغلق کی تخت‌نشینی کے بعد یعنی اپنے انتقال سے کچھ عرصے پہلے ھی مرتب کیا تھا - دیوان کے ساتھ ایک بہت مختصر سا دیباچہ مرصع و مقفی عبارت میں موجود ھے جس میں حمد اور نعت کے بعد حضرت نظام‌الدین اولیا کے مناقب بیان کئے گئے ھیں - خود دیوان کے متعلق دیباچے میں کوئی ذکر نہیں ھے بلکہ اس کا نام یعنی "نہایۃ الکمال" بھی کہیں مذکور نہیں اور نہ اس دیوان میں اور دیوانوں کی طرح ابیات سلسلہ ھیں - یہ دیوان نادر ھے اور اب تک اس کے بہت کم نسخوں کا پتہ چل سکا ھے - برٹش میوزیم کے نسخے میں جو میری نظر سے گزرا بائیس قصیدے، پانچ ترجیعات، چار چھوٹی چھوٹی مثنویاں، متعدد قطعات، غزلیں اور رباعیاں ھیں -

قصائد میں مدح و نعت، حضرت نظام‌الدین اولیا کی توصیف، غیاث‌الدین تغلق شاہ اور اس کے بیٹوں، جونا خان، بہرام اور ابراھیم کی مدح ھے - لیکن چار قصیدے ایسے بھی ھیں کہ جن میں خسرو نے محض اخلاق اور تصوف کے مسائل بیان کئے ھیں اور جن کے نام خاص اشعار، راہ رھائی، عرف‌العرفان اور عین‌العبر ھیں - نظام‌الدین اولیا کی مدح میں جو قصیدہ ھے اس کا نام شاعر نے "ثابت النعت" رکھا ھے اور وہ ان کے جذبات عقیدت اور احساسات ارادت کا آئینہ‌دار ھے - ایک اور قصیدہ جو صحیفۃ الاوصاف کے نام سے موسوم ھے قابل ذکر ھے، کیونکہ اس میں خسرو نے دیوگیر کے شہر کے اوصاف بیان کئے ھیں - اسی طرح ایک اور قصیدہ جو سید تاج‌الدین کے نام

ہے، دلچسپی سے خالی نہیں - اس میں خسرو نے اس الزام کا پرجوش جواب دیا ہے جو ان پر بعض لوگوں نے اہل بیت رسول اللہ کے خلاف بےادبی کا عائد کیا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کی کسی منظوم یا منثور تحریر سے اس کا شبہہ پیدا ہوا تھا چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ :

شبہہ تو یقینی طور پر ہوسکتا ہے لیکن محض شبہہ پر کسی مومن کو ملزم گرداننا خلاف انصاف ہے -

ترجیعات میں سے ایک میں قطب الدین مبارک شاہ کا مرثیہ ہے، دو میں جونا خاں کی مدح ہے اور ایک میں اس کے بادشاہ ہونے کی تہنیت ہے، ایک ترجیع میں خسرو نے اپنے بیٹے حاجی کا مرثیہ کہا ہے - مثنویوں میں ایک تاج الدین کے نام بطور تعزیت کے خط کے ہے، ایک قطب الدین مبارک شاہ کی مدح میں ہے، ایک میں تغلق شاہ کو تغلق آباد کی تعمیر پر مبارک باد دی ہے اور ایک تاج الدین سپاہدار بن شمس الدین کے نام ہے -

قطعات میں خاص بات یہ ہے کہ بعض میں پہیلیاں کہی گئی ہیں، مثلاً اوسترے کی پہیلی یوں کہی ہے : دو چیزوں سے قائم جن میں سے ایک حیوانی ہے اور ایک نباتاتی وہ کونسا جسم ہے جسے دو حصوں میں شق کیا گیا ہے اور پھر جوڑا گیا ہے، جس کا پیٹ چاک ہے اور پیٹ میں زبان ہے اور جو بوڑھے کو ایک دم میں جوان بنانے کا سحر آفریں عمل کر سکتا ہے اور کبھی مشک کو تاراج کرتا ہے، کبھی کافور کو اور کبھی مشک اور کافور کو ایک ساتھ؟"

غزلیں بعض وہی ہیں جو پہلے دیوانوں کے ساتھ ہی شامل

ہیں لیکن بعض نئی بھی ہیں - کچھ غزلوں میں یہ التزام کیا ہے کہ ایک مصرع عربی کا ہے اور ایک فارسی کا - رباعیات میں آخری رباعی جس کا مفہوم یہ ہے بہت ہی پراثر اور رقت انگیز ہے :-

میرے گناہوں نے مجھے تباہ کر دیا - اے خدا میں کیا کروں ؟ دوست کی سیہ زلفوں نے میرے چہرے کو سیاہ کر دیا - اب میں کیا کروں ؟ مجھے امید ہے کہ تو میرے گناہ بخش دے گا - لیکن اس شرم کا کہ تو نے میرے گناہوں کو دیکھا ہے میں کیا کروں ؟

اس دیوان کے بعض قصائد میں بھی خسرو نے پرانے اساتذہ کے کلام پر طبع آزمائی کی ہے لیکن جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ' اس سے مقصد نقل یا تقلید نہیں بلکہ محض تفنن طبع اور دوستوں کی خواہش کو پورا کرتا تھا - مثلاً انوری کے ایک مشہور قصیدے کا جواب لکھا ہے - خسرو کا مطلع ہے :

سزد کہ سجدہ برندت کواکب از تعظیم
کہ آسمان بلندی ز احسن تقویم

انوری کا مطلع یوں تھا :-

بحکم دعوی زیج و گواہی تقویم
شب چہاردہم ذی الحجہ سنہ ثامیم (۵۴)

انوری کی طرح خسرو نے بھی اس قصیدے میں نجوم سے واقفیت کا خوب ثبوت دیا ہے - اور حق یہ ہے کہ انوری کا مقابلہ بہت کامیابی سے کیا ہے -

یہ دیوان بھی اب تک طبع نہیں ہوا -

گیارھواں باب

تاریخی مثنویاں اور خمسہ

—:o:—

ا۔ قران السعدین

اس مثنوی کا ذکر خسرو کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہو چکا ہے - اسے سنہ ۶۸۸ھ کے رمضان میں خسرو نے تین مہینے کی کاوش اور دماغ سوزی کے بعد مکمل کیا اور مثنوی میں یہ ان کی پہلی مستقل تصنیف تھی - اس کے لکھنے میں انھیں کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا - اول تو مثنوی کے میدان میں یہ اُن کا پہلا قدم تھا، دوسرے اتفاق سے مثنوی کا مضمون، یعنی باپ بیٹے کا جھگڑا، ایسا مہمل اور ناخوش آیند تھا کہ خسرو کو اسے دلچسپ اور دل‌کش بنانے کی سخت کوشش کرنا پڑی اور پھر بھی انھیں اپنی ناکامی کا احساس رہا اور اگرچہ مضمون کے پھیکےپن کو اُنھوں نے وصف‌نگاری کے دل‌کش نمونوں کی رنگ‌آمیزی سے چھپانے کی بہت سعی کی ہے تو بھی اُنھیں معذرتاً یہ کہنا پڑا کہ :

چون سخن از لطف نشانی نداشت　　کالبدش صورت جانی نداشت
وصف بر آن گونه فروراندہ ام　　کز غرض قصه فروماندہ ام
خال تکلف زدمش بر جمال　　نقش نماید مگر اندر خیال

لیکن خسرو کے اس اعتذار سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ وہ مثنوی میں اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہیں یا یہ کہ ان کی محنت کا یہ پہلا پھل شاعرانہ لطف و خوبی سے بالکل معرا ہے - یہ ضرور ہے کہ پوری نظم بحیثیت مجموعی بےجوڑ ہے لیکن اگر مثنوی کے قصے کو نظرانداز کر کے اس کے مختلف ٹکڑوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خسرو نے شاعرانہ پابندیوں اور پرانی روایتوں کی قید کے باوجود وصف‌نگاری میں ایسا کمال دکھایا ہے جو ان سے پہلے کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا تھا - ان ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ان سے ایک مجموعی حسن اور لطافت شاید وہ پیدا نہیں کر سکے ' لیکن ہر ٹکڑا اپنی جگہ پر ایک بےمثل اور نادر تصویر ہے - واقعہ یہ ہے کہ اس مثنوی کو لکھنے سے پہلے خسرو کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ خاص خاص چیزوں کے مرقعے ' شاعرانہ انداز میں پیش کریں اور اس مثنوی کو لکھتے وقت انھیں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کا موقع مل گیا - چنانچہ کہتے ہیں :

بود در اندیشۂ من چندگاہ کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم مجمع اوصاف خطابش دہم
باز نمایم صفت ہر چہ ہست شرح دہم معرفت ہر چہ ہست
بفگنم از جیب گہرہا بہ پیش تاجش خود سازم و دامان خویش
طرز سخن را روش نو دہم سکۂ این ملک بخسرو دہم
تو کنم اندازۂ رسم کہن پس روی پیشروان سخن

وصف‌نگاری کی اس خصوصیت کے ساتھ قران‌السعدین میں خسرو کی جدت پسند طبیعت نے بعض اور نئی باتیں بھی مثنوی میں پہلی دفعہ داخل کیں ' مثلاً ہر باب کا عنوان

شعر میں ہے گویا ابیات سلسلہ کی شکل یہاں بھی قائم رکھی ہے ۔ اس کے علاوہ مثنوی کی یکسانیت کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ ایسی غزلوں کا اضافہ کیا ہے جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتی ہیں ۔ خسرو نے مثنوی کو مکمل کرنے کے بعد اس میں کچھ اشعار بعد میں یعنی کوئی چار سال بعد اور بڑھائے ۔ اس اضافے کے دو مقصد تھے ایک تو مثنوی کے مضمون کی توضیح اور سبب نظم کی تشریح، دوسرے مثنوی کے ابیات کی تعیین اور ضبط ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نسخے میں چونکہ اشعار کی تعداد کا کوئی ذکر نہ تھا اس لیے ان کی مختلف نقلوں میں کچھ کمی بیشی ہوگئی تھی ۔ خسرو کہتے ہیں :

من چو نکردم عددش از نخست کم شد و سرمایہ نماندش درست
گشتہ ضرورت کہ کنونش بعقد بستم و دادم بہ امینان نقد

اس اضافے کے بعد مثنوی کے اشعار کی کل تعداد تین ہزار نو سو چوالیس ہوگئی، مثنوی کی بحر وہی ہے جو نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قران السعدین لکھتے وقت بھی نظامی کا خمسہ خسرو کے پیش نظر تھا ۔

تاریخی حیثیت سے مثنوی زیادہ اہم نہیں ہے لیکن اس سے اس زمانے کی معاشرتی حالت خصوصاً بادشاہوں اور امرا کے تکلفات زندگی کے متعلق بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ دہلی کی بعض عمارتوں مثلاً مسجد جامع، قطب مینار، حوض شمسی وغیرہ کا ذکر، شہر کی قبوں سے آرایش اور رقص و سرود کی محفلوں کے منظر، آلات موسیقی اور مختلف قسم کی کشتیوں کا بیان جن میں کیقباد اور بغرا خاں سرجو دریا کے ایک کنارے سے دوسرے تک آتے جاتے تھے،

کھانوں اور فواکہ وغیرہ کا وصف ' یہ سب باتیں خسرو نے بہت خوبصورتی سے پیش کی ہیں - نمونے کے طور پر یہاں چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے خسرو کا خاص اسلوب بیان جس میں حقیقت اور تخییل کی مناسب اور موزوں آمیزش سے ایک عجیب طرح کی دل‌فریبی پیدا ہوگئی ہے -

دف :—

صفت دف که درو دست کسان کوبد پای
صحن کژ داشته و کوبش پا بین بچه سان

دائرهٔ دف که حصاری ز چوب   صحن وی از پنج عروسک بکوب
زهره ز دورش بسرود آمده   چنبرش از چرخ فرود آمده
بسته جلاجل بهمه جا بجای   چون کمر چرخ جلاجل نمای
بر زبر دست گرفته نشست   گه زبر دست گهی زیر دست
چار زبان و دو زبان در دهان   نغز سخن لیک دوئی در زبان
هر سخن نغز که بادوست گفت   آن همه در پردهٔ و درپوست گفت
گشته دو رو لیک چو بر روی خورد   دسته خود همه یک رویه کرد
رویش ازین سوی و ازان سوی هم   گفتش ازین روی و ازان روی هم

کھانوں کا بیان :—

نان تنک صاف برآن گونه بود   کز تنکی رو بدگر سو نمود
نان تنک نیم که قرص خورست   عیسی اگر خوان بکشد در خورست
نان تنوری ز طرب قبه بست   زانکه بخوان شه عالم نشست
کاک در آن مرتبه رو ترش کرد   لاجرمش روی چنان مانده زرد
یافته سنبوسه ز تثلیث اثر   برهٔ بریان شرف از قرص خور
خواند زبان برهٔ پهلوی بز   بر سر پلاؤ که ملی ارز

چرب دم دنبهٔ دو من یک سره   چرب تر از دنبک آهوبره
پخته بسی مرغ بهرگونه طرز   از ولنج و تیهو و دراج و چرز
صحنک حلوا همه شکرسرشت   چاشنیش از طبقات بهشت
تختهٔ صابونی شکر نوید   راست چو جامه بسفیدی سفید
داده بسی طعم معنبر بران   خوردهٔ کافور تر و زعفران

پان :—

صفت برگ تنبول که نزد همه خلق
به ازان نیست نباتی بهمه هندوستان

برگ تنبول که صد برگ بهست   چون گل صد برگ بیاید بدست
نادره برگی چو گل بوستان   خوبترین نعمت هندوستان
تیز چو گوش فرس تیزخیز   صورت و معنی بصفت هر دو تیز
تیزی ازو یافته گوش دگر   داده بهرگوش ز تیزی خبر
تیزی او آلت قطع حرام   قول نبی رفته علیه السلام
پر رگ و در رگ نه نشانی زخون   لیک هم از رگ دهدش خون برون
طرفه نباتی که چو شد در دهن   خونش چو حیوان بدر آید ز تن
خوردن آن بوی دهن کم کند   سستی دندان همه محکم کند
سیر خورد گرسنه مردم شود   گرسنه را گرسنگی کم شود
سرخی رویش ز سه خدمت گرش   چونه و فوفل شده رنگ آورش
گرچه که آبش بذوی هست بیش   کهنه شود بیش کند آب خویش
گرچه که از آب شود زردرو   لیک ز زردیش بود آبرو
برگ که باشد بدرختان فراخ   زود شود خشک چو افتد ز شاخ
برگ عجب بین که گسسته ز بر   روز پس شش ماه بود تازه تر
حرمتش از پیشگه و پایگاه   هم بگدا محترم و هم بشاه

رقاصہ عورتیں :—

شد زن مطرب به نوا پروری | انجمنی پر ز مه و مشتری
پرده برانداخته چون آفتاب | کرده به یک غمزه جهانی خراب
روی چو خورشید برافروخته | جان کسان زآتش خود سوخته
از رخ شان کآمده مقنع ورود | رفته بچه ماه مقنع فرود
ز ابروی خم پشت کمان ساخته | تیر مژه نیم‌کش انداخته
بسته بلادر * همه درش بلا | داده به بیهوشی عالم صلا
رشتهٔ دربسته برو از دو سوی | چون قطرات عرق از گرد روی
جعد که پیچیده بپا در خرام | ماهی ساق آمده در پای دام
بر زمین افگنده چو گیسوی خویش | رفته ره خویش هم از موی خویش
قامت شان بوده به پاکوفتن | گیسوی مشکین بزمین روفتن
رقص کنان چون بزمین پا زدند | در حق ناهید لگدها زدند
از روش جنبش دستان شان | مجلسیان هر همه حیران شان
هر که درآن شعبده هشیار بود | مست نه از می که از دیدار بود

مغل قیدی :—

کافر تاتار برون از هزار
کرده دگر گونه باشتر سوار
سخت سرانی دغا سخت کوش
هر همه پولاد تن و نمد پوش

---

* بلادر داروے از سمیات است که آنرا بهلاوه گویند و نام زیور نیست که زنان برسر بندند

قران السعدین مطبوعهٔ علی گڑھ

روی چو آتش کله از پشم میش
آتش سوزان شده با پشم خویش

سر بتراشیده ز بهر قلم
زان قلم انگیخته خذلان رقم

رخنه شده طشت مس از چشم تنگ
دیده درانداخته در رخنه سنگ

زشت‌تر از زنگ شده بوی شان
پست‌تر از پشت شده روی شان

چهرهٔ شان دبهٔ نم یافته
جای بجا کاچلک و خم یافته

از رخ تا رخ شده بینی پهن
وز کله تا کله لبالب دهن

بینی پر رخنه چو گوری خراب
یا چو تنوری که ز طوفان آب

موی ز بینی شده بر لب فراز
سبلت شان گشته بغایت دراز

ریش نه پیرامن چاه زنخ
سبزه کجا بردمد از روی یخ

گشته بلی گو همه پر بانگ نی
همچو زنان نوحه کنان پی به پی

کوه تنالی بشتر کرده جای
کوه شده بر سر کوهان بپای

شه بعجب زان همه روهائی زشت
کایزد شان ز آتش دوزخ سرشت

دیو سپید آمدہ ہر یک بروی
خلق بلاحول ز ہر چار سوی

مثنوی قران السعدین نولکشور پریس لکھنؤ میں اور اس کے بعد علی گڑھ میں کلیات خسرو کے سلسلے میں شایع ہو چکی ہے۔

۲ - مفتاح الفتوح

یہ مثنوی خسرو نے جلال الدین فیروز خلجی کے عہد میں لکھی تھی اور اسی بادشاہ کی فتوحات کے ذکر پر مبنی ہے۔ جو جمادی الثانی سنہ ۶۹۰ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ خسرو کی اور تاریخی مثنویوں کے مقابلے میں یہ مثنوی بہت مختصر ہے اور غالباً اسی لیے خسرو نے اسے دیوان غرۃ الکمال کے ساتھ شامل کر دیا تھا لیکن تاریخی حیثیت سے مثنوی کی اہمیت میں کوئی شبہہ نہیں بلکہ دو خصوصیتیں اس میں ایسی ہیں جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے بہت قابل قدر ہیں - یعنی ایک تو اس مثنوی کی سادگی زبان اور صنائع اور بدائع کی زیادتی سے اس کا معرا ہونا اور دوسرے واقعات کو بلا مبالغہ اور بغیر حشو و زواید کے پیش کرنا، چنانچہ خسرو اس کے متعلق خود کہتے ہیں کہ :

" جب میں نے اس مثنوی کو شروع کیا اور اپنی قلم کو لکھنے کے لیے تیار کیا تو میں نے (کسی حد تک) اسے مرصع ضرور کیا، کیونکہ شاعرانہ کلام کے لیے یہ چیز ضروری ہے، لیکن جب میں نے کسی ایسی چیز کو اس میں شامل کرنے کا قصد کیا جو واقعے سے بعید تھی تو سچائی نے آکر میرا ہاتھ روک دیا۔ خود میرے نفس نے بھی یہ پسند نہیں کیا کہ سچ کے ساتھ جھوٹ کو بھی شامل کیا جائے کیونکہ جھوٹے مبالغے سے اگرچہ

دلفریبی پیدا کی جا سکتی ہے تاہم سچ بھی خاص دلکشی رکھتا ہے"

مثنوی میں جیسا کہ اختصار سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے فیروز خلجی کی چار فتوحات کا ذکر ہے' ایک تو ملک چھجو کی بغاوت اور اس کی سرکوبی' دوسرے اودھ میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں' تیسرے مغلوں کی سرزنش اور شکست اور چوتھے جھاین کی فتح' ان سب مہموں کے واقعات خسرو نے بلا کم و کاست پیش کر دیے ہیں اور صحت بیان اور تمام حالات سے پوری واقفیت کو جو خسرو کو بادشاہ کے قرب کی وجہ سے حاصل تھی' اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس مثنوی سے بڑھ کر فیروز خلجی کے عہد کی اور کوئی تاریخ مستند نہیں سمجھی جا سکتی -

دیوان غرۃالکمال کے زیادہ‌تر قلمی نسخوں میں یہ مثنوی موجود ہے' لیکن اب تک شائع نہیں ہوئی - قران‌السعدین کی طرح اس مثنوی میں بھی ابیات سلسلہ موجود ہیں -

۳ - عشیقہ یا خضر خاں و دول‌رانی

اس مثنوی کو بعض دفعہ عشقیہ بھی کہا جاتا ہے اگرچہ زیادہ صحیح نام عشیقہ ہی ہے ایک اور نام "منشور شاہی" بھی ہے جو شاعر کے اس بیت سے ماخوذ ہے :

بحمد اللہ کہ از عون الٰہی بپایان آمد این منشور شاہی

یہ مثنوی جسے خسرو نے ذوالقعدہ سنہ ۷۱۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا' خضر خان اور دیول دیوی کے قصۂ عشق و محبت پر مشتمل ہے' یہ قصہ ہندوستان کی تقریباً ہر تاریخ میں مذکور ہے - اس لیے اسے مفصل لکھنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے' خسرو نے جس صحت بیان اور سچائی کو مفتاح

میں مد نظر رکھا ہے اسے اس مثنوی میں بھی ہاتھ سے نہیں دیا؛ اگرچہ اسلوب تحریر اس مثنوی سے بہت مختلف اور مثنوی قران السعدین سے بہت مشابہ ہے - ایک شہزادے اور ایک حسین راج کماری کی محبت کی داستان بجائے خود ایسا مضمون تھا کہ اسے روکھے پھیکے الفاظ میں ادا کرنا مناسب نہ تھا کیونکہ یہ قصہ اگر نثر میں بھی لکھا جائے تو بہت کچھ شعریت یا شاعری اس میں پیدا ہو جائے گی، اسی لیے خسرو نے اس میں شاعرانہ بلند پروازی، صنائع اور بدائع، قوت تخییل اور محاکات، ان سب ہی ذرائع کو استعمال کیا ہے جس سے قصے کی دلچسپی اور (موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق) ''رومانیت'' میں اضافہ ہو سکتا تھا، لیکن اس داستان کو ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ اول تو یہ کسی قدیم اور روایتی قصے پر مبنی نہیں بلکہ خسرو کا اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ ہے، دوسرے داستان کے واقعات خسرو[1] کو خود خضر خان کی زبانی اور اس کی اپنی تحریر سے معلوم ہوئے اور اس طرح وہ تمام جزئیات، عاشقانہ نیاز اور معشوقانہ ناز، دو دلوں کی پنہاں طپش اور باہمی کشش، امید اور بیم، مد و جزر غرض کہ وہ واردات قلبی ہی جسے صاحب معاملہ ہی جان سکتا ہے اور اگر طاقت گویائی رکھتا ہے تو بیان کر سکتا ہے، خوش قسمتی سے شاعر کو مل گئے اور پھر شاعر بھی خسرو کا سا معجز بیان - قصے میں جتنی بھی دل کشی اور جاذبیت پیدا ہو جائے تعجب نہیں - اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو خوبی خسرو کی اس مثنوی میں نکلتی ہے وہ اس قسم کی اور مثنویوں میں موجود نہیں - دوسری صفت اس مثنوی میں یہ ہے کہ باوجود ایک

عشقیہ قصے پر مبنی ہونے کے خسرو نے اس میں جو بڑی تھوڑے بہت تاریخی واقعات بیان کئے ہیں وہ بہت ہی صحت اور وضاحت کے ساتھ کئے ہیں جو ان کا خاصہ ہے اور ان کی تحریر کا طرۂ امتیاز - اس کے علاوہ مثنوی نُہ سپہر کی طرح جس کا ذکر آگے آئے گا، اس مثنوی میں بھی خسرو کا جذبۂ وطن پرستی بہت نمایاں ہے - ہندوستان کی ہر ایک چیز، یہاں کی آب و ہوا، پھول، پھل یہاں کی عورتوں کا حسن ملیح جو بقول ان کے خلخ اور یغما کی سرخ و سپید عورتوں کی طرح صرف رنگ ہی نہیں رکھتیں اور نہ ان کی طرح ایک برف کے تودے کی طرح سرد ہیں بلکہ بو بھی رکھتی ہیں یعنی ایک آن اور شان بھی ان میں نکلتی ہے - غرض یہ کہ یہاں کی سب باتوں کو سراہا ہے اور ان کی فضیلت دوسرے ملکوں کی چیزوں کے مقابلے میں ثابت کی ہے، چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس مثنوی میں خسرو نے کئی ہندی الفاظ کو فارسی میں بہت خوبصورتی سے کھپایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ خضر خاں نے جو مسودہ اپنی داستان کا انہیں دیا تھا اس میں بہت زیادہ ہندی الفاظ تھے، ان سب کو فارسی نظم میں نباھنا مشکل تھا؛ اس لیے بہت سے انہوں نے بدل دیے لیکن اب بھی کئی لفظ مثلاً سنگھاسن، دیوگیری بعض سازوں اور پھولوں وغیرہ کے نام ہندی شکل ہی میں موجود ہیں - ایک اور پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ مثنوی میں کئی چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں بیان کی ہیں - غزل کے ٹکڑے بھی ہیں لیکن وہ حقیقی غزل کی شکل میں نہیں ہیں بلکہ مثنوی کی بحر ہی میں جو بحر ہزج مسدس محذوف ہے لکھے گئے ہیں اور ابیات سلسلہ بھی اس مثنوی

میں نہیں ہیں -

عشیقہ کو خسرو نے خضر خاں کی زندگی ہی میں مکمل کر لیا تھا لیکن جب ملک کافور کے ایما سے اس بدنصیب شہزادے کو گوالیار کے قلعے میں نظربند کر دیا گیا اور اس کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے اسے قتل کرادیا تو خسرو نے مثنوی میں اضافہ کر کے ان سب واقعات کو بھی بڑھا دیا - یہ اضافہ غالباً مبارک شاہ کے بھی انتقال کے بعد کیا گیا تھا اس لیے کہ خسرو اس میں اس بادشاہ کے لیے بےمہر کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو بادشاہ کی زندگی میں ممکن نہ تھا ، علاوہ ازیں اضافے کے اشعار میں خسرو نے اس عقیدت اور دلی لگاؤ کو جو انہیں خضر خاں سے تھا صاف صاف ظاہر کیا ہے جو یقیناً مبارک شاہ کو بہت ناگوار گزرتا - مثنوی کے اصل حصہ میں جو خضر خاں اور دیول دیوی کی شادی پر ختم ہوتا ہے کل ۴۲۰۰ بیت تھے ، یہ حصہ ذوالقعد سنہ ۷۱۵ھ میں ختم ہوا - اضافے میں کل ۳۱۹ شعر ہیں اور اس طرح مثنوی کے موجودہ اشعار کی تعداد ۴۳۱۹ ہو جاتی ہے -

مندرجۂ ذیل چند اشعار سے اس مثنوی کے اسلوب کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے :—

(خضر خاں اور دوَل رانی کے عشق کا آغاز)

چہ خوش باشد در آغاز جوانی
دو بیدل را بہم سودائی جانی

گہ از ابرو بیان راز کردن
گہ از مژگان عتاب آغاز کردن

گهی از گوشهای چشم خواندن
گهی از دورباش غمزه راندن
ازین جان دادن و ازوی ربودن
وزین گفتن جفا وز وی شنودن
ازین با خویش خون در گریه خوردن
ازو زیر لب بدزدی خنده کردن
ازین کندن بحسرت سینهٔ ریش
ازو دیدن ندادن ره سوی خویش
ازین در پیش محرم غم کشادن
ازو پائی رقیبان بوسه دادن
ازین شوخی ازو در غم نشستن
ازین زاری و زو رو برشکستن
ازو ناوک درون جان گرفتن
بصد جان لذت پیکان گرفتن
خضر خان و دول رانی درین کار
دو دل بودند یک دیگر گرفتار
کنون حرفی که من خواندم درین لوح
چنین بخشد بدلها راحت و روح
که چون آمد دول رانی بدرگاه
بشارت یافت از بخت نکو خواه
برسم بندگی بر پای می بود
بفرش خاص جبهت سای می بود
بفرخ روزی اندر خلوت قصر
خضرخان را بخواند اسکندر عصر

اشارت کرد بانوئی جہان را
که بیرون افگند راز نہان را
خلف را از خلیفه گوید این راز
که گشتست بخت و دولت کار پرداز
دول رانی خجسته دختر دون
که ناورد چرخ چون آن مه بصد فون
شد است از بهر تزویجت مهیا
که گردد خانه زان ماهت ثریا
چو خان را آمد این دیباچه در گوش
ز شرم شاه بانو ماند خاموش
درآن شرمندگی ز ایوان برون رفت
و لیکن مهرش اندر جان درون رفت
درآندم بود خان ده ساله و راست
که این هنگامهٔ شادیش برخاست
دول رانی بقدر هشت ساله
درفته ماه را بسته کلاله
همه دندانش مست شهد بد راست
ازین مستی همی افتاد می خاست
برادر داشت در هر وصف شایان
چراغ افروز گوهر هائی رایان
بصورت اندکی با خان کشور
مشابه بود هم چون روی با زر
نمیدانست چون او نیک و بد را
گمان بردی برادر جفت خود را

و لیکن بود خان اعظم آگاہ
که از نه طاق جفت اوست آن ماہ
ببازی بود شان عشقی که یکدم
نبودندی جدا در بازی از ہم
نه بد چون عشق در بازی مجازی
شد آن بازی بآخر عشق بازی

(خضر خاں کی شادی پر دول رانی کا اضطراب اور اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش)

غمی بود آن پریوش را در آن سوز
که شبہایش بدشواری شدی روز
چو شب رایت برآوردی بعیوق
چو روز عاشق و گیسوی معشوق
چراغ دل ہمہ شب داشته پیش
نخواندی جز نہانی قصهٔ خویش
نبشتی با ہزاران داغ دوری
بخون دیدہ تعویذ صبوری
دلش پیش چراغ افسانه گفتی
گداز شمع با پروانه گفتی
دل خود را فریبی داد از ناز
بلوک غمزہ کردی زلف را باز
که گر غم پرسی من می پرسدم کم
چه که دارم ز خوبی تا خورم غم
ہنوز از شاخ سبزم بر نرسته است
ہنوز این سبزہ را شبنم نشسته است

هنوزم فتنہا در مو نہفتہ است
هنوزم لالہ در رو ناشگفتہ است
هنوزم طرہا شوریدہ کارند
هنوزم غمزہا خنجر گزارند
هنوزم ابروان محکم کمانند
هنوزم چشمہا پیکان نشانند
هنوزم نرگس خون‌ریز مستست
هنوزم زلف کافر بت پرستست
نہازادہ است آفت را جمالم
نہای همتن فتنہ است خالم
لبم هم شہرۂ تنگ نباتست
رخم همچشمۂ آب حیات ست
خریدارم من ار با این نکوئی
ندارد رغبتی از مہر جوئی
بجہدش باد صد زیبا رخ عہد
هم از دامان پاک من مرا مہد

ایک تمثیلی حکایت :—

شنیدم هندوی آتش پرستی
مگر کز عشق آتش گشت مستی
ز خود پرکالہ پرکالہ بپاے
همی برید و می افگند سوئی
یکی گفتش چہ مہر است اینکہ جانی
دهی بہر چنین نامہربانی

جوابش داد مرد غم کشیده
که اے سوز من دودی ندیده
دریغی نیست جان را پوست دادن
نواله در دهان دوست دادن
کسی کز عاشقی زینسان نسوزد
مده پروانه کهن آتش فروزد
بدست خود نهم من وزنه خود را
بسوزم از پئی نام ابد را
که گردد این حکایت درجهان فاش
وزان شعله زند داغی باوباش
که ناگه هندوی آتش برافروخت
مسلمانی درآن چو هندوان سوخت

مثنوی خضر خان و دول رانی بھی علی گڑھ سے خسرو کی اور مثنویوں کے ساتھ شایع ہو چکی ہے ۔ مولوی رشید احمد انصاری صاحب نے بہت ہی اہتمام اور جانفشانی سے کئی نسخوں کے مقابلے کے بعد اس کا متن تیار کیا تھا اور تمہید کے طور پر مثنوی کی اہم خصوصیات کا ذکر اور اس کا باقاعدہ تجزیہ بھی متن کے ساتھ شامل کر دیا ہے جو قابل دید ہے ۔

۴ - نہ سپہر

مفتاح الفتوح کی طرح خسرو کی یہ تاریخی مثنوی بھی اب تک نہیں چھپی ، حالانکہ نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی یہ مثنوی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ عجیب علاءالدین کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہوا تو اسے جہاں نامآوری اور شہرت

کے لوٹنے اور چھوڑنے کا خیال پیدا ہوا وہاں یہ بھی شوق ہوا کہ کوئی بڑا شاعر اس کے عہد کے واقعات کو منظوم کرے اور اس کے صلے میں اس نے ہاتھی کے وزن کے برابر سونا تول کر دینے کا وعدہ کیا - ظاہر ہے کہ خسرو کے سوا اور کون یہ کام سر انجام دے سکتا تھا چنانچہ بادشاہ کی نظر انتخاب ان پر ہی پڑی اور اس نے ان کو ایک خاص قاصد کے ذریعے سے دربار میں بلا بھیجا اور خلعت اور انعام اکرام دے کر ان سے مثنوی لکھنے کی خواہش کی ۔ چنانچہ خسرو نے اس کام کو اپنے ذمے لے کر جمادی الاول سنہ ۷۱۸ھ میں جب ان کی عمر تقریباً سرسٹھ سال کی تھی پورا کیا اور بادشاہ کی نذر کیا - اس کے صلے میں واقعی انہیں ہاتھی کے وزن کے برابر سونا ملا یا نہیں ؟ یہ امر مشتبہ ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس بادشاہ نے خسرو کی جتنی قدردانی اور ہمت افزائی کی اتنی پہلے کسی بادشاہ نے نہ کی تھی ۔ خسرو کہتے ہیں کہ :-

چنیں بخششی کز تو جم یافتم ز شاہاں پیشینہ کم یافتم

اس مثنوی کو خسرو نے نو حصوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے بعض بڑے ہیں بعض چھوٹے اور ہر ایک حصے کو ایک سپہر مانا ہے جو کسی نہ کسی ستارے سے متعلق ہے ؛ اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک سپہر ایک مختلف بحر میں ہے مثنوی کے کل اشعار پانچ ہزار چار سو نو ہیں (۱) - مختلف بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال خسرو کی

---

(۱) میری انگریزی تصنیف میں (ص : ۱۸۱) یہ تعداد مصرعوں کی بتائی گئی ہے جو غلط فہمی پر مبنی ہے -

جدت ہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس سے مثنوی کی یکسانیت میں جس سے اکثر پڑھنے والا گھبرا جاتا ہے ایک بہت خوش‌گوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے ۔ مثنوی میں ابیات سلسلہ بھی ہیں اور ہر ایک سپہر ایک غزل پر ختم ہوتا ہے ۔ خسرو نے جو بحریں اس مثنوی میں استعمال کی ہیں وہ سپہروں کے اعتبار سے علی‌الترتیب یہ ہیں ۔

(۱) متقارب مثمن محذوف (۲) متقارب مثمن سالم
(۳) رجز مسدس مطوی (۴) رمل مسدس محذوف
(۵) خفیف مسدس مخبون و محذوف
(۶) ہزج مسدس مقصور و محذوف (۷) رمل مسدس مقصور
(۸) ہزج مسدس اخرب مقبوض و محذوف
(۹) رمل مسدس مخبون و محذوف ۔

ان بحروں میں سے بعض یقیناً ایسی ہیں کہ جو خسرو سے پہلے کسی نے استعمال نہ کی تھیں مثلاً نمبر ۲ اور ۳ ، اور نمبر ۳ میں نہ صرف اُنھوں نے ایک بہت ہی مشکل بحر کو خوبصورتی سے نباہا ہے بلکہ زیادہ تر قافیوں میں صنعت اعنات یا لزوم ما لایلزم کو بھی مد نظر رکھا ہے جو ان کی قدرت کلام کا بدیہی ثبوت ہے ۔ سپہروں کے حساب سے مثنوی کے مضامین مختصر طور پر یوں ہیں :—

پہلا سپہر ۔ حمد ، نعت ، منقبت حضرت نظام‌الدین اولیا ، مدح بادشاہ ، بادشاہ کی تخت‌نشینی کا بیان اور مثنوی کے نظم کرنے کی وجہ ، مبارک‌شاہ کا خسروخاں کی سرکردگی میں جنوب کو مہم روانہ کرنا اور خسروخاں کا راجہ رام‌دیو کے سرکش نائب راگھو کی سرکوبی اور سرزنش کے بعد واپس

دہلی آنا -

دوسرا سپہر : قطب الدین مبارک شاہ کی بناکردہ عمارتوں کا بیان ، تلنگ اور وارنگل کی مہموں کا ذکر ، دہلی کی تعریف اور اس کی نضیلت ، بغداد ، قاہرہ خراسان ، ترمذ ، تبریز ، اصفہان ، بخارا اور خوارزم پر - یہ سپہر جیسا ابھی بیان ہو چکا ہے بحر متقارب مثمن سالم میں ہے جس سے ایک عجیب طرح کا ترنم اور موسیقیت پیدا ہوگئی ہے -

تیسرا سپہر : یہ سب سے بڑا بھی ہے اور سب سے اہم بھی - اس میں تقریباً ہندوستان کی ہر ایک چیز کو سراہا گیا ہے اور ضمناً یہاں کے باشندوں کی ذہانت ، استعداد علمی ، زبانوں ، رسم و رواج ، مذہبی عقائد وغیرہ کے متعلق بہت دلچسپ معلومات دیے گئے ہیں - آخر میں وارنگل کی مہم ، ہر پال دیو کی شکست ، خسرو خاں کی مظفر و منصور فوج کی دہلی واپسی اور خوشی کے جشن کا بیان ہے -

چوتھا سپہر : پند و نصائح پر مشتمل ہے ، بادشاہ سے لے کر رعیت کے ادنی آدمیوں تک سب ہی کو خسرو نے بہت صاف گوئی اور دلیری سے خطاب کیا ہے اور انہیں ان کے فرائض سمجھانے کی کوشش کی ہے -

پانچواں سپہر : ہندوستان کے جاڑے کی توصیف ، بادشاہ کا شکار اور سیر کے لیے جانا ، بادشاہ کی کمان اور تیر میں عشق و محبت کے راز و نیاز - اس آخری حصے میں خسرو نے صوفیوں کے نقطۂ نظر سے محبت کو تمثیلی پیرایے میں خوب بیان کیا ہے - اگرچہ یہ حیثیت مجموعی یہ سپہر بے مزہ

اور پھیکا ہے -

چھٹا سپہر : شہزادہ محمد کی سنہ ۸ ۷۱۸ھ میں پیدائش زایچہ اور فالنامہ ' شہزادے کی تعلیم اور اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی اور دعائے خیر - اس سپہر میں خسرو نے اپنے علم نجوم کا خوب مظاہرہ کیا ہے -

ساتواں سپہر : موسم بہار کا بیان ' شہزادہ محمد کی پیدائش پر دہلی کی آرائش اور خوشی کے جشن ' شراب اور آلات موسیقی کا بیان ' یہ سپہر بہت دلچسپ ہے -

آٹھواں سپہر : پانچویں سپہر کی طرح یہ بھی بے لطف ہے ' اگرچہ اس میں بھی عشق حقیقی کے مسائل کو چوگان اور گیند (گوی) کے مناظرے کی صورت میں خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے اور کہیں کہیں غزلیں ٹکڑے اچھے ہیں -

نواں سپہر : مثنوی کا خاتمہ ' دہلی کے شعرا کی اور خود اپنی ستائش ' مثنوی کی تعریف ' خامیوں کے لیے معذرت وغیرہ - یہ سپہر خاصا دلچسپ ہے -

نمونے کے طور پر مثنوی میں سے چند ٹکڑے یہاں پیش کرتا ہوں -

ارم کدہ (ہاتم یا آتم کدۂ) کا بیان : (دوسرا سپہر)

بنزدیک قلعہ است ارم کدہ جای
بلند و نمایندہ نزہت فزای
سوی راستش از بلندی بر آمد
چنان کش نظار سوئی آن منظر آمد
نگہ کرد و دید آسمان وش حصاری
نہ پیدا میان زمینش کناری

به پیرامنش چشمهٔ و باغ و بستان
فزایندهٔ عیش عشرت پرستان
همه میوه اش نغزک و موز و کتهلی
نه چون سیب یبس و خشک چون سفرجل
هر آن بو که آمد ازان سو بپاے
همه بوی گلهای هند زد از وی
همه چمپه و کیوره بوی در بوی
همه بیل گل در گل و روی در روی

دہلی کی بعض عمارتوں کی تعمیر : (دوسرا سپہر)

رسیدند بنیاد کاران دانا • به پل بر رخ باد بستن توانا
گزی بر کف و رشتهٔ هم نهفته • که عالم بیدار و در سهر خفته
بهر سو که فرمود گز را اشارت • عمود ترازو شده در عمارت
بهر جا که آن رشته را ساز بسته • رگ جان سنمار نعمان گسسته
بهم پی مهیا شد اسباب چندان • که ناید در اندیشهٔ هوشمندان
بهر سوی گردون شد اندر دویدن • بباری که گردون نیارد کشیدن
ببالائی گردون زحل کرده خانه • دو چرخی فرود از دو ثورش روانه
زحل رانده دو ثور را غیر پالان • ز آثار دو ثور دو چرخ نالان
بیاوردن سنگ مزدور سنگین • سلب کرده از گرد شبرنگ رنگین
بهر سوی رازی شده کارسازی • ملک زادهٔ کارفرمائی رازی
به تعجیل کردند اندک اساسی • که باشد اساس عمل را قیاسی
چو محراب بیت الخلافه برآمد • در آمد خلیفه چو جمعه درآمد
درو روز آدینه را کرد گلشن • ز نور تعبد چو خورشید روشن

مال غنیمت کے ہاتھی : (تیسرا سپہر)

باز نمودند بختم الخلفا آمدن مروه و اسباب صفا

کرد اشارت شه خورشید ظفر کآمدها بگردش پیش نظر
خیل سراپرده برآمد به هوا تعبیهٔ پیل درآمد به نوا
دبدبه زد دهل پوشیده دهان گشت کر از طاسک و کرنای جهان
شد گزران کوه گرانمایه به تگ رشته گسل گشته زمین را همه رگ
پیل همه ژنده که گر که سپرد دامن کهسار چو ژنده بدرد
کوه گران سنگ سبک سیر چو که سایهٔ او نیز گران گشت به ره
جل بریشم بتنی همچو جهان پیل شده در بچهٔ پیله نهان
پرچمش از گوش شده تا بزمین همچو مگس ران که بنا گوش نشین
مرد که بر پشت نگهبان بودش چون ملکی کابر بفرمان بودش
گشته کزک حاکم او گاه گهی بر صفت عاقلهٔ پیش تهی
اژدر و ماری ز پس و پیش نگون پیش عزیمت گرو از پس بفسون
بینی او بیخ کن و شاخ شکن بلکه بکین تیغ زن و تیر فگن
تیر فگن چشم بتانست بسی تیر فگن بینی کم دیده کسی
برج رود در زمین از تبش او قلعه بخندق فتد از جنبش او
تپ تپ پایش که برفتن شده گم تپ تپهائی دگرش در ته دم
در صفت پیل چو گشتم نگران دل سبکم گشت و شد اندیشه گران

ہندوستانی گانے والیاں :—

لعبتان هندوی هم جا بجای گشته هم پاکوب و هم نغمه سرای
هر یکی را گاه قتل معنوی خنجر هندی زبان هندوی
این کشیده سرمه از دود چراغ دودهٔ او کرده در صد سینه داغ
او به پیشانی ز صندل داده رنگ سوی سیم آورده صندل را ز سنگ
این سرودی گفت کآهو گه بدشت بشنود نارد بصحرا بازگشت
او الاون را چنان بنواخته کآب حیوان را ببرود انداخته
این گرفته تال روئین را بدست زان دو روی او همه یکرویه مست

او کشیدہ تار پولادین بساز کآهنین دلها فتادہ در گداز
این بہ نغمہ زهرۂ کیوان نسب آن بزیبائی مہ زهرہ طرب
این ز لعل آب دار آتش نشان او بکفت سوز ناک آتش فشان
این میان شانہ مویش تا میان او میان چون موی ودرمویش نہان
این چو طاووسان هندی جلوہ گر او معلق زن چو مرغش از زبر
این شدہ گردان بسرعت همچو ماہ او بگردش ماہ را بردہ ز راہ
این ز مو مرغول کردہ در قفا کردہ زان موغول بر خلقی جفا
او برآمودہ بہ مروارید فرق آشنا صدگان دران هر قطرہ غرق
این ز بینی گوهری آویختہ گوهری از خنجری آویختہ
او جواهر بر جبین آراستہ هم چو پروین بر مہ ناکاستہ
هر پری بر تن لباس دیو گیر پرنیان را سایہ بر تن زان حریر
این چنین خوبان جمال دور ماہ بس کہ می بردند هرکس را ز راہ
زان شغبها کز کرانها می زدند آشکارا راہ جانها می زدند

۵ - تغلق نامہ

تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی یہ آخری مثنوی خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ عرصے پہلے تصنیف کی تھی اور اگرچہ اس کا ذکر اکثر تذکروں میں موجود تھا لیکن ابھی حال کے زمانے تک کوئی نسخہ اس کا دستیاب نہ ہوسکا تھا اور اس لیے یہ خیال کر لیا گیا تھا کہ خسرو کی یہ تصنیف دستبرد زمانہ سے ہمیشہ کے لیے مفقود ہوچکی ہے - لیکن اتفاق سے مولوی رشید احمد صاحب کو حبیب الرحمن خان شیروانی کے کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ ملا جس کا عنوان "جہانگیر نامہ" تھا اور اُنہوں نے اس نسخے کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ جہانگیر نامہ نہیں ہے اور نہ جہانگیر کے ہمعصر شاعر

حیاتی کی تصنیف ہے بلکہ وہی گم شدہ تغلق نامہ ہے جس کا ہندوستان یا یوروپ کے کتب خانوں میں کہیں کھوج نہ ملتا تھا - مثنوی کے ابتدائی اشعار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہانگیر کے زمانے میں یہ مثنوی نامکمل حالت میں کہیں ملی تھی یعنی شروع اور آخر کے حصے موجود نہ تھے، جہانگیر نے اپنے دربار کے شاعر حیاتی سے کہا کہ وہ مثنوی کو مکمل کر دے، اس واقعے کو حیاتی نے یوں لکھا ہے :—

ازان دفتر ولی ز آغاز و انجام
سخن را نی نشان نی قصہ را نام
شد از حضرت اشارت کای فلانی
سخن را ای سروش آسمانی
چنین باید کہ گردد این سخن نو
شود تا شاد از ما روح خسرو

چنانچہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حیاتی نے مثنوی کی تکمیل کردی، اگرچہ مولوی رشید احمد صاحب کو جو نسخہ دستیاب ہوا اس میں شروع کے ۱۷۹ شعر حیاتی کے کہے ہوئے موجود ہیں لیکن آخر میں ایک پورا باب غائب ہے اور صرف اس کا عنوان جو ابیات سلسلہ میں سے ہے باقی ہے - بقول حاجی خلیفہ اور امین رازی (۱) خسرو کی مثنوی میں تین ہزار بیت تھے - موجودہ حالت میں مثنوی میں، ابیات سلسلہ کے علاوہ، کل دو ہزار آٹھ سو چھیانوے شعر ہیں

(۱) ہفت اقلیم (دہلی کے تحت میں) ایضاً دیکھیے فرشتہ ج ۱ ص ۱۳۲، حاجی خلیفہ، بدایونی : ج ۱ ص ۲۲۵ -

جن میں سے ایک سو اناسی شعر جعلی ہونے کے نکالنے کے بعد اصل مثنوی کے کل دو ہزار سات سو سترہ شعر رہ جاتے ہیں۔

تغلق نامے کا مطالعہ کرنے کے بعد مولوی رشید احمد صاحب نے اس پر ایک مبسوط اور مدلل دیباچہ لکھنا شروع کیا جس میں انہوں نے مثنوی کی خصوصیات اور اس کے خسرو کی تصنیف ہونے کے سوال پر بہت قابلیت سے بحث کی۔ ان کا ارادہ تھا کہ مثنوی کا متن اس مقدمے کے ساتھ شائع کریں، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ کام ادھورا رہ گیا، مگر خوش قسمتی سے مولوی سید ہاشمی صاحب کی نظر سے حبیب گنج لائبریری کے نسخے کی ایک نقل گزری اور انہوں نے اس مثنوی کو چھاپنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ نقل اور اصل کے مقابلے اور تصحیح کے بعد انہوں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں اسے حیدر آباد سے شائع کر کے خسرو کی مطبوعہ تصنیفات میں ایک گراں قدر اضافہ کر دیا، اور یہ کتاب جو تاریخی حیثیت سے بہت ہی بیش قیمت ہے اب ہمارے سامنے موجود ہے۔

مثنوی کا آغاز قطب الدین مبارک شاہ کے عہد سے ہوتا ہے اور اس حصے میں خسرو نے اس بادشاہ کی عیش پرستی اور اس کی خسرو خان پر بے اندازہ عنایات، خسرو خان کی بے وفائی، اپنے آقائے نعمت کے قتل کی سازش اور نوجوان بادشاہ کی حسرت ناک موت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد غیاث الدین تغلق کا انتقام کے لیے تیاریاں کرنا، دہلی پر اس کی چڑھائی، خسرو خان کے بھائی خان خاناں اور خود خسرو خاں کی فوجوں کی شکست اور تغلق شاہ کے دہلی میں فاتحانہ داخلے کا بیان ہے، مثنوی تغلق شاہ کی تخت نشینی

کے بیان پر ختم ہوجاتی ہے ' آخر کا ایک باب جس میں خسرو بادشاہ کی طرف سے امرا کو اکرام و انعام اور چتر و مراتب وغیرہ کے دیے جانے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں موجودہ نسخے میں نہیں ہے - صرف یہ بیت سلسلہ باقی رہ گیا ہے :—

حدیث چتر و کشور دادن شہزادگان و آنکہ
بشغل آراستن کار ملوک و بندۂ و چاکر

تغلق نامے کا اسلوب بیان سیدھا سادہ ہے اور اگرچہ اکثر جگہ شاعر نے صنائع اور بدائع کا استعمال کیا ہے تو بھی اس مثنوی میں وہ رنگ آمیزی اور شاعرانہ بلندپروازی نہیں ہے جو خسرو کی بعض اور تاریخی مثنویوں میں پائی جاتی ہے - بحیثیت مجموعی یہ مثنوی مفتاح الفتوح سے زیادہ مشابہ ہے اور ہونا بھی چاہیے تھی - اس لیے کہ خسرو اپنے مربی کا میلان طبیعت دیکھ کر شعر کہتے تھے - جلال الدین فیروز خلجی اور غیاث الدین تغلق دونوں سیدھے سادھے جفاکش سپاہی تھے جنہیں نیرنگی قسمت نے تخت سلطنت پر لا بٹھایا تھا اور جن میں نہ تو خضر خاں کی سی تہذیب اور شایستگی اور نہ مبارک شاہ کی سی رنگینی اور عیش پسندی تھی ' اسی لیے اس مثنوی میں نہ تو عشقیہ کی سی رقت بیان اور تغزل ہے اور نہ نہ سپہر کا سا شکوہ الفاظ اور مظاہرۂ علم ' لیکن پھر بھی بعض جگہ خسرو کے خاص انداز کی جھلک نمایاں ہے ' خصوصاً بعض نادر تشبیہوں کی شکل میں - جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں

تغلق شاہ جب حملے کے لیے بڑھا تو اس کا بیٹا فخرالدین جونا خاں آگے آگے ہراول کے دستے کی قیادت کر رہا تھا - خسرو اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں :

به پیش آهنگ آن قلب معظم ملک فخر الدول گشته مقدم
ملک دریاصفت در صف هیجا خلاف درپیش همچون موج دریا

پریشانی اور پراگندگی خاطر کی تشبیہ کس انداز سے دیتے ہیں :—

همه شبہا کسان در بیم و تشویش چو بهر روستائی را سر و ریش

نیزے اور بھالے سنبھالے ہندو سورما اکڑتے ہوے کس طرح میدان جنگ کو چلے :—

روان با خشت و ژوپین ہندو گستاخ
چو آهوئی سیه بالا زده شاخ

خسرو خاں کے نیم اسلام اور اس کے همراهیوں کی مکمل بےدینی کی تشبیہ ملاحظہ ہو :—

سگ مرتد بر آن گبران سیه دار بسان صبح کاذب در شب تار

خسرو خان چتر کے نیچے میدان جنگ میں شان سے کھڑا ہے ۔ مگر شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ :—

میان قلب مرتد چتر بر سر نه چتر سماروغ خوردهٔ تر

خسرو خاں جب میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگا ہے تو اس کی کیا حالت تھی :

گہی ماند و گہی رفت و گه افتاد
چو برگی در خزان از جنبش باد

اسی طرح ہندی الفاظ کا استعمال اس مثنوی میں بہت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے مثلاً کہتے ہیں :—

دگر هر مار و بیری مار و پر مار
سخن شان "مار مار" و سربسر مار

یکی روئین تن اندر پوش شان "نہال"
دگر روئین تن اندر پوش شان مال
چو بکشادند تیر بے خطا را
بہ زاری گفت "ہے ہے تیر مارا"
یکی از راوتان "مار" تیر برد
یکی از گوش گوش آویز زر برد

لیکن مثنوی تغلق نامہ در اصل ادبی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی تاریخی حیثیت سے، اس لیے کہ اس میں بعض ایسی تفصیلی باتیں ملتی ہیں جو اس زمانے کی کسی تاریخ میں درج نہیں ہیں اور جن کی صحت کے متعلق ہمیں پورا اطمینان ہے۔

خمسۂ خسرو

اس خمسے کی پانچوں مثنویاں یعنی مطلع الانوار، شیرین و خسرو، مجنون و لیلیٰ، آئینۂ اسکندری اور ہشت بہشت نظامی گنجوی کی پانچ مثنویوں یعنی مخزن الاسرار، خسرو شیرین، لیلیٰ و مجنون، سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی گئی ہیں اور خسرو نے وہی بحریں استعمال کی ہیں جو نظامی نے کی تھیں اور ہر ایک مثنوی میں انہی مضامین کو باندھا ہے جو اس کے مقابلے کی نظامی کی مثنوی میں موجود ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے خسرو نے یہ خمسہ بادشاہ یا کسی اور مربی کی فرمایش پر نہیں لکھا اگرچہ انہوں نے اسے

علاءالدین خلجی کے نام سے معنون ضرور کیا ہے (۱) - بلکہ انہیں از خود یہ خیال پیدا ہوا کہ نظامی کے مشہور اور مقبول عام خمسے کا جواب لکھ کر اقلیم سخن میں مزید شہرت اور سربلندی حاصل کریں ۔ علاءالدین کے زمانے میں خسرو کا ملکۂ شاعری اور ذوق سخن اپنے پورے شباب پر تھا اور کچھ عجب نہیں کہ جب انہوں نے اس دشوار کام کو شروع کیا تو ان کے دل میں یہ خیال ہو کہ وہ اپنے نامور پیش رو سے اس میدان میں بازی لے جائیں گے لیکن خسرو میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں وہ انتہا کے منصف مزاج بھی واقع ہوئے تھے ۔ اپنے کلام پر کسی شاعر کا بےلاگ رائے دینا ذرا مشکل ہے ۔ لیکن خسرو اپنی اچھائی اور برائی کو خوب سمجھتے بھی تھے اور اپنی رائے کے اظہار میں تامل بھی نہ کرتے تھے ۔ چنانچہ شروع میں جب انہوں نے خمسہ لکھنا شروع کیا اور اس میں انہیں اس قدر کامیابی ہوئی کہ بقول ان کے نظامی اور ان کے کلام میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا تو شاعرانہ تعلی میں وہ یہ ضرور کہہ گئے کہ :

کوکبۂ خسرویم شد بلند زلزلہ در گور نظامی فگند

---

(۱) انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷ - بقیۂ نقیہ کے ایک قطعے میں یہ شعر ہے :

پیشکش کردم بخدمت خمسہ را و شد قبول
لیک نی یاد آمدم در بذل و نی کس یاد داد

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خمسے کا صلہ دینے میں بھی علاءالدین نے بخل سے کام لیا -

مگر رفتہ رفتہ انھیں اس کام کی دشواری کا احساس ہونے لگا اور انھیں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اتنی محنت اور مشقت بیکار ہے، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ خسرو نے خمسے کی پہلی مثنوی کو صرف چودہ پندرہ دن کے اندر ختم کر دیا اور پورا خمسہ بھی دو، سال کے قلیل عرصے میں لکھ ڈالا - کام کو شروع کر کے اسے ناتمام چھوڑ دینا ان کے شیوے کے خلاف تھا، اپنی ناکامی کا احساس اور اس کا اظہار اور بات ہے مگر اعتراف شکست اور وہ بھی ایک شروع کئے ہوئے کام سے دستبرداری کی شکل میں خسرو کے لیے ممکن نہ تھا - تعجب یہ ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود، خسرو نے ہزارہا شعر اتنے کم عرصے میں کہ ڈالے اور شعر بھی اس اعلیٰ پایے کے کہ متعدد جگہ بعض مضمونوں کو باندھنے میں یقیناً وہ نظامی سے سبقت لے گئے ہیں -

خسرو نے خمسے کی سب مثنویوں میں نظامی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور شائد یہ ان کی پہلی اور آخری تصنیف ہے جس میں اُنھوں نے اپنی مخصوص روش اور آزاد منشی کو ایک استاد کی کامیاب تقلید پر قربان کر دیا - وہ چاہتے تھے کہ ان کے خمسے میں وہی رنگ جلوہ گر ہو جائے جو نظامی کے خمسے میں ہے، چنانچہ مجنون و لیلیٰ کے خاتمے میں کہتے ہیں :-

پی بریئے او چنانکہ دانم	گفتم قدمی زدن توانم
از شیوۂ خود رمیدہ گشتم	تسلیم همان جریدہ گشتم
چیدم بقلم نمونۂ پیش	بردم ز میان تکلف خویش
آرایش پیکر معانی	بستم بسلاست روانی
کآن مایہ کہ صنعتی بود خام	از شیوۂ من برون برد نام

خسرو کو اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ' اس کے متعلق مختلف نقادوں نے مختلف رائے دی ہے ' خسرو کے بعض ہمعصر جو ان سے رقابت اور چشمک رکھتے تھے ' خصوصاً عبید جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے ' ان کی اس کوشش کو سودائے خام سمجھتے تھے ' چنانچہ عبید نے تو کہ ہی دیا کہ :

غلط افتاد خسرو را ز خامی   کہ سکبا پخت در دیگ نظامی (۱)

اس کے مقابلے میں بعد کے زمانے کے نقادوں نے خسرو کے خمسے کی تعریف میں یہاں تک غلو سے کام لیا ہے کہ ان کے ایک شعر کو نظامی کے پورے خمسے پر بھاری بتایا اور شعر بھی کہا کہ :

قطرۂ آبی نخورد ماکیان   تا نکند رو بسوی آسمان (۲)

لیکن میرے خیال میں نہ تو خسرو کے حاسدوں کے طنزیہ فقرے قابل اعتنا ہیں اور نہ ان کے مداحوں کی مبالغہ آمیز ستائش لائق اعتماد بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر خمسے کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو وہ نظامی کے خمسے کی ایک بہت اچھی نقل کہا جاسکتا ہے - نقل کا اصل سے بڑھ جانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے ' اس لیے خسرو کے خمسے کی انتہائی تعریف ' جو صداقت سے بھی چنداں بعید نہ ہوگی ' یہی ہوسکتی ہے کہ وہ خمسۂ نظامی کی بہترین ممکن نقل ہے ' چنانچہ اس رائے سے بعض بہت ہی قابل جوہریان سخن مثلاً جامی اور نوائی وغیرہ کو بھی اتفاق ہے ' یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ خسرو ایسے مقام باندھ گئے ہیں کہ نظامی ان کی خوبی اور بلندی کو نہ پہنچ

---

(۱) بدایونی ج ۱ ص ۲۲۳ -   (۲) ہشت آسمان ص ۶۷-۶۸

سکے تھے -

خسرو کے خمسے کی سب مثنویاں علی گڑھ سے بہت صحت اور اہتمام کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں اور چونکہ وہ قابل ادیب اور نقاد جن کی زیرنگرانی ان کی اشاعت ہوئی ہے ہر ایک مثنوی کے دیباچے میں فرداً فرداً اس پر رائے زنی اور تبصرہ کر چکے ہیں اس لیے کتاب میں مزید تجزیے اور تنقید کی چنداں ضرورت نہیں ہے ' لیکن ایک بات یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ خسرو نے انہی کہانیوں اور مضامین کو باندھا ہے جو نظامی کی مثنویوں میں ہے لیکن جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے انھوں نے نظامی کی تقلید پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی رائے سے بہت کچھ کام لیا ہے اور جگہ جگہ واقعات میں رد و بدل کر دیا ہے -

یہ پانچوں مثنویاں سنہ ۶۹۸ھ سے سنہ ۷۰۱ھ کے عرصے میں لکھی گئیں اور ہر ایک مثنوی کے اشعار کی تعداد خسرو نے حسب ذیل بتائی ہے :—

(۱) مطلع الانوار : تین ہزار تین سو دس

(۲) شیریں و خسرو : چار ہزار ایک سو چوبیس

(۳) مجنون و لیلیٰ : دو ہزار چھ سو ساٹھ

(۴) آئینۂ سکندری : چار ہزار چار سو پچاس

(۵) هشت بہشت : تین ہزار تین سو پچاس -

خمسے کی مثنویوں میں شاید سب سے زیادہ شہرت مطلع الانوار کو حاصل ہوئی ' چنانچہ متعدد شاعروں نے اس کے جواب لکھے جن میں جامی کی تحفۃ الابرار خاص طور پر قابل ذکر ہے - لیکن میرے خیال میں فنی حیثیت سے جو بات

مجنون و لیلیٰ میں نکلتی ہے و× کسی اور مثنوی میں نہیں ہے، عشق کے رموز واسرار، عاشق و معشوق کے راز و نیاز، تاثرات اور واردات قلبی جس سلاست، رنگینی اور سوز کے ساتھ خسرو نے بیان کئے ہیں اس کی نظیر ان کے پیشرو کے شاہکار میں بھی بدقت ملے گی۔

بارھواں باب

غزلیات خسرو

خسرو غزل‌گوئی کو کوئی خاص اھمیت نہ دیتے تھے اس لیے کہ جیسا اُنھوں نے ایک جگہ کہا ھے ہر شخص جو دو چار شعر موزوں کر سکتا ھے غزل‌گو ھونے کا دعوےدار بن سکتا ھے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنی غزلوں کو جمع کرنے یا انھیں باقاعدہ ترتیب دینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی ' لیکن یہ عجیب بات ھے کہ آج خسرو کی شہرت کا زیادہ‌تر دار و مدار ان کی غزلوں ھی پر ھے - ان کے طولانی مرصع اور مزین قصائد کے دیوان ' ان کی لمبی چوڑی مثنویاں اور ان کی انشا کے نمونے جو اعجاز خسروی کی پانچ جلدوں میں موجود ھیں زیادہ‌تر محض کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئے ھیں لیکن ان کی غزلوں پر آج بھی اھل دل اسی طرح سر دھنتے ھیں جیسے ان کے اپنے زمانے میں دھنتے تھے ' بظاھر یہ بات تعجب خیز ضرور ھے لیکن اگر ھم ذرا غور سے کام لیں تو آسانی سے یہ معما سمجھ میں آ سکتا ھے '

غزل کیا ھے ؟ اس کی قدیم تعریف " عورتوں سے (یا عورتوں کے متعلق) باتیں کرنا " جتنی فرسودہ ھے اتنی ھی ناکافی بھی ھے ' یہ ضرور ھے کہ غزل کی جان وھی حسن و عشق کی قدیم داستان ھے ' لیکن فارسی یا اردو شاعری میں غزل کا میدان

محض اظہار عشق یا عاشق کے واردات قلبی کے بیان تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام تاثرات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ طریقے سے بیان کرنے کا ذریعہ ہے جو مختلف نوعیت کے محرکات سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور واقعہ تو یہ ہے کہ شاعری کی کوئی صنف مضامین کے اعتبار سے اتنی جامع نہیں ہے جتنی غزل، بلکہ اس میں سب اصناف شاعری کی جھلک موجود ہے۔ چنانچہ مدح، ہجو، مرثیہ، نثر، معاملہ بندی یا واقعہ نگاری، غرض یہ کہ کوئی مضمون ایسا نہیں کہ جس کے لیے پانچ سات شعروں کی غزل کا ظرف تنگ سمجھا گیا ہو، سطحی اور عامیانہ خیالات سے لے کر بہت ہی گہرے اور فلسفیانہ حقائق، اساتذہ نے اس خوبی سے غزل میں باندھے ہیں کہ اگر غزل کو شاعری کا خلاصہ اور شعریت کا نچوڑ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ غزل کا اختصار بجائے خود اس کی دلفریبی اور مقبولیت کا ضامن ہے اور پھر اس کے مضامین اور موضوعات کا یہ تنوع اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو مد نظر رکھیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ تمام اصناف شاعری میں غزل کو ایک خصوصیت حاصل ہے اور اسی لیے یہی وہ صنف ہے جس کی جاذبیت عام ہے، قصائد ممکن ہے کہ علم و ہنر کے نقادوں کی توجہ کو جذب کریں، مثنوی، افسانے یا تاریخ کے شوقینوں کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن شائد ہی کوئی ایسا بدذوق اور بے بہرہ متنفس ہوگا جسے اپنے مذاق کے مناسب کوئی نہ کوئی چیز غزل میں نہ مل سکے، بلکہ یہ کہ سکتے

ہیں کہ کوئی انسانی جذبہ، کوئی فطرتی احساس اور کوئی وجدانی کیفیت ایسی نہیں ہے کہ جس کی صداے بازگشت باکمال غزل‌گو شعرا کے کلام میں نہ سنائی دیتی ہو اور چونکہ یہ جذبات، یہ احساسات اور یہ کیفیات مکان اور زمانے کی قید سے آزاد ہیں اس لیے غزل کی کشش بھی عام اور دائمی ہے۔ غزل مذہب، ملک اور قوم کی حدود کے پابند نہیں۔ یہ عام انسانیت کی آواز ہے، یہ انسان کے اُن غموں اور اُن خوشیوں کا نوحہ اور نغمہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے انسان کے دل پر اثرانداز ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے، اور شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ ان تاثرات کو جو ہمارے دلوں میں موجود ہیں لیکن جن کے اظہار سے ہم قاصر ہیں موزوں و مناسب الفاظ میں ظاہر کر سکتا ہے۔

خسرو سے پہلے سعدی، فارسی غزل‌گوئی میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے اور ان کی استادی اس صنف شاعری میں عام طور پر تسلیم کی جاتی تھی۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ جو سلاست اور روانی، رنگینی اور شیرینی سعدی کی غزلوں میں پائی جاتی ہے وہ نہ صرف ان سے پہلے کے شاعروں کے کلام میں مفقود ہے بلکہ ان کے بعد کے شعرا کی غزلوں میں بھی کم پائی جاتی ہے لیکن سعدی کی غزل میں ایک بات کی کمی ضرور تھی، اس میں وہ سوز و گداز اور وہ جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر سکے، جو اس کے مردہ احساسات میں جان ڈال دے اور جو اسے بیخود اور وارفتہ بنا سکے، سعدی کی اس کمزوری سے اُن کے جانشین ہم‌وطن شاعر حافظ نے فائدہ اُٹھایا اور غزل‌گوئی میں وہ نام پیدا کیا

کہ سعدی کی شہرت اس کے آگے ماند ہوگئی - لیکن حافظ سے پہلے ہندوستان میں خسرو کو بھی غزل کی اس کمی کا پورا احساس تھا اور اگرچہ ان کے ہمعصر خواجہ حسن نے سعدی کے اسلوب کو اس قدر اپنایا کہ سعدی ہند کا لقب پایا ' لیکن خسرو کی جدت پسند طبیعت نے سعدی کی استادی سے تو انکار نہیں کیا مگر ان کی شاگردی پر بھی اکتفا نہیں کی بلکہ غزل میں اپنے لیے ایک نیا مسلک ' ایک انوکھی روش ' اور ایک جدید اسلوب اختیار کیا ' جس کی کچھ جھلک حافظ میں بھی موجود ہے ' لیکن جس کا پرتو زیادہ تر اور بعد کے شعرا مثلاً جامی ' نظیری اور غالب میں زیادہ نمایاں ہے - اس کے علاوہ سعدی کی غزل میں ایک سادگی خیالات ہے ' جو بعض لحاظ سے یقیناً قابل ستائش ہے - لیکن جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں کوئی گہرائی ' کوئی باریکی اور کوئی نزاکت پیدا نہیں ہوتی - یہ صفات خسرو کی غزلوں میں بہت نمایاں ہیں اور انہی صفات کو بعد کے شعرا نے جن کا میں نے ذکر کیا ہے خاص طور پر اپنے غزلیہ کلام میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے - سادگی خوش آیند ضرور ہے لیکن دقت پسند طبیعتوں کے لیے اس میں کوئی لطف نہیں ' اس لیے اگرچہ سعدی کی غزل مذاق عام کے لیے باعث دلچسپی ہوسکتی ہے وہ زیادہ شائستہ اور زیادہ مہذب دماغوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی -

خسرو کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ان کے زمانے سے لے کر آج چھ سو سال سے زائد گزر چکے ہیں لیکن سماع اور قوالی کی محفلوں میں غالباً اب بھی سب سے زیادہ انہی کی غزلیں مقبول اور رائج ہیں - اور اس

قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ ان کا کوئی بہت ہی پردرد شعر سن کر بعض لوگوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوگئی کہ وہ جان سے گزر گئے ، چنانچہ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ اس کے عہد کے مشہور مہر کن ملا علی احمد نے ایک دفعہ قوالوں کو خسرو کا یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا :—

ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی
ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہی

اور ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً گر کر مر گئے - (۱)

ایک اور خوبی جو خسرو کی غزلوں میں پائی جاتی ہے تسلسل مضامین ہے ، ان کی متعدد غزلیں ایسی ہیں کہ جن میں بہت خوبی سے ایک ہی مضمون کو شروع سے آخر تک باندھا ہے لیکن غزل کے کسی شعر میں تکلف یا آورد کا شائبہ نہیں ہے ، علاوہ ازیں خسرو چونکہ خود موسیقی دان تھے اس لیے انہوں نے غزلوں کی بحریں اور الفاظ ایسے تلاش کئے کہ جن سے موسیقیت پیدا ہو اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک خاص روانی اور ترنم پایا جاتا ہے - ترنم پیدا کرنے کے لیے خسرو نے نہ صرف الفاظ اور بحریں موزوں اختیار کیں بلکہ اکثر جگہ قافیے بھی ایسے باندھے ہیں کہ جن کی طرف عام غزل‌گو شاعروں کا ذہن منتقل نہ ہوا تھا - مثلاً اپنی ایک غزل میں انہوں نے تتہ ، البتہ لتہ ، متہ وغیرہ کا قافیہ باندھا ہے - غزل کا مطلع ہے :

سروی چو تو در اوچہ و در تتہ نباشد
گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد

---

(۱) تزک ج ۱ ص ۱۶۹ -

اور غزل کا ایک اور شعر یوں ہے :

دوزند قبا بہر قدت از گل سوری   تا حسن دلاویز ترا لته نباشد

اس قافیے کی ندرت اور لطافت اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں ہوسکتی -

خسرو کی غزل کی اور خوبیاں گنوانے کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے اور نہ میرے خیال میں ان کی غزلوں میں صنائع اور بدائع کو ڈھونڈ کر نکالنا کسی نقاد کے لیے ضروری ہے ' اس لیے کہ کسی اچھے شاعر کے کلام میں صنائع اور بدائع موجود تو ضرور ہوتے ہیں لیکن نمایاں نہیں ہوتے اور جہاں کہیں وہ اس قدر نمایاں ہو جائیں کہ پہلے ان پر ہی نظر پڑے اور شعر کی خوبی کا انحصار انہی پر موقوف سمجھا جائے وہاں غزل کی اصل لطافت اور خوبی کالعدم ہو جاتی ہے - شاعر صنعتوں کے استعمال سے بے نیاز تو نہیں ہوسکتا لیکن جس طرح عروض ' شعر کے لیے ضروری ہے مگر اس کا جاننا شاعر کے لیے ضروری نہیں ہے اسی طرح صنائع ایک باکمال شاعر کے کلام میں پائے تو جاتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس نے قصداً ان کو استعمال کیا ہو بلکہ جس طرح طبیعت کی موزونی سے شعر خود بخود موزوں ہو جاتے ہیں اسی طرح طبیعت کی '' شعریت '' اور صنعت گری سے صنائع بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اگر کسی کو خسرو کے کلام کی یہ لفظی خوبیاں سمجھنے کا شوق ہو تو مولانا شبلی نے شعرالعجم میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت کافی ہے اور اس کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں ہے - بہر حال انہی معنوی اور لفظی خوبیوں کی بنا پر خسرو کی غزلوں نے بہت جلدی عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی '

چنانچہ سعدی شیرازی نے ان کی تعریف شہزادہ محمد شہید کو لکھ کر بھیجی اور حافظ نے جب لکھنوتی کے حاکم غیاث الدین کو ایک غزل لکھ کر بھیجی تو اس میں یہ شعر بھی تھا کہ :

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

" طوطیان ہند " کا فقرہ لکھتے وقت یقیناً ان کے ذہن میں طوطی ہند امیر خسرو تھے - اسی طرح جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ :

" خسرو کی غزلیں ان خیالات اور تصورات کی وجہ سے جو مشہور و معروف ہیں اور جن کی عاشقان صادق اور ہواپرست اپنے اپنے مذاق کے مطابق تاویل کرتے ہیں عام طور پر مقبول ہیں " (۱)

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ خسرو نے کبھی اپنی غزلوں کو جمع کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی لیکن باوجود اس کے اُنھوں نے کم از کم اپنے دو دیوانوں یعنی غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ میں کچھ غزلیں ضرور شامل کی تھیں جو ان دیوانوں کے قلمی نسخوں میں موجود ہیں - ان غزلوں کے ساتھ چونکہ بہت سلسلہ موجود ہے اس لئے اس میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا کہ خسرو نے خود ان دیوانوں کے ساتھ چیدہ چیدہ غزلوں کا مجموعہ شامل کیا تھا ' لیکن آیا اب جو غزلیں مختلف نسخوں میں موجود ہیں وہ وہی ہیں جو خسرو نے رکھی تھیں ' یہ بہت مشتبہ بات ہے - کیونکہ مختلف نسخوں میں غزلیں یکساں نہیں ہیں اور بعض نسخوں میں جو غزلیں بقیہ نقیہ کے ساتھ مندرج ہیں

---

(۱) بہارستان : ص ۱۹۰ -

وہ اور نسخوں میں غرۃ الکمال میں شامل ہیں - علاوہ ان دو مجموعوں کے بظاہر خسرو نے ایک انتخاب غزلوں کا اپنے چاروں دیوانوں سے تیار کیا تھا اور بہت ممکن ہے کہ " کلیات اربعہ عناصر دواوین خسرو " کے نام سے جو مجموعہ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا وہ بھی انتخاب ہو - اس مجموعے کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے - اس میں اور مطبوعہ نسخے میں کچھ فرق ضرور ہے لیکن زیادہ نہیں اور دونوں نسخوں میں جو دیباچہ ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انتخاب خسرو نے خود کیا تھا - چنانچہ دیباچے کا ایک حصہ ، جو اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں خسرو نے اپنی غزلوں پر رائے زنی کی ہے ، حسب ذیل ہے :—

" زیرا کہ درین وقت اکثر طبائع بغزل میل دارد و ازان روز بازار فارسی گرم است و راویان سخن می‌خواهند تا از شعلۂ غزل محرق مجلس را گرم گردانند ، اکنون مصلحت آن دیدم که بہ هوای دل خویش که کثافت طبیعی او آب گشته است از تائرۂ قلم روان گردانم و در اوصاف هر غزل چهار تشبیه بہ‌چهار عنصر برای نمونۂ شعر بر آئینۂ تخییل حکما از چهار طبع خویش پیدا سازم - نظم :

تا بدانند که یک طبع رهی هست چهار

که همی زاید ازو معدن و حیوان و نبات

معلوم خاطر اصحاب طبع باد که بمرتبۂ اول غزلیات بمثابۂ خاک سرد و خشک و کثیف و تاریک است این غزلها نیز بہ‌نسبت صنائع و بدائع خشک ، و تکلفات سرد و کثیف و بکثافت میل کند ، چون هنگام پرداخت این دیوان اول تحفۃ الصغر است ، این طفل خاک را که ایام خاک بازیست با طفلان در هر صنعتی ، رغبتی تمام ، غزلهای این دیوان برین

مثال اوفتاده است - شعر

سهل باشد نباشد آن بسیار   کانچنان اندکست نے بسیار

مرتبهٔ اول آن بود - در مرتبهٔ دوم غزلها مانند آب و چون
آب برخیال لطیف از خاک برتر است و از کدورات الفاظ کثیف
مصفا وسط الحیات است گرم و تر افتاده است گوئی که آبیست
که از آتش طبع خویش جوش بسیار یافته است واز محل مائیت
بمرتبهٔ هوائیت نرسیده و در مائیت خویش مانده - و بمرتبهٔ سوم
غزلهائیست برشبه باد که بخاصیت چون آب گرم و تر افتاده
است و این غزلها لطیف‌تر است و روان تر و برتر و از بس
لطافت خلل پذیر نبود ، و این غزلها نیز مانند باد گرم و تر اوفتاده
است و از غزلهای که مانند آب است ، لطیف تر است و روان
تر و عالی تر از آتش طبع خویش قوت بسیار یافته است و از
مقام هوائیت بمرتبهٔ مائیت رسیده ، و این دیوان غرة الکمال
است ، غزلهای او نیز برین نوع افتاده است ، باید که خواننده
بطبع وقاد تامل فرماید ، و مرتبهٔ چهارم غزلها مثال آتش است
چنانکه آتش میل بالا دارد یعنی بعلو و هیچ سوی پستی فرود
نیارد و تنزل را در وی راه نبود و هیچ طبعی ازو بلندتر نبود
و با او نرسد ، چنانکه حرارت خاصهٔ آتش است و در دلهای
نرم چون آتش در پنبه گیرد و دل آهنین را قدری نرم سازد ،
و اگر دلیست که در وی عشق جای دارد اینک بسوزاند و
خاکستر گرداند ، غزلهای بقیه نقیه (برین نمط است) و بعد ازین
اگر شعلهٔ حیات روشن ماند و آتش طبع وقاد در مشعل بود امید
است که این غزلهای سوزان بلند کرهٔ اثیر را سراسر آتش پا می گرداند
بمثابهٔ که شعلهٔ سوزان آن از خرمن ماه بگذرد و در خوشهٔ عطارد گیرد

و چنانکہ اشراق آن در چرخ افتد و مشعلۂ آفتاب را آب گرداند ...“

لیکن چونکہ اس دیباچے کی عبارت بعض جگہ بالکل وھی ھے جو دیوان بقیہ نقیہ کے دیباچے کی ھے اس لئے اس شبہہ کی گنجائش ضرور رھتی ھے کہ یہ انتخاب یا تو کسی اور نے کیا ھو اور اس کے شروع میں دیباچۂ بقیہ نقیہ کے بعض حصے لے کر بطور دیباچہ شامل کر دیے ھوں اور یا یہ وہ مجموعہ ھو جسے خسرو نے دیوان بقیہ نقیہ کے ساتھ شامل کیا تھا - بہر حال انتخاب بہت اچھا ھے اور اگر خسرو کا خود کردہ نہیں ھے تو کسی ذوق سلیم رکھنے والے نے کیا ھے - اس سلسلے میں اس کا اعادہ بیجا نہ ھوگا کہ میرزا بایسنغر کے زمانے میں بھی خسرو کے کلام کو جمع اور ترتیب دینے کا کام ایک شاعر سیفی کے سپرد کیا گیا تھا - کیا عجب ھے کہ یہ انتخاب اس زمانے میں ھوا ھو -

اب میں خسرو کی غزل کے چند نمونے پیش کرتا ھوں ' امید ھے کہ ان سے خسرو کے غزلیہ کلام کی وہ خوبیاں جن کا میں نے اشارتاً اوپر ذکر کیا ھے کسی حد تک واضح ھو جائیں گی -

[۱]

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چون کنم دل بچنین روز ز دلدار جدا

ابر باران و من و یار ستادہ بوداع
من جدا گریہ کنان ' ابر جدا یار جدا

سبزہ نوخیز و ھوا خرم و بستان سرسبز
بلبل روی سیہ ماندہ ز گلزار جدا

ای مرا در تہ ھر بند ز زلفت بندی
چہ کنی بند ز بندم ھمہ یکبار جدا

دیده ام بهر تو خونبار شد ای مردم چشم
مردمی کن مشو از دیدهٔ خونبار جدا
نعمت دیده نخواهم که بماند پس ازین
مانده چون دیده ازان نعمت دیدار جدا
حسن تو دیر نماند چو ز خسرو رفتی
گل بسی دیر نماند چو شد از خار جدا

[۲]

بشگافت غم این جان جگر خوارهٔ مارا
یا رب چه وبال آمده سیارهٔ ما را
رفتند رفیقان دل صد پاره ببردند
کردند رها دامن صد پارهٔ ما را
گر همره ایشان شوی ای باد درین راه
زنهار بجوئی دل آوارهٔ ما را
شبها بدل از سوز خبر می کندم آه
آه از خبر دل بت عیارهٔ ما را
روزی نکند یاد که شبهائی جدائی
چون می گذرد عاشق بیچارهٔ ما را
بوئی جگر سوخته بگرفت همه کوی
آتش بزن این کلبهٔ خونخوارهٔ ما را
جز خستهٔ و افگار نخواهد دل خسرو
خونیست بدین بخت ستمگارهٔ مارا

[۳]

جانان به پرسش یاد کن جان من گم بوده را
وآخر برخست باز کن آن چشم خواب آلوده را

نا خوانده سویت آمدم نا گفته رفتی از برم
یعنی سیاست این بود فرمان نا فرموده را
رفتی تو و دانم که من زنده نمانم از غمت
یا رب کجا یابم کنون آن صبر و رفتی بوده را
باز آی و بنشین ساعتی آخر چه کم خواهد شدن
گر شاد گردانی دمی یاران غم فرسوده را
کشتی مرا وینست غم الا غم نادیدنت
گر میتوانی باز بخش این جان نابخشوده را
سودای خسرو هر شبی پایان ندارد تا سحر
آخر گره بر زن یکی آن جعد نابیموده را

[۴]

دلم در عاشقی آواره شد آواره‌تر بادا
تنم از بیدلی بیچاره شد بیچاره‌تر بادا
بتاراج اسیران زلف تو عیاری دارد
بخون‌ریز غریبان چشم تو عیاره‌تر بادا
رخت تازه است بهر مردن خود تازه‌تر خواهم
دلت خاره است بهر کشتن من خاره‌تر بادا
گر ای زاهد دعاے خیر می‌گوئی مرا این گو
که آن آوارهٔ کوئی بتان آواره‌تر بادا
دل من پارہ گشت از غم نه زانگونه که بر گردد
اگر جانان بدین شاداست یارب پاره‌تر بادا
چو با تردامنی خو کرد خسرو با دو چشم تو
بآب چشم مژگان دامنش همواره‌تر بادا

[۵]

وقتی اندر سر کوئی تو گزر بود مرا
و اندران روی نهانی نظری بود مرا
جان بجایست ولی زنده نیم من زیرا که
مایهٔ عمر بجز جان دگری بود مرا
همه کس را خور و خواب و من بیچاره خراب
ای خوش آن وقت که خوابی و خوری بود مرا
به ازین بودم ازین پیش اگر هیچ نبود
باری از جنس صبوری قدری بود مرا
هیچ یاد آیدت ای فتنه که وقتی زین پیش
عاشق سوختهٔ در به دری بود مرا
خواستم دی که نمازی بکنم پیش خیال
لیک آلوده بدامن جگری بود مرا
نروم پیش که یاد آئی و دیوانه شوم
ارنه گه‌گه بگلستان گزری بود مرا
پاسبان روز هم از قصهٔ خسرو بشنود
که شب از هجر تو ناخوش سحری بود مرا

[۶]

آب حیات من که تو از من دریغ داشت
خاک رهش شدم قدم از من دریغ داشت
من هر شبی نشسته ز هجرش بروز غم
او پرسشی بروز غم از من دریغ داشت
گرچه به بوئی او شدمی زنده پیش ازین
آن نیز باد صبح دم از من دریغ داشت

گشتم ز فرق تا بقدم حلقه چون رکاب
و آن شهسوار من قدم از من دریغ داشت
بر دیگران نوشت بسی نامهٔ وفا
بر حاشیه سلام هم از من دریغ داشت
صد دوست پیش کشته نه من نیز دوستم
آخر چه شد که این کرم از من دریغ داشت
کاغذ مگر نماند که آن ناخدای ترس
از نوک خامه یک رقم از من دریغ داشت

[۷]

ای ترک کمان ابرو من کشتهٔ ابرویت
مایکی همه هند و چون بدهم بهکی مویت
گفتی که بدین سوها غمناک چه می‌گردی
آوارهٔ دلی دارم در حلقهٔ گیسویت
مسجد چه روم چندین * آخر چه نماز است این
رویم بسوی قبله دل جانب ابرویت
شبها همه کس خفته جز من که ز بیخوابی
افسانهٔ دل گویم در پیش سگ کویت
بوی گل ازین پوشم در باغ نمودی ره
بادی بوزید از تو گمره شدم از بویت
گه نام گلی گیرم گه یاد گلستانی
زین گونه در اندازم هرجا سخن از رویت
سر در خم چوگانت راضیست بدین خسرو
آن بخت کرا کارد سر در خم بازویت

[۸]

باز آن حریف بر سر سودای دیگر است
هر ساعتی بخون منش رای دیگر است
دل برد و رخ به پرده نهان میکند ز من
این وجه خود به پرده تقاضای دیگر است
راضی نمی‌شود بدل و دیده هجر او
این دزد در تفحص کالای دیگر است
پندم مده که نشنوم ای نیک‌خواه از آنکه
من با تو ام ولی دل من جای دیگر است
دیوانه گشت خلق که از سحر چشم او
هر دم بشهر فتنهٔ و غوغای دیگر است
خسرو بیک نظارهٔ رویش ز دست رفت
وین دیده را هنوز تمنای دیگر است

[۹]

خبری ده بمن ای باد که جانان چونست
آن گل تازهٔ و آن غنچهٔ خندان چونست
با که می میخورد آن ظالم و در خوردن می
آن رخ پر خوی و آن زلف پریشان چونست
روزها شد که دلم رفت و بر آن زلف بماند
یا رب آن یوسف گم گشته بزندان چونست
هم بجان و سر جانان که کم و بیش مگوی
گوهمین یک سخن راست که جانان چونست
خشک سالیست درین عهد وفا را ای اشک
زان حوالی که تو می آئی باران چونست

پست شد خسرو مسکین ز لگدکوب فراق
مور در خاک فرورفت سلیمان چونست

[۱۰]

یاران که بوده اند ندانم کجا شدند
یا رب چه روز بود که از ما جدا شدند
گو نوبهار آید و پرسد ز دوستان
گو اے صبا که آن همه گلها کجا شدند
اے گل چو آمدی ز زمین گو چگونه اند
آن رویها که در ته گرد فنا شدند
آن سروران که تاج سر خلق بوده اند
اکنون نظاره کن که همه خاک پا شدند
خورشید بوده اند که رفتند زیر خاک
آن ذرها که هر همه اندر هوا شدند
بازیچه ایست طفل فریب این متاع دهر
بے عقل مردمان که بدین مبتلا شدند
خسرو گریز کن که وفا رفت این زمان
ز اهل جهان که همچو جهان بیوفا شدند

[۱۱]

دو چشمت که تیر بلا میزند — چنین تیر بر ما چرا میزند
کمان جانب دیگری میکشد — ولی تیر بر جان ما میزند
زهی غمزه کز شوخی و چابکی — کجا می نماید کجا میزند
دو زلف تو از پشتی روی تو — شب تیره را در قفا میزند
بهنگام رفتار بالای تو — تنگ کبک را زاغ پا میزند
چو بوی ترا در چمن می برد — نسیم بهار از صبا میزند

سریز آب خسرو همین غم بس است
که آتش درین مبتلا میزند

[۱۲]

سروی چو تو در اوچه و در تته نباشد
گل شکل رخ خوب تو البته نباشد
دوزند قبا بهر قدت از گل سوری
تا خلعت زیبائی تو از لته نباشد
در جنت فردوس کسی را نگذارند
تا داغ غلامی تو اش پته نباشد
لقمانی مسکین نکند بهل بجنت
در صحن بهشت ار طبق بته نباشد
این حسن و لطافت که تو کافر بچه داری
در چین و خطا و ختن و خته نباشد
از پشت رقیب تو کشم تسمهٔ چندین
تا قبچغهٔ اسپ تو از متہ نباشد
موی شده از فکر محالت تن خسرو
تا هم چو رقیبت خنک و کته نباشد

[۱۳]

عشقت خبر ز عالم بیهوشی آورد
اهل صلاح را بقدح نوشی آورد
رخسار تو که توبهٔ صد پارسا شکست
نزدیک شد که رو بسیه پوشی آورد
شوق تو شحنه ایست که سلطان عشق را
سوی جبین گرفته بچاووشی آورد

گفتم ازان لب از پی دیوانه شربتی
گفت این مفرحیست که بیهوشی آورد
من ناتوان زیاد کسی گشتم ای طبیب
آن داروم بده که فراموشی آورد
خسرو اگر فسون پری نیست در سرت
چشم از پری بدوز که مدهوشی آورد

[۱۴]

که می آید چنین جانا مگر مه بر زمین آمد
چه گرد است این که می خیزد که با جان همنشین آمد
که میراند جبینت را که میدان عنبرآگین شد
کدامی باد می جنبد که بوی یاسمین آمد
صبوری را دلم در خاک می جوید نمی یابد
غبار کیست می نازم که در جان حزین آمد
بیامد پیش ازین یکبار دل تسلیم او کردم
کنون تسلیم شو ای جان که باز آن نازنین آمد
بتی و آفت تقوی و دین آخر نمیدانی
که در شهر مسلمانان نباید این چنین آمد
چنان نقاش حیرانی بماند از بستن زلفت
که تاریکی به پیش دیدهٔ نقاش چین آمد
ز چندین آب چشم آخر بر آن آئینه زنگاری
برای سبزهٔ رنگین که باران بر زمین آمد
ز بهر چاک دامانی چه جای طعنه بر خسرو
که او را تیغ بر دست و کفن در آستین آمد

[۱۵]

تن پیر گشت و آرزوی دل جوان هنوز
دل خون شد و حدیث بتان بر زبان هنوز
عمرم باخر آمد و روزم به شب رسید
مستی و بت پرستی من هم چنان هنوز
آهنگ کرد سوی بردن جان گمرهم
کافر دلان حسن در آن سوی جان هنوز
صد غم رسید و مرگ هنوزم نمی رسد
صد داد رفت و مهرهٔ ما رایگان هنوز
عالم تمام پر ز شهیدان فتنه گشت
ترک مرا خدنگ بلا در کمان هنوز
بیدار اند شب همه خلق از نفیر من
و آن چشم نیم مست بخواب گران هنوز
هر دم کرشمهای دی افزون و وانگهی
خسرو ز بند او بامید امان هنوز

[۱۶]

جان ز تن بردی و در جانی هنوز دردها دادی و درمانی هنوز
آشکارا سینه ام بشگافتی همچنان در سینه پنهانی هنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ ناز واندرین ویرانه سلطانی هنوز
هر دو عالم قیمت خود گفتهٔ نرخ بالا کن که ارزانی هنوز
خون کس یا رب نگیرد دامنت گرچه در خون تا پشیمانی هنوز
باز گریه چون نمک بگداختم تو ز خنده شکرستانی هنوز
جان ز بند کالبد آزاد گشت دل بگیسوئی تو زندانی هنوز
پیری و شاهد پرستی ناخوش است خسروا تا کی پریشانی هنوز

[۱۷]

او می رود و عاشق مسکین نگرانش
چون مرده که در سینه بود حسرت جانش
بے مہر سواری که عنان باز نه پیچد
آویخته چندین دل خلقی به عنانش
یاد است که در خواب شبش دیده ام اما
از بیخبری یاد ندارم که چسانش
یادش دهی ای باد گهی نام گدای
تا دولت دشنام بر اید ز زبانش
بسیار بکوشم که بپوشم غم خود لیک
آتش چو بگیرد نتوان داشت نهانش
از ناله ام ار خلق نخسپد عجبی نیست
از بخت خودم در عجب و خواب گرانش

[۱۸]

دی می گذشت و سوی او دلها کشان از هر طرف
صد عاشق گم کرده دل سویش روان از هر طرف
گلگون نازش زیر زین غمزه بلای در کمین
می مرد ازان پیکان کین پیر و جوان از هر طرف
ژولیده زلف فتنه خو مخمور چشم کینه جو
موها پریشان کرده خونها چکان از هر طرف
دلها و جانها چون خسی در راهش آب هر کسی
میرفت و جان و دل بسی گیسو کشان از هر طرف
دلهای پر خون جگر گرد کمر گه سر بسر
چون لعل و یاقوت و گهر گرد میان از هر طرف

زنجیر دلها سوی او دلال سرها خوی او
در چار سوی روی او بازار جان از هر طرف
کعبه که یادش میرود لبیک حاجی نشنود
گر چه به پابوسش رود صد کاروان از هر طرف
یک روز میرد چاکرت پیش درت دور از برت
فریاد خیزد بر درت مسکین فلان از هر طرف
زین پس که از خوی بدت آهنگ بیرون باشدت
توسم که چون خسرو صدت گیرد عنان از هر طرف

[۱۹]

دی مست میرفتی بتا از کرده از ما یکطرف
شبدیز را مطلق عنان پیچیده صدا یکطرف
تا بر رخ زیبای تو افتاده زاهد را نظر
تسبیح زهدش یکطرف ، مانده مصلا یکطرف
در چار حد کوی خود افتاده بینی بنده را
تن یکطرف ، جان یکطرف سر یکطرف پا یکطرف
سلطان خوبان میرسد هر سو گروه عاشقان
چاووش شه کو تا کند مشت گدا را یکطرف
نوشین شراب لعل او شد مجلس ما بی خبر
ساقی صراحی یکطرف مستان رسوا یکطرف
جان خسرو دلخسته را خون ریختن فرموده است
خلقی بمنت یکطرف آن شوخ تنها یکطرف

[۲۰]

دل رفت ز تن بیرون دلدار همان در دل
افتاد سخن در جان گفتار همان در دل

گفتم نکنم یادش مانا که بماند جان
شد کیسه همه خالی طرار همان در دل
یک شهر پر از خوبان ده باغ پر از گلها
صد جای بهم دیده دیدار همان در دل
قربان شوی بهرش کافزون شودی عمرش
با جان خود این خواهم با یار همان در دل
آزار چو بتراود گویند که به گردد
خونابه روان از چشم آزار همان در دل
نی بگسلم از مویش کز شرم مسلمانان
تن را به نماز آرم زنار همان در دل
در کعبهٔ و بت خانه هر جا که رود خسرو
دل با در تو بدخو دیوار همان در دل

[۲۴]

زین پس سر آن نیست که من زهد فروشم
ساقی قدحی ده که بروی تو بنوشم
جای که نیرزد به جوی دین درستم
این توبهٔ صد جای شکسته چه فروشم
بس پیر خرابات که بردم بشفاعت
تا باز کشادند در میکده دوشم
اکنون که سرم شد به در میکده پامال
چون بهم دهد محتسب از مالش گوشم
بوده است ز هوش و دام اندیشهٔ تیمار
المنة لله که نه دل ماند نه هوشم

شد آن که مصلا بکتف داشتم اکنون
بازیچه گه مغبچگان شد سر و دوشم
پوشیده بسی خدمت بت کردم و زین پس
زنار هوس می کندم از تو چه پوشم
چون باز نیامد ز بت و بتکده خسرو
اصلاح مزاج سگ دیوانه چه کوشم

[۲۲]

شب من سیه شد از غم مه من کجات جویم
بشب دراز هجران مگر از خدات جویم
تو نه آن گلی که آرد سوی مات هیچ بادی
ز پی دل خود است این که من از صبات جویم
سخنت بسرو گویم خبرت ز باد پرسم
تو درون دیدهٔ و دل ز کسان چرات جویم
تو اگر کشی دل من دل خود فدات سازم
طلب ار کنی سر من سر تو رضات جویم
چو ز آه دردمندان سوی تو رود بلای
بمیان سپر شوم من رد آن بلات جویم
بدل و بدیدهٔ و جان همه جا نهفته هستی
چو نه بینم آشکارا به کدام جات جویم
تو که بردرت شده گم سر و تاج پادشاهان
چه خیال فاسد است این که من گدات جویم
سر گم شده نجوید مگر از درتو خسرو
ز کجاست بخت آنم که بزیر پات جویم

[۲۳]

ابر می بارد و من بار سفر می بندم
چشم می گرید و من از تو نظر می بندم
چشم گریان بلبش داشته یعنی در راه
بر سر آب روان پل ز شکر می بندم
بهر بستن بدگر چیز همی آرم دست
وز تحیر بغلط چیز دگر می بندم
جان گسستست گره میزنمش از گریه
گرهش سست تراست ارچه که تر می بندم
در تو میدیدم و خون آمد و چشمم بر بست
بنگر از چشم خود ای دیده چه بر می بندم
نمکی بخش بخسرو که برای توشه
خون برون میکشم از دیده جگر می بندم

[۲۴]

خونی ز چشمم میرود از انتظار کیست این
تیری بجانم می خلد از خار خار کیست این
دل کز بتان بو الهوس آلوده بودم باز پس
بار دگر دزدید کس بنگر که کار کیست این
هر دم بخاکی میزنم هر دم غباری حاصلم
اے خاک بر فرق دلم آخر غبار کیست این
گویند اگر آن خوش پسر آید چه آری در نذر
در چشم من چندین گهر بهر نثار کیست این
گلگون ناز انگیخته گیسو کمند آویخته
دل برده و خون ریخته چابک سوار کیست این

بسته مهانی در کمر چون ریسمانی در گهر
باری مرا ناید به بر تا در کنار کیست این
بر خسرو بیدل ز کین اسپ جفا را کرد زین
گو ریزیش خون بر زمین در انتظار کیست این

[۲۵]

آن کیست که می آید صد لشکر دل با او
درویش جمالش ما ، سلطان دل ما او
بی صبح شبی خواهم کو را غم دل گویم
من گویم و او خندد تنها من و تنها او
مهتاب چه خوش بودی کو بودی و من تنها
لب بر لب و رو بر رو او با من و من با او
هستم بخیال خود من با او و او با من
یا رب چه خیالست این اینجا من و آنجا او
گویند چرا آخر دیوانگیت جوشد
دیوانه چرا نبوم ساده من شیدا او
من خسرو و او زیبا یا رب که چه شکلست این
دیباچهٔ دلها من آئینهٔ جانها او

[۲۶]

سر پر خمار شب بکنار که بودهٔ
لبها نگار همدم و یار که بودهٔ
سنبل ز تاب رفته و نرگس بخواب ناز
شب تا بروز بادہ گسار که بودهٔ
با چشم آهوانه که شیران کند شکار
ای آهوی رمیده شکار که بودهٔ

سروت هنوز هست در آغاز خاستن
زان سرو نیم رسته بهار که بودهٔ
کارت چنین که پردهٔ دلها بریدنست
امشب به پرده محرم کار که بودهٔ
بر ریش خسروت نمکی هم دریغ بود
مرهم رسان جان نگار که بوده

[۲۷]

مسلمانان گرفتارم به دست نامسلمانی
ازین دیوانه بدمستی و بدخوی و نادانی
بطوه آشنا بندی بخنده پارسا بهلی
بغمزه ناخدا ترسی بکشتن نامسلمانی
بابرو فتنه انگیزی بنرگس عالم آشوبی
ببالا آفت آبادی بکاکل کافرستانی
دعای بد نخواهم کرد لیکن این قدر گویم
که یا رب مبتلا گردی چو من روزی بهجرانی
طبیبا بهر جان ناتوانم غم خوری چندی
رها کن جان هم زیرا نمی ارزم بدرمانی
کنون یاد شراب و شاهد و مستی و قلاشی
گذشت است آنچه خسرو راسری بوده است و سامانی

[۲۸]

کج کلها ستمگرا تنگ قبای کیستی
لابه گرا و دلبرا عشوه نمای کیستی
زیر کلاه جعد تر تا کمرت کشیده سر
بسته بچابکی کمر چست قبای کیستی

مرکب ناز کرده زین داده بغمزه تیغ کین
ساخته آمده چنین تا ز برای کیستی
سینهٔ بنده جای تو دیده بزیر پای تو
ما همه در هوای تو تو بهوای کیستی
تا رخ خود نمودهٔ جان و تنم ربودهٔ
آتش من فزودهٔ مهر فزای کیستی
خسرو خسته را سخن بسته شد از تو در دهن
طوطی شکرین من نغمه سرای کیستی

[۲۹]

ای باد حدیثی ز لب ماهش بگوی
در گوشهٔ و در گوش به تنهاش بگوی
از هر نمطی افگنی آنجا سخن خوش
زانگونه که دانی سخن ماهش بگوی
از غمزهٔ او هست همه شهر بفریاد
آهسته بدان نرگس رعناش بگوی
با دامن پر خون چو ببازار فتادم
حال من تر دامن شیداش بگوی
گستاخی بوسه نکنی لیک پیامی
از هر لب من با کف هر پاش بگوی
هر چند دل خسرو ازو سوخت نخواهم
کش هیچ ملامت کنی اماش بگوی

[۳۰]

ای چهرهٔ زیبای تو رشک بتان آذری
هر چند وصفت میکنم در حسن ازان بالا تری

هرگز نیاید در نظر نقشی ز رویت خوبتر
شمسی ندانم یا قمر حوری ندانم یا پری
آفاق را گردیده ام مهر بتان ورزیده ام
بسیار خوبان دیده ام لیکن تو چیز دیگری
عالم همه یغمای تو خلقی همه شیدای تو
آن نرگس شهلای تو آورده رسم کافری
ای راحت و آرام جان با قد چون سروی روان
زینسان مرو دامن کشان کآرام جانم می بری
عزم تماشا کردهٔ آهنگ صحرا کردهٔ
جان و دل ما بردهٔ اینست رسم داوری
خسرو غریب است و گدا افتاده در شهر شما
باشد که از بهر خدا سوی غریبان بنگری

[۳۱]

امناک فی نوادی الم بلا دواء
ارنی الجمال یوماً کرماً ألا شفائی
منم و در تو هر شب خبرت نه تاکجایم
تو درون سینه خرم خبرم نه کجائی
أ یسوغ یا بخیلی نهب الثمار غیراً
و ذوو المنی دواماً حرموا عن اجتناء
همه بهره مند رویت من حیرت و خموشی
که گدای بے زبان را ندهد کسی گدائی
أ نظام مستمراً بتغافل و عیفی
بهواک کل لیل ربطت علی السماء

ز حیات من ز هجرت دو دمی بحواله مانده
ز تو این قدر نباید که دمی بسویم آئی
و اذا مضیت شوقاً بفنائک المعلی
رأت العیون حالی و بکت علی فنائی
ز سنان و تیر اگرچه دل و سینه زخمی گردد
نبرد بنزد خسرو چو جراحت جدائی

[۳۲]

مرا دوش گوئی بخواب آمدی بکف کرده، جام شراب آمدی
کجا بودی اے اختر نیک فال که مه رفتی و آفتاب آمدی
بدل بردنم آمدی عیب نیست که مستی ببوی کباب آمدی
چو جستند در گریهٔ من سبب تو بودی که بر روی آب آمدی
ز حیرت بخواب اجل می روم که پندارم این تا بخواب آمدی
شبے داشتم تیره از روز بد شدم خوش کهچون ماهتاب آمدی

[۳۳]

می گذشتی و بسویت نگران میدیدم
زار می مردم و در رفتن جان میدیدم
همچو دزدی که به کالای گران در نگرد
جان بکف کرده بدزدی و نهان میدیدم
از دل گمشده سر رشته همی جستم باز
گه بفتراک و گهی سوی عنان میدیدم
او ز محرومی بخت بد من میخندید
من طمع بسته درآن شکل و دهان میدیدم
او شد از دیدهٔ من غائب و من هم زانسو
جان کنان می شدم و موی کنان میدیدم

ای خوش آن شب که بیاد رخ تو می‌خفتم
در دلم بودی و در خواب همان میدیدم

[۳۴]

ای سرو بلندت را صد فتنه به هر گامی
هست از رخ گل رنگت اندر رخ گل وامی
یک مرده اگر عیسی کردی بدعا زنده
صد مرده کنی زنده ای شوخ به دشنامی
خورشید رخا از تو یک ذره چه کم گردد
در کلبهٔ تاریکم گر چاشت کنی شامی
ای مرغ که می نالی از بهر گلی چندین
مانا که ندیدستی رخسار گل اندامی
در قید بمود آهو خسرو به خم گیسو
هر صید بود لابد در کشمکش دامی

تیرھواں باب

خسرو کی مشہور تصانیف

——:o:——

۱ - اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز

خسرو کی یہ ضخیم تصنیف سنہ ۷۱۹ھ میں مکمل ہوئی - اس وقت خسرو کی عمر تقریباً ستر سال کی تھی - دیباچے سے معلوم ہوتا ھے کہ کتاب کے چار حصے جنھیں "رسالے" کہا گیا ہے سنہ ۶۸۲ھ تک لکھے جا چکے تھے لیکن کچھ عرصے بعد خسرو نے ایک پانچواں رسالہ اور مرتب کر کے کتاب میں بڑھا دیا - (۱) اس پانچویں رسالے میں زیادہتر وہ خط ھیں جو اُنھوں نے ابتدائی عمر میں تحریر کئے تھے -

اس کتاب کی تالیف کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مرصع اور مزین نثر کے نمونے پیش کئے جائیں اور مختلف قسم کے صنائع اور بدائع کے استعمال کو واضح کیا جائے اور اس طرح اگر ایک طرف یہ کتاب خسرو کا سکہ اقلیم نثر میں بھی اُسی طرح رواں ہونا ثابت کرتی ھے جس طرح مملکت نظم میں، تو دوسری طرف اس زمانے کی شوقین طبع کاتبوں اور نثر نویسوں کے لیے ایک

---

(۱) اعجاز خسروی رسالہ ۴ ص ۳۲۴ و رسالہ ۵ ص ۱۶۷ -

قابل تقلید نمونہ اور معیار بھی مہیا کرتی ہے - یہ سچ ہے کہ آج چھے سو سال کے بعد شاید بہت کم لوگوں میں اتنی ہمت اور اس قدر استقلال ہوگا کہ وہ اس کتاب کی بغور ورق گردانی بھی کر سکیں ، اس کے نکات اور مطالب کو سمجھنا یا ان سے مستفید ہونا تو بڑی بات ہے - زمانہ بدل گیا ، مذاق تبدیل ہوگئے - جو چیز اس وقت مقبول تھی وہ اب مردود ہے اور جو بات اس زمانے میں رائج تھی اب اس کی کساد بازاری ہے - اِس زمانے کا کوئی تنقید نویس اگر خسرو کی اس تصنیف کو پڑھے گا تو پہلا خیال اس کے دل میں یہی آئے گا کہ خسرو نے ناحق اس قدر کاوش کی اور بیکار ایک طومار لکھ مارا ، لیکن اگر وہ صبر اور ہمدردی سے کام لے کر اعجاز خسروی کی خوبیوں اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرے گا تو یقین ہے کہ اس کو خسرو کی یہ تصنیف فضول اور ان کی یہ مشقت ادبی بیکار نہ معلوم ہوگی - اس لیے کہ قطع نظر اس سے کہ اس کتاب میں اس زمانے کے بہترین اسالیب نثر کے نمونے مل سکتے ہیں جو خصوصاً ہندوستان میں فارسی نثر کے ارتقا کے مطالعے میں بہت مفید ہو سکتے ہیں ، اعجاز خسروی میں لغوی ، نحوی ، ادبی ، تاریخی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بےشمار معلومات مل سکتی ہیں جو کتاب کے صفحات میں جگہ جگہ پراگندہ ہیں اور اس زمانے کے کوائف اور حالات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں -

خسرو کا دعوی ہے کہ نثر کا جو اسلوب اعجاز خسروی میں پیش کیا گیا ہے وہ ان کی اپنی ایجاد ہے ، لیکن اس کے ساتھ ہی پہلے رسالے کے شروع میں وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان

میں فارسی نثر کی ایک نئی طرز تکمیل کو پہنچ رہی تھی جس میں صنائع اور بدائع اس طرح شامل تھے جیسے پانی میں گلاب اور جس کے ذوق سے ما وراء النہر اور خراسان کے " پنج شکن " بالکل بے بہرہ تھے اور اسی طرز کے بہترین نمونے وہ اس تصنیف میں پیش کرنا چاہتے ہیں - ظاہر ہے کہ خسرو اپنے زمانے کے مذاق سے بالکل بے نیاز نہ ہو سکتے تھے اور ان کی نثر میں وہ رنگ ضرور جھلکتا ہوگا جو ان کے ہمعصر ادیبوں اور کاتبوں کی تحریر میں موجود تھا ' لیکن خسرو کی جدت یہ ہے کہ انہوں نے لفظی صنائع کو حتی المقدور ترک کر کے زیادہ تر معنوی صنعتوں خصوصاً خیال اور ایہام سے کام لیا ہے اور یہ التزام رکھا ہے کہ عبارت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ہر ایک ٹکڑے میں ایک خاص " نسبت " یعنی مناسبت سے الفاظ استعمال کئے جائیں ' مثلاً اگر آگ کا لفظ ہے تو باقی عبارت میں آگ کے متعلقات اور مناسبات ہی مذکور ہوں ' اگر پانی کا استعارہ ہے تو پانی کے لوازمات ہی اس ٹکڑے میں آئیں ' اس میں شبہہ نہیں کہ اس قسم کی تحریر میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس التزام کو نباہنا آسان نہیں اور خسرو کا سا قادر کلام ادیب ہی اس کو کامیابی سے کام میں لا سکتا تھا ' اس کے علاوہ خسرو نے نئی تشبیہیں ' نئے استعارے ' اور کئی طرح کی نئی صنعتیں بھی اس کتاب میں استعمال کی ہیں جو بقول ان کے سب ان کی ایجاد ہیں - ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کتاب میں عربی اور فارسی کے جتنے بھی اشعار استعمال ہوئے ہیں ' وہ سب خسرو کی اپنی تصنیف ہیں -

اس مختصر سی کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ

اعجاز خسروی کے مطالب کو پورے طور پر واضح کیا جا سکے ، اس لئے میں حسب ذیل مختصر سے تجزیے پر کفایت کرتا ہوں ، امید ہے کہ اس سے کچھ اندازہ کتاب کی نوعیت اور موضوع کا ہو سکے گا ۔

دیباچے میں حمد ، نعت ، منقبت حضرت نظام الدین اولیا ، مدح سلطان علاء الدین وغیرہ کے بعد خسرو نے فارسی نثر کے ان نو اسلوبوں کا ذکر کیا ہے جو اُن کے زمانے میں رائج تھے ۔ یعنی

۱ ۔ صوفیہ اور اولیا کا اسلوب جو دو قسم کا ہے ، ایک تو اہل تمکین و مقامات کا جس کا نمونہ کشف المحجوب ، سلوک المسافرین وغیرہ میں مل سکتا ہے اور دوسرے اہل حال کا جس کی مثال الغزالی اور عین القضاۃ الہمدانی کی تصانیف میں موجود ہے ۔

۲ ۔ علمای متحقق کا مثلاً الغزالی کی فارسی تصانیف اور احیاء العلوم کا فارسی ترجمہ ۔

۳ ۔ کاتبوں اور انشانویسوں کا ، جس میں عربی اور فارسی الفاظ اور فقروں کو خوبی سے ترکیب دی جاتی ہے اور جس کی بہترین مثال کلیلہ دمنہ کا فارسی ترجمہ ہے جو بہائی بغدادی نے کیا ہے ۔

۴ ۔ علما اور فضلا کا جس میں ہر فن اور علم کی مناسبت سے اصطلاحی الفاظ اور عبارتیں استعمال کی جاتی ہیں ۔

۵ ۔ خطیبوں اور واعظوں کا ، جو سودھا سادھا بھی ہو سکتا ہے اور رنگین بھی ۔

۶ ۔ مشائخ یا مدرسین کا ، جو ایک ایسے چکنے پتھر کی طرح

ہے جیسے کسی بدسلیقہ مزدور نے راستے کے عین بیچ میں رکھ دیا ہو اور جس سے عقلمند تو بچ کر نکل جائیں لیکن بہت سے بیوقوف پھسل جائیں ۔ اس اسلوب کے دلدادہ اکثر اپنی ہٹ کے پکے اور عقلمندوں کی تنقید پر کان نہ دھرنے والے ہوتے ہیں ۔

۷ ۔ عام آدمیوں کا اسلوب جو سادہ ، سلیس اور مفید مطلب ہوتا ہے ۔

۸ ۔ مزدوروں اور کاریگروں کا ، جو ان کے پیشوں سے مناسبت رکھتا ہے ۔ اس میں کسی قسم کی بناوٹ یا رنگینی نہیں ہوتی اور

۹ ۔ ظریفوں ، مسخروں اور بھانڈوں وغیرہ کا جو خاص طور پر خوش کرنے اور ہنسانے کے لیے موزوں ہوتا ہے ۔

اس کے بعد خسرو خود اپنے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں جو بقول ان کے سب کاتبوں کی قدرت سے باہر ہے اور جو تحریریں اس اسلوب میں لکھی گئی ہیں وہ وحی خفی کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ پھر کتاب کی ترتیب یوں بیان کرتے ہیں کہ اس میں کل پانچ رسالے یعنی بڑے حصے ہیں ، ہر ایک رسالے میں کئی "خط" یا باب ہیں اور ہر ایک خط میں متعدد "حرف" یا مضامین ہیں ۔

پہلے رسالے میں وہ غرض تصنیف یہ بتاتے ہیں کہ پرانی وضع کی انشا میں کوئی خاص لطف اور چاشنی نہ تھی بلکہ خانہ بدوش ترکوں یا ہندوستانی ماہی گیروں کے کھانے کی طرح بدمزہ تھی ۔ اس لیے انہیں ایک نئی طرز کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا جس میں زیادہ تر معنوی صنعتوں خصوصاً ایہام اور خیال سے کام لیا گیا ہے ، اس کے بعد خسرو مناسبت الفاظ اور جملوں اور فقروں کی موزوں ترتیب و ترکیب کی اہمیت بیان کرتے ہیں

اور ہدایتیں لکھتے ہیں - اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے خیال میں عربی الفاظ کا استعمال جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے -

دوسرے رسالے میں متفرق قسم کے خط ہیں اور بعض شاہی فرمان بھی ہیں ' ایک پورا خط عربی میں مولانا شہاب‌الدین کے نام ہے اور ایک خالص فارسی میں ہے ' کچھ نئی عربی اور فارسی امثال ہیں - یہ خسرو کی تصنیف ہیں اور ان میں سے بعض واقعی دلچسپ ہیں - ایک "خط" میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقی دانوں کا ذکر ہے ' آلات موسیقی کے نام بھی دیے ہیں جن میں پھکان ' عجب رود ' چھرہ ' دھل ' چنگ ' رباب ' دف نای ' طنبور ' دستک ' دستان ' شہنای ' بابلک ' دم سرفی اور بیترہ شامل ہیں - ارباب موسیقی میں تو مرتی خاتون محمد شاہ ' کنجشک ' خلیفہ حسینی اور اخلاق وغیرہ کا ذکر کیا ہے - بعض خطوں میں مختلف علوم مثلاً نجوم ' طبیعیات ' طب ' فقہ اور بعض کھیلوں مثلاً شطرنج وغیرہ پر بحث کی گئی ہے -

تیسرے رسالے میں لفظی صنائع کی مثالیں دی گئی ہیں جن میں سے بعض خسرو کی ایجاد ہیں -

چوتھے رسالے میں پانچ "خط" ہیں - تمہید کے طور پر خسرو نے اس رسالے میں بھی انشا کے مختلف اسلوبوں پر بحث کی ہے اور ایہام اور خیال سے جو خوبی پیدا ہوتی ہے اسے واضح کیا ہے ' اس کے بعد صنائع معنوی کا ذکر ہے اور متفرق خطوط ہیں جن میں مختلف علوم اور فنون پر بحث کی گئی ہے ' - خاص طور پر قابل ذکر ایک تو علاءالدین کا وہ فرمان ہے جو اس نے تخت نشینی کے بعد لکھوایا تھا اور ایک خط بدر حاجب کا

خضر خاں کے نام ہے جس کے اسلوب کی خسرو نے بے انتہا تعریف کی ہے - ان میں سے بعض خط یقیناً فرضی اور موسوم اشخاص کے نام ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو خسرو نے اپنے دوستوں اور ہمعصروں کو لکھے تھے - یہ رسالہ بہت دلچسپ ہے اور کارآمد بھی، کیونکہ اس سے خسرو کے زمانے کے ذہنی ارتقا اور علمی مشاغل کے متعلق مفید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں، ضمناً بعض ان درسی کتابوں کے نام بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو اس عہد میں مقبول اور رائج تھیں، مثلاً پانچ گنج، کنز فقہ، اخبار ناجین، اخبار و نیرین (؟) وغیرہ -

پانچویں رسالے میں وہ خط وغیرہ ہیں جو خسرو نے اوائل عمر میں لکھے تھے اور اس لیے یہ اس اسلوب کا نمونہ نہیں کہے جا سکتے جو انھوں نے بعد میں مکمل کیا، لیکن پھر بھی ان میں سے بعض خط بہت دلچسپ ہیں، اور بہت اچھے پیرایے میں لکھے گئے ہیں، خصوصاً وہ خط جو انھوں نے اپنے دوستوں نجم الدین حسن، تاج الدین زاہد وغیرہ کو لکھے ہیں اور جن میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے - چار خطوں میں ایک کنجوس خواجہ کی ہنسی اڑائی ہے - یہ خط خسرو کی ظرافت طبع کا اچھا نمونہ ہیں - اگرچہ یہ ظرافت ایک قسم کی عریانی سے خالی نہیں ہے جو قدما کی اس قسم کی تحریروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے -

پانچویں رسالے کے بعد ایک خاصا طولانی تتمہ یا خاتمۂ کتاب ہے جس میں حسب معمول خسرو اپنی محنت و مشقت کا جو انھیں کتاب کی تالیف میں اٹھانا پڑی ذکر کرتے ہوئے سہو و خطا سے چشم‌پوشی کی درخواست کرتے ہیں اور اپنے

بعض دوستوں خصوصاً شہاب الدین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اسے اس کی ترتیب میں مدد دی۔

خسرو کی خوش طبعی اور ظرافت کے چند نمونے اس کتاب سے پیش کرتا ہوں۔

دعاؤں اور بد دعاؤں کی مثالیں :—

اس کا طائر روح خدا کے ہاتھ پر بیٹھے؛ خدا اسے دوزخ کے کتوں سے بچائے؛ کوے اس کی چربی میں انڈے دیں؛ وہ بھوتوں کے ناخنوں سے باندھا جائے؛ وہ قبر میں سور بنے' (گرزالدین نامی کسی شخص کے لیے) : دخل الخشب فی استہ؛ (معشوق کی طرف سے عاشق کے لیے) : اس کی روح ہمارے گھوڑے کے پسینے سے مدہوش رہے جب تک ہمارا گھوڑا اس کے قبر پر خرام ناز کرتا رہے' (ایک شطرنج باز کے لیے) : وہ فیل کے نیچے مرے۔

ایک نیک سیرت شیخ کی تعریف یوں کرتے ہیں : وہ ایک ایسا پرند ہیں کہ اگر ان کے نیچے شیطان کا انڈا سینے کو رکھا جائے تو اس میں سے جبرائیل نکل آئیں'۔

بعض طنزیہ فقرے :—

کفن دزد سے زیادہ نرم دل' گورکن سے زیادہ مبارک قدم' ناداشت سے زیادہ باحیا' لوہار سے زیادہ مہربان' عامل سے زیادہ نیک مزاج' سود خواروں سے زیادہ پروردۂ حلال' چغلخور سے زیادہ بھروسے کے قابل' چکی کے بیل سے زیادہ دوربین' سوتے ہوئے خرگوش سے زیادہ بیدار۔

رسائل الاعجاز نولکشور پریس میں دو مرتبہ چھپ چکے ہیں۔ قلمی نسخے بکثرت موجود ہیں۔

۲ - خزائن الفتوح یا تاریخ علائی

علاءالدین خلجی کے عہد کی یہ مختصر سی تاریخ خسرو نے سنہ ۷۱۱ھ میں پوری کی اور اس میں اس بادشاہ سے متعلق وہ واقعات درج ہیں جو سنہ ۶۹۵ھ سے لے کر سنہ ۷۱۱ھ تک ظہور میں آئے - کتاب کی وجہ تصنیف خسرو دیباچے میں یوں بیان کرتے ہیں :—

"اس بندۂ مسکین خسرو کی قسمت میں، اگرچہ اس کی قلم اپنی قدرت اور ہمہ گیری کے باوجود اس عظیم الشان بادشاہ کے اوصاف کا ایک شمہ بھی پوری طرح بیان کرنے سے عاجز ہے، یہ لکھا تھا کہ وہ اس کے عہد کی عظمت و شوکت کی ثناخوانی کرے، اور اس لیے خداے تعالیٰ نے اپنے جود و کرم سے آسمان اور زمین کے سب خزانوں کے دروازے اس کے لیے کھول دیے اور اسے ایسے جواہر بےبہا عطا کئے جو بحتری اور ابو تمام جیسے شاعروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے ہے، پھر بھی یہ گراں بہا موتی اس لائق نہ تھے کہ اس کے آستان فلک پایہ پر نچھاور کئے جاسکیں، لیکن چونکہ بازار فطرت میں اُن سے بہتر متاع دستیاب نہیں ہو سکتا تھا اس لیے مجبوراً مجھے ان موتیوں ہی کو پروکر بادشاہ کے لیے تحفہ تیار کرنا پڑا اور اس امید میں اس کے آگے پیش کرتا رہا کہ وہ چونکہ لطف و کرم کا دریا ہے ان کو قبول کر لے گا - اور جب میں نے دیکھا کہ اس بندے کے کچھ الفاظ کو بادشاہ کی درگاہ میں قبول حاصل ہوا تو مجھے نظم کی طرح نثر میں بھی طبع آزمائی کا خیال آیا کہ شائد بادشاہ میرے کلام پر ایک نظر ڈالے جس طرح سورج، سنگ قابل پر نظر ڈالتا ہے - اگرچہ میری قلم

ہمیشہ نظم کے لیے وقف رہی ہے اور کبھی محاسن نثر کی طرف متوجہ نہیں ہوئی، میں اس عروس کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بڑے آدمیوں کی آنکھ برائیوں کی طرف مائل نہیں ہوتی - اگر مجھے عمر جاوداں مل سکتی تو اس کا بہترین مصرف یہی ہوتا کہ اسے بادشاہ کی مدح و ثنا میں گزار دوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ زندگی مختصر ہے اور اس لیے اس کے اوصاف کے بے پایاں سمندر سے میں ایک چلو بھر پانی لینے ہی پر اکتفا کرتا ہوں "۔

خسرو کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نثر کے میدان میں یہ ان کا پہلا اقدام تھا (۱) اور اگرچہ وہ اپنے دیوانوں کے دیباچوں میں کچھ نہ کچھ نثرنگاری اس سے پہلے ضرور کر چکے تھے اب تک انہیں کسی مستقل منثور تصنیف کا خیال پیدا نہ ہوا تھا - لیکن تاریخ علائی کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے خسرو نثر میں ایک نیا اسلوب قائم کر چکے تھے اور یہ اسلوب وہی تھا جس کا ذکر انہوں نے اعجاز خسروی میں کیا ہے یعنی ایہام اور خیال کا استعمال اور عبارت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ہر ایک ٹکڑے میں ایک علحدہ " نسبت " کو کام میں لانا یعنی ایک خاص چیز کی مناسبت سے الفاظ اور جملے استعمال کرنا - اس طرز تحریر میں تکلف اور پیچیدگی کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہے

---

(۱) اعجاز خسروی کے پہلے چار رسالے اس سے پہلے مرتب ہو چکے تھے، لیکن سنہ ۷۱۹ھ سے پہلے کتاب کی شکل میں شائع نہ ہوئے تھے -

اور اسی لیے خزائن الفتوح کو ٹھیک سے سمجھنا آسان کام نہیں ہے - تو بھی خسرو کی قابلیت اور شگفتگی طبیعت کی داد دینا پڑتی ہے کہ انھوں نے اس مشکل اور نئے اسلوب کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ اول سے آخر تک نباہا ہے بلکہ اس میں ایک خاص لطافت اور ایک عجیب طرح کی ظرافت بھی پیدا کر دی ہے - کسی تاریخی کتاب کے لیے یہ طرز تحریر موزوں تھا یا نہیں ؟ یہ دوسرا سوال ہے - خسرو نے باوجود اس کے کہ بادشاہ کی مدح و ثنا میں بہت مبالغہ برتا ہے ، اس کا التزام رکھا ہے کہ تاریخی واقعات کی صحت اور ترتیب میں کوئی خلل پیدا نہ ہو - تاہم یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ انھی واقعات کو سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کردیتے تو پڑھنے والوں کو زیادہ آسانی رہتی - مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خسرو مورخ نہ تھے بلکہ ادیب تھے اور ادیب بھی ایسے کہ جن کی طبیعت کی جولانگاہ زیادہ تر نظم کا میدان رہا تھا ، اس لیے اُن کے لیے سیدھی سادھی تحریر میں کیا دلکشی ہو سکتی تھی اور بغیر اس تکلف اور رنگینی کے خزائن الفتوح کی ادبی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ؟

خزائن الفتوح میں جو تاریخی واقعات مذکور ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

۱ - علاءالدین کی مہم دیوگیر - جب وہ کڑہ مانک پور کا حاکم تھا ، (ربیع الثانی سنہ ۶۹۵ھ)

۲ - اسی سال اس کی دہلی پر چڑھائی اور تخت نشینی -

۳ - سلطنت میں امن امان اور خوش حالی پیدا کرنے کے لیے اور ہر قسم کے الحاد اور بد اخلاقی کی روک تھام کی

تدابیر جو اس بادشاہ نے اختیار کیں -

۴ - علاءالدین کی بناکردہ عمارتیں یعنی جامع مسجد، علائی مینار، شہر دہلی کی فصیل، اور حوض شمسی کی تعمیر اور مرمت یا اضافہ وغیرہ -

۵ - مغلوں کے خلاف اس کی کامیاب جنگ اور ان کی گوشمالی -

۶ - گجرات اور رنتھنبور کی فتح، (سنہ ۶۹۸ھ اور سنہ ۷۰۰ھ)

۷ - مالوے کی تسخیر، (سنہ ۷۰۵ھ)

۸ - چتوڑ کی مہم، (سنہ ۷۰۳ھ)؛

ملک کافور کی سرکردگی میں دیوگیر کی مہم، (سنہ ۷۰۶) اور بادشاہ کے ہاتھوں سیوانہ کی تسخیر (۷۰۸ھ)

۹ - ملک کافور، کا تلنگ یا تلنگانے کو فتح کرنا، (سنہ ۷۰۹ھ)

۱۰ - ملک کافور کا معبر کو فتح کرنا، (سنہ ۷۱۰ھ)

اور اس کی فتحمند فوجوں کی دہلی میں واپسی، (سنہ ۷۱۱ھ

ان تمام باتوں کو خسرو نے حسب معمول بہت صحت اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور بعض ایسی تفصیلات دی ہیں جو اور تواریخ میں نہیں مل سکتیں، اس لیے جب اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ علاءالدین کے عہد کی یہی ایک ایسی تاریخ ہے جو اسی زمانے میں لکھی گئی تو خزائن الفتوح کی تاریخی اہمیت آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے اور اس بات کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کا تحقیق اور غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے - بدقسمتی سے اس کتاب کے قلمی نسخے غالباً دو چار سے زیادہ نہیں ہیں، جن میں سے ایک

تو برٹش میوزیم لندن میں ہے اور دوسرا کلکز کالج کمبریج کی
لائبریری میں - علی گڑھ سے خزائن الفتوح کا متن شائع ہو چکا
ہے جو برٹش میوزیم کے نسخے پر مبنی ہے لیکن اس میں صحت
کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ' پروفیسر محمد حبیب نے اس کا
انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا تھا لیکن چونکہ اصل متن ہی صحیح
نہ تھا ' اس لیے ظاہر ہے کہ ترجمے میں صحت پیدا نہ ہو سکتی
تھی - ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کا متن تحقیق
اور تدقیق کے بعد تیار کیا جائے اور اس کا قابل اعتماد انگریزی
یا اردو ترجمہ بھی کیا جائے تاکہ اس بیش قیمت تصنیف سے
ہمارے تاریخ بین اور تاریخ نویس احباب مستفید ہو سکیں '

کتاب کے اسلوب کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں ' ایک
دو خصوصیتوں کا ذکر اور کرنا چاہتا ہوں ' ان میں سے
ایک تو یہ ہے کہ خسرو نے کاتبوں کی نادانستہ ستم ظریفی سے
بچنے کے لیے جو تاریخوں کو اکثر مسخ کر دیتے ہیں تاریخ
بیان کرنے کا ایک بالکل نیا طریقہ اختیار کیا ہے یعنی ہر ایک
واقعے کی تاریخ کو ایک معمے کی شکل میں بیان کیا ہے مثلاً
علی بیگ اور تورتاق مغل سرداروں کی گرفتاری کی تاریخ
یوں لکھی ہے :

" و در تاریخ سال معلوم شد کہ پای علی بیگ در سلسلہ
افتد و سر و پای تورتاق نیز ہمانجا گرفتار آید " - گویا تاریخ معلوم
کرنے کے لیے، ان حرفوں کے عدد جوڑنا چاہییں : علی بیگ کا
پاؤں یعنی آخری حرف (کاف ' ۲۰) " سلسلہ " کے حروف
س ل س ل ہ ' ۱۸۵) تورتاق کا سر یعنی پہلا حرف (ت ' ۴۰۰)
و پاؤں یعنی اخری حرف (ق ' ۱۰۰) - کل مجموعہ ۷۰۵ ہوتا

ھے اور یہی ان سرداروں کی گرفتاری کا ہجری سن ہے -

ایک اور خصوصیت جو رسائل الاعجاز میں بہی خاصی نمایاں ھے، یہ ھے کہ خسرو نے اس کتاب میں عربی کے مفرد بیت جو ان کی اپنی تصنیف ھیں بکثرت استعمال کئے ھیں، مثلاً ھاتھیوں کے متعلق کہتے ھیں :

و سار الفیل و النظار قالوا أقوم الحشر سیرت الجبال

عبارت کے اسلوب کے نمونے کے طور پر دو ایک ٹکڑے یہاں پیش کئے جاتے ھیں :-

" باز نسبت ز آب و ماھی بین - چندانکه در آن خراباد آباد کندور نیز بزخم بہلکھای کشتی شگاف طوفان خون واندند نشان آن ماھی یافته نشد زیرا که در آب ماھی را پی بیرون نتوان کشید مع ھذا جویندگان بیز رگہای آب و رودھای زمین براندن تیزی می بریدند و گمان بردند که مگر سوی جال کوته که شہر قدیم آبادی بیراست رفته باشد، با خود تصور نمودند که نباید که ان ماھی بزرگ ازان جال کوته نیز بجہد، آنجا رویم و شست بکشائیم باشد بدست افتد، بدین اتفاق پیش ازانکه که آبی خورند و یا بآبداری مشغول شوند تندتر از آبی که از بالا فرود آید روان شدند، از آیندگان باخبر صحت اخبار نماھی معلوم گشت که بیز دوآن بیرانه گرد نگشته است و از دریا نیز دست شسته بدان سبب که دریا با چندان ایستاد ازین دریای روان کرانه خواھد کرد - مصرع :- وفی تحت الثری خوفا یغور - "

" اینک این نسبت زین است و لگام - جماعت مسلمانان که بیار دم گسستهٔ ھنود علاقه داشتند و از " لگام لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین " سر بیرون بوده چون دیدند که رای را دوال

حزم بکسست و ایشان را غاشیۂ قیامت بر سر آمد جہان بر ایشان ہمچو حلقۂ زین تنگ شد و موج خون از پشت زین بگذشت ' بیش جای نمد زین خشک کردن نماند ' عنان از موافقت گفتار برتافتند و در زینہار اہل اسلام پناہ جستند و بفتراک دولت " فان حزب اللہ ہم الغالبون" از زینت و تشریف ملک شاد شدند و از قود کش اسوری آزاد ۔ "

٣ ۔ افضل الفوائد

امیر خسرو کو غالباً شیخ نظام الدین اولیا سے آغاز جوانی ہی سے عقیدت رہی تھی ' لیکن سنہ ٧١٣ھ سے پہلے وہ باقاعدہ طریقے پر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل نہ ہوئے تھے ۔ مرید ہونے کے بعد سنہ ٧١٩ھ میں خسرو نے افضل الفوائد کا ایک حصہ حضرت نظام الدین کی خدمت میں پیش کیا ' انھوں نے اسے بہت پسند کیا اور خسرو کی ہمت افزائی کی ' چنانچہ خسرو نے اس کے بعد دوسرا حصہ بھی لکھنا شروع کیا مگر یہ ناتمام رہا ۔ افضل الفوائد کو لکھنے کا خیال خسرو کو یقیناً خواجہ حسن کی تقلید میں پیدا ہوا ۔ چونکہ دونوں دوست اپنے پیر طریقت کی تعظیم و تکریم میں ساعی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے ' اس لیے خسرو نے یہ پسند نہ کیا کہ حضرت نظام الدین کے حالات اور ملفوظات کو جمع اور مرتب کرنے میں وہ خواجہ حسن سے پیچھے رہ جائیں ۔ مگر خواجہ حسن اس معاملے میں خسرو سے بازی لے گئے ' جس کی وجہ غالباً ایک تو یہ تھی کہ انھیں خسرو کی نسبت زیادہ فراغت اور فرصت کتاب کی تصنیف کے لیے ملی اور دوسری یہ کہ اس قسم کی کتاب کے لیے جس طرز تحریر کی ضرورت تھی اس سے خسرو مانوس

نہ تھی - دونوں کتابوں کی زبان بہت ہی سادہ اور سلیس ہے اور اس فارسی نثر کا نمونہ ہے جو اس زمانے میں عام طور پر بولی جاتی تھی اور میرے خیال میں ادبی نقطۂ نظر سے یہی ایک پہلو ہے جس کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں قابل قدر ہیں - خواجہ حسن کی تصنیف نہ صرف زیادہ ضخیم ہے بلکہ جو قبول عام اسے حاصل ہوا وہ خسرو کی کتاب کو نصیب نہیں ہوا -

افضل الفوائد میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا زیادہ تر حضرت نظام الدین کے اقوال ہیں ' لیکن ضمناً ان کی خانقاہ کے کچھ حالات اور ان لوگوں کا بھی تذکرہ موجود ہے جو اکثر آپ کے گرد و پیش رہتے تھے اور جن میں خواجہ حسن ' مولانا وجیہ الدین پایلی ' مولانا شہاب الدین میرٹھی ' مولانا برہان الدین غریب اور عثمان سیاح کا نام اکثر آتا ہے - کتاب کے بعض حصے دلچسپ ہیں ' خصوصاً وہ جن میں حضرت نظام الدین کی رائے بعض متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق لکھی گئی ہے - مثلاً سماع میں سو ہا کرنے کے متعلق خسرو لکھتے ہیں :

" پھر اس کا ذکر ہوا کہ بعض درویش سماع کی محفل میں چیخنے لگتے ہیں اور نامناسب آوازیں نکالتے ہیں - اس پر خواجہ نظام الدین فرمانے لگے کہ وہ بہت برا کرتے ہیں ' اس لیے کہ اہل سماع نے کبھی ایسا نہیں کیا اور یہ کاملوں کا طریقہ نہیں ہے - اس قسم کے طرز عمل کی انہی لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے جو گمراہ اور مذہب طریقت سے نا آشنا ہیں اس لیے کہ حسن بصری کا قول ہے کہ اگر کوئی سماع کے وقت چیخنے لگے تو سمجھو لو کہ وہ شیطان ہے اور شیطان کا پیرو ہے - جس شخص کو کامل روحانیت حاصل ہے وہ (سماع

کے وقت) عالم ملکوت میں پہنچ جاتا ہے - اسے حرکت کرنے یا رقص کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ اس وقت وہ بحر معرفت میں غوطہ‌زن ہوتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالموں کے وجود سے بےخبر ہوتا ہے - جس طرح سونا کٹھالی میں پگھلتا ہے وہی حال اہل سماع کا عالم حیرانگی میں ہوتا ہے'' -

ایک اور مرتبہ سماع میں مزامیر کے استعمال کا ذکر ہوا - اسے خسرو نے یوں لکھا ہے :—

'' جمعرات ہفتم شوال کو مجھے شیخ کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا - اس وقت جو لوگ جمع تھے وہ سماع کا ذکر کر رہے تھے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے دلدادہ ہیں ' عین اسی وقت ایک شخص آیا اور اس نے بیان کیا کہ ایک مقام پر شیخ کے کچھ مرید جمع تھے اور ان کے پاس مزامیر (آلات موسیقی) بھی تھے - اس پر خواجہ فرمانے لگے کہ میں نے اکثر اس قسم کے آلات اور دیگر خلاف شرع باتوں کو منع کیا ہے ' انھوں نے جو کچھ کیا ' اچھا نہیں کیا ' آپ نے اس بات کی بہت تاکید فرمائی بلکہ یہاں تک کہا کہ ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر نہ مارنا چاہیے اور نہ ایک ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ' جس سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ دستک (تالی) بالکل ممنوع ہے ' اور یہ بھی کہا کہ مزامیر کا استعمال نہ کرنا بہتر ہے - اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ سب بڑے بڑے مشائخ سماع سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں اور جو لوگ اس کی اصل قدر و قیمت جانتے ہیں اور ذوق اور جذبہ رکھتے ہیں وہ کسی قوال سے ایک بیت سن کر ہی متاثر ہو جاتے ہیں ' خواہ کوئی ساز ہو یا نہ ہو - برخلاف

اس کے اگر کسی میں ذوق سلیم کی کمی ہے تو اسے اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ اس کے سامنے کئی قوال مختلف سازوں کے ساتھ گائیں۔"

ان دونوں عبارتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دستک اور مزامیر کے استعمال کو حضرت نظام الدین معیوب اور ناشائستہ سمجھتے تھے اور اسی طرح وجد میں چیخنے چلانے کو، لیکن رقص یا ہاتھ پاؤں ہلانا اُن کے نزدیک معیوب نہ تھا، غالباً ان کے زمانے میں مشائخ کا یہی مسلک تھا، لیکن بعد میں مزامیر اور دستک قوالی کا ایک ایسا اہم جزو بن گئے کہ ان کے بغیر مجلس سماع میں کوئی لطف باقی نہیں رہا۔

افضل الفوائد دہلی میں سنہ ۱۳۰۴ھ میں چھپ چکی ہے۔

چودھواں باب

خسرو کی ہندی شاعری ' خالق باری وغیرہ کی تصانیف ' علم موسیقی میں ان کی مہارت

——: o :——

۱ - خسرو کی ہندی شاعری

اب سے پچیس تیس سال پہلے کبھی کسی کو یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ امیر خسرو ہندی کے شاعر نہ تھے یا یہ کہ جو دو ہے ' مکرنیاں ' پہیلیاں وغیرہ ان سے منسوب کی جاتی ہیں وہ ان کی تصانیف نہیں ہیں ' اس لیے کہ ہندوستان میں خسرو کی شہرت ان کے فارسی کلام کی بدولت رہی تو ضرور ہے لیکن صرف ایک محدود طبقے میں ' حالانکہ عوام کے حلقے میں جو شہرت اور مقبولیت انہیں حاصل ہے وہ یا تو اس حیثیت سے ہے کہ وہ حضرت نظام الدین کے خاص الخاص اور محبوب شاگرد تھے اور یا اسی ہندی کلام کی وجہ سے جس کی صحت اور اصلیت آج کل معرض بحث میں ہے اور جو بعض موجودہ زمانے کے تنقید نگاروں کے خیال میں خسرو کا کلام نہیں ہو سکتا - لیکن جہاں تک خسرو کے ہندی شاعر ہونے کا تعلق ہے ان کے اپنے فارسی کلام میں ایسی متعدد شہادتیں موجود ہیں ' جن کو دیکھنے کے بعد کسی شک و شبہہ

کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور ان شہادتوں کو بہت اختصار کے ساتھ میں بیان کرنا چاہتا ہوں -

۱ - خسرو ہندوستان میں پیدا ہوئے - اس پر تقریباً سب تذکرہ نویس ہی متفق نہیں ہیں بلکہ مثنوی " نہ سپہر " میں خسرو صاف طور پر کہتے ہیں کہ :

ہست مرا مولد و ماوای و وطن

اس کے علاوہ ان کی ماں بلا شبہہ ہندی نژاد تھیں - اس لیے کہ اپنے نانا عمادالملک راوت عرض کا ذکر کرتے ہوئے وہ کئی جگہ ان کی سیہ رنگت اور ان کے پان کھانے کے شوق کا ذکر کرتے ہیں - گویا ہندی، خسرو کی مادری زبان تھی اور ظاہر ہے کہ انہیں اس پر پوری قدرت حاصل تھی - ہندی زبان کو ایسی اچھی طرح جانتے ہوے خسرو جیسے شاعر کے لیے اس میں شعر نہ کہنا بعید از قیاس ہے، خصوصاً جب کہ ان سے پہلے کے بعض فارسی شاعر مثلاً مسعود بن سعد بن سلمان ہندی نظم میں طبع آزمائی کر چکے تھے -

۲ - ان کے فارسی کلام میں بھی جگہ جگہ ہندی الفاظ اور جملے بہت سلیقے اور خوبی سے استعمال ہوئے ہیں - یہ مانا کہ خسرو نے زیادہ کثرت سے اس طرح ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک گنگا جمنی زبان میں نظم کہنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ اس قسم کی شاعری پر قدرت نہ رکھتے تھے یا ہندی شاعری کا انہیں شوق نہ تھا بلکہ خود ان کے قول کے مطابق اس قسم کی دو رنگی زبان میں شعر کہنا اسلوب فصاحت اور بلاغت کے خلاف تھا -

اور انہوں نے جو ایسے شعر کہے بھی تو ان کو اپنے فارسی دیوانوں میں جگہ دینا مناسب خیال نہ کیا، صرف نمونے کے طور پر چند اشعار کہیں کہیں، خصوصاً رباعی کی شکل میں، شامل کردیے مثلاً دیباچۂ غرۃ الکمال میں ایک شعر لکھا ہے جو فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا ہو سکتا ہے اور جو حسب ذیل ہے :—

آری آری همه بهاری آری ماری ماری بره که ماری آری

ایک رباعی یوں ہے :—

رفتم به تماشای کنار جوئے دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہای زلفت چه بود فریاد بر آورد که در در موئے۔

ایک اور رباعی اسی طرح ہے لیکن اس میں تیسرے مصرعے میں بجائے زلف کے خط کا ذکر ہے اور آخری الفاظ "در در موئے" کی جگہ "موری بابا" ہیں۔

۳۔ غرۃ الکمال کے دیباچے میں خسرو نے صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ انہوں نے ہندی نظم کہی تھی لیکن چونکہ ان کی نظر میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، اس لیے انہوں نے اپنے ہندی کلام کو کبھی جمع نہیں کیا بلکہ دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ خسرو کا یہ بیان بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بعد کسی شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خسرو نے اپنے ہندی کلام سے بے رخی برتی اور اسے مرتب نہیں کیا تو پھر کسی اور نے بھی یہ زحمت گوارا کی ہوگی یا نہیں کہ اسے جمع کیا جائے؟ بظاہر اس قسم کی کوئی کوشش خسرو کے زمانے یا اس کے کچھ عرصے بعد عمل میں نہیں آئی، جس کی وجہ یہ ہے کہ جو رویہ خسرو کا ہندی کلام کی طرف تھا وہی ان کے

ہمعصروں کا بھی ہوگا - اُس دور میں ' بلکہ اس کے بہت بعد
کے زمانے تک ' نہ صرف ہندی شاعری نے کوئی خاص ادبی
حیثیت اور اہلیت حاصل نہ کی تھی بلکہ فارسی داں طبقے
میں جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے '
فارسی نظم کے آگے ہندی شاعری کوئی وقعت نہ رکھتی تھی '
فارسی اول تو حاکموں کی زبان تھی اور دوسرے ادبی نقطۂ نظر
سے معراج کمال کو پہنچ چکی تھی - آفتاب کے آگے ستارے ماند
ہو ہی جاتے ہیں اور شمع کافوری کے مقابلے میں تیل کا ٹمٹماتا
ہوا دیا فروغ نہیں پا سکتا ' ہندی شاعری ابھی اپنے ابتدائی دور
میں سے گزر رہی تھی ' اس میں دلکشی ضرور تھی ' فارسی
کا سا شکوہ نہ تھا ' نمک تھا لیکن وہ شیرینی نہ تھی جس کی
چاشنی سے اس زمانے کے ادیبوں کے کام و دہن آشنا تھے - ایک
ایسی باندی تھی جس کے نوخیز حسن اور تازگی کی طرف
کبھی کبھی اس کے آقا کی نظر تحسین ضرور مائل ہو جاتی
ہے ' لیکن جو اس کے دل میں کبھی وہ جگہ حاصل نہیں کر سکتی
جو اس کی حسین اور شریف بیوی کو حاصل ہے - یا ایک
ایسا پھول تھی جو دیہات کے کسی کھیت میں اِدھر اُدھر کی
کھلی ہوئی ہریالی میں دلفریب معلوم ہوتا ہے لیکن جس پر
کسی گلچیں کی نظر اس ارادے سے نہیں پڑے گی کہ
اسے ایک گلدستے میں باندھ کر آرایش محفل بنائے - اسی
لیے میرے خیال میں جہاں اس میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا
کہ خسرو ہندی میں شعر کہتے تھے وہاں یہ بات بھی یقینی
ہے کہ ان کا ہندی کلام کبھی باقاعدہ طور پر جمع نہیں کیا گیا
اور اگر اس میں سے کچھ ہم تک پہنچا ہے تو وہ یا تو بعض

شوقینوں کی بیاضوں کی بدولت اور یا زبانی روایت کے ذریعے -

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندی کا وہ کلام جو خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ واقعی ان کا ہے یا نہیں ؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اس کلام کی نوعیت پر نظر ڈالنا چاہیے - پرانے تذکروں مثلاً آب حیات وغیرہ میں خسرو کے مفروضہ کلام کے متفرق نمونے ملتے ہیں' لیکن سنہ ۱۹۱۸ع میں کلیات خسرو کے سلسلے میں علی گڑھ سے خسرو کے چند رسائل کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں وہ تمام چیزیں بھی جو خسرو کے ہندی کلام کا جزو سمجھی جاتی ہیں ' شامل کر دی گئیں اور غالباً اسی زمانے میں بنارس سے ایک ہندی کتاب بھی '' خسرو کی ہندی کویتا '' کے نام سے شائع ہوئی - (۱) علی گڑھ کا مجموعہ جو جواہر خسروی کے نام سے موسوم ہے دو تین بہت قابل عالموں مثلاً مولانا رشید احمد صاحب سالم اور مولانا محمد امین صاحب چریا کوٹی کی زیر ادارت تیار کیا گیا تھا اور ان بزرگوں نے اس پر بہت عالمانہ تنقید اور تبصرہ بھی کیا ہے - ان مجموعوں میں ہندی (یا مخلوط ہندی اور فارسی) کی یہ چیزیں شامل ہیں ' ۱ - خالق باری ۲ - چیستان جس میں بوجھ اور بن بوجھ پہیلیاں ' کہ مکریاں ' دوسخنے ' انمیلیاں یا ڈھکوسلا وغیرہ ہیں - ۳ - ایک غزل جس میں ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی کا ہے - ۴ - چند ہندی کے دوہے - ۵ - کچھ گیت بطور نسبت ' قلبانہ وغیرہ -

(۱) دیکھیے ' آب حیات ص ۶۵-۷۱ ' خسرو کی ہندی کویتا ' مسرا بندھو وینود ج ۱ ص ۲۳۳-۲۸۰ ' وغیرہ -

خالق باری کے کل ۲۱۵ شعر ہیں اور یہی وہ تصنیف ہے جس پر حال کے زمانے میں بہت کچھ بحث ہوتی رہی ہے۔ مولانا محمد امین چریا کوٹی نے تمہید کے طور پر جو فاضلانہ مقالہ لکھا ہے اس میں اُنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے اور اس کے متعلق کسی شبہہ کا امکان نہیں۔ اُنہوں نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

۱ - یہ تصنیف ہمیشہ سے امیر خسرو کی طرف منسوب چلی آئی ہے اور اس قسم کی متصل روایت میں شک و شبہہ کرنے سے تمام تاریخی واقعات معرض شک میں آ جاتے ہیں۔

۲ - خالق باری کی بحریں ایسی شگفتہ اور اصول موسیقی کے مطابق ہیں کہ یہ کتاب خسرو ہی کے سے موسیقی دان شاعر کے ذہن اور قلم کی رہین منت ہوسکتی ہے۔

۳ - اس میں بعض ایسے لفظ مثلاً جیتل وغیرہ کا نام ملتا ہے جو خسرو کے زمانے سے متعلق تھے - (جیتل ایک سکہ تھا جو خسرو کے زمانے میں رائج تھا اور بعد میں متروک ہوگیا)

۴ - مثنوی کے آخر میں خسرو کا نام اس خوبی، شوخی اور بے ساختگی کے ساتھ آیا ہے کہ خالق باری کی تصنیف کا سوال بالکل حل ہو جاتا ہے۔

تقریباً اسی قسم کے خیالات کا اظہار بعض اور ادیبوں نے بھی کیا ہے اور سید مسعود حسن صاحب رضوی نے اپنے ایک مقالے میں ایک ایسے ہی مخطوطہ نصاب "اللہ خدائی" کا ذکر کیا ہے جس کے مصنف نے خسرو کی روح سے مدد مانگی ہے - گویا اس کے خیال میں بھی خالق باری جس کی وہ نقل

کرنا چاہتا تھا خسرو ہی کی تصنیف ہے - برخلاف اس کے لاہور کے فاضل استاد حافظ محمود شیرانی کی رائے ہیں یہ مثنوی خسرو کی تصنیف نہیں ہوسکتی ' اس لیے کہ اول تو اس میں عروض کی غلطیاں اور خامیاں موجود ہیں اور دوسرے ہندی الفاظ کی شکل کئی جگہ ایسی ہے جو خسرو کے زمانے میں نہیں تھی - ان متضاد رایوں میں سے کون قابل ترجیح ہے ؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے - لیکن موافق اور مخالف دلیلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خالق باری یا اس کا زیادہ تر حصہ امیر خسرو کی تصنیف ضرور ہے ' یہ دوسری بات ہے کہ امتداد زمانہ سے اس میں تصرف اور تحریف ہوتا رہا ہو اور بعض ہندی الفاظ کی شکل بدل گئی ہو - اس کی سب سے زیادہ معقول وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ تصنیف ہمیشہ امیر خسرو کی طرف منسوب رہی ہے اور خود مثنوی میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اس عام روایت کو غلط سمجھنے کے لیے کافی ہو اور دوسرے یہ کہ امیر خسرو کے زمانے میں اس قسم کے نصاب کی واقعی ضرورت تھی اور یہی ضرورت اس کی تصنیف کی محرک ہوئی -

اسی طرح وہ غزل اور دوہے بھی جو خسرو کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں بظاہر انہی کی تصنیف ہیں اور چونکہ ان کی تعداد بہت کم ہے اس لئے اور بھی یہ گمان غالب ہو جاتا ہے - جواہر خسروی میں صرف دو دوہے امیر خسرو کی تصنیف سے درج ہیں جو حسب ذیل ہیں :—

۱ - خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ

۲ - گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہونددیس

اور ان دونوں میں کوئی شہادت ایسی نہیں نظر آئی جو روایت عام کی تکذیب کرتی ہو -

لیکن جہاں تک پہیلیوں وغیرہ کا تعلق ہے یہ بات یقینی ہے کہ ان میں سے بعض تو واقعی امیر خسرو کی تصنیف ہوں گی اور بعض جعلی اور مصنوعی اس لیے کہ پہیلی ایسی چیز ہے کہ جو عام مذاق سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ بہت سی پہیلیاں خسرو کے بعد بنتی رہیں، جنہیں خسرو کی طرف منسوب کر دیا گیا ، لیکن اس قسم کی نسبت بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ امیر خسرو نے کچھ پہیلیاں ضرور لکھی ہوں گی - اس کا مزید ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ چیستان اور معمے کا خسرو کو خاص طور پر شوق تھا ، چنانچہ ان کے مرتبہ فارسی دیوانوں میں بعض رباعیاں پہیلیوں کی قسم سے ہیں اور اکثر ناموں اور تاریخوں کو بیرو اُنھوں نے معمے کی شکل میں لکھا ہے - جواہر خسروی میں جو ہندی پہیلیاں درج ہیں ، اگر انھیں غور سے دیکھا جائے تو میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے - مثلاً ہم یہ آسانی سے باور کر سکتے ہیں کہ یہ پہیلی خسرو نے کہی ہوگی :—

فارسی بولی آئی نہ ، ترکی ڈھونڈی پائی نہ
ہندی بولوں آرسی آئے ، خسرو کہے نہ کوئی بتائے

یا یہ کہ :

ایک نار ترور سے اتری ماں سوں جنم نہ پایا
باپ کا نام جو اس سے پوچھو آدھو نام بتایا

آدھو نام باپ کا خسرو کون دیس کی بولی
وا کا نام جو پوچھا میں نے اپنے نام نبولی

لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ پہیلی بھی خسرو کی تصنیف ہوگی :—

ہاتھ میں لیجے دیکھا کیجے - (آئینہ)

یا یہ :—

ایک نار وہ اوکھ کھائے جس پر تھوکے وہ مر جائے
اس کا پیا اسے چھاتی لائے اندھا نہیں تو کانا ہو جائے
(بندوق)

بھلا بندوق خسرو کے زمانے میں کہاں !

یا وہ پہیلی جو یوں شروع ہوتی ہے :—

چٹاخ پٹاخ کب سے ہاتھ پکڑا جب سے (چوڑیاں)

یا چلم کی یہ پہیلی :—

نئی کی ڈھیلی پرانی کی تنگ
بوجھو تو بوجھو نہیں چلو میرے سنگ

حقہ چلم خسرو کے زمانے میں کون جانتا تھا !

اسی طرح ڈھکوسلے ، دوسخنوں اور گیتوں کی تصنیف بہت مشتبہ ہے - اس لیے کہ ان میں بھی بعض جگہ ہندی عبارت ایسی ہے کہ جو یقیناً خسرو کے دور کی ہندی سے بہت مختلف ہے اور آج کل کی اردو زبان سے بہت مشابہ بلکہ حرف بحرف وہی ہے - غرض یہ کہ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اوپر بیان ہوئیں ہر معقول آدمی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ :—

۱ - خسرو نے ہندی شاعری میں طبع آزمائی ضرور کی اور اس لحاظ سے کہ اُنھوں نے عام زبان یا کوئی بولی کو اپنے خیالات

کے اظہار کا ذریعہ بنایا، ان کا شمار ہندی اور ایک حد تک اردو شاعروں کے سب سے پہلے دور میں کیا جا سکتا ہے - اگرچہ یہ ماننا ذرا مشکل ہے کہ ان کے "ہندی کلام کا حصہ فارسی کلام سے بہت زیادہ تھا - (۱)" اس لیے کہ خسرو ہندی شاعری کو محض تفریح اور تفنن طبع کی ایک شکل سمجھتے تھے اور انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہندی میں کوئی بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑ جائیں - یہ بات ان کے اُس بیان سے ظاہر ہے جو دیباچۂ غرۃ الکمال میں موجود ہے اور جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے - ان چند جزو کے علاوہ جن کا اُنھوں نے ذکر کیا ہے اُنھوں نے غرۃالکمال کی تکمیل کے بعد غالباً ہندی میں اور بہت کچھ لکھا ہوگا لیکن پھر بھی ان کا ہندی کلام حجم میں فارسی سے ہرگز زیادہ نہیں ہوسکتا -

۲ - بدقسمتی سے خسرو کا زیادہ‌تر ہندی کلام دستبرد زمانہ سے غارت ہوگیا - اس لیے کہ خود اُنھوں نے یا ان کے کسی ہم‌عصر نے اسے محفوظ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی - یہ بات قابل افسوس ہے کیونکہ اگر امیر خسرو کے کلام کا کوئی مستند مجموعہ اس وقت ہمارے پاس ہوتا تو اس سے ہندی اور اردو زبانوں کے ارتقا کی تاریخ کے مطالعے میں بیش‌بہا مدد مل سکتی تھی -

۳ - جو ہندی کلام اس وقت خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ ضرور مستند اور قابل اعتماد ہے لیکن کچھ حصہ ایسا بھی ہے کہ جو یقیناً فرضی اور مصنوعی ہے -

---

(۱) جواہر خسروی بحوالۂ ارحمٰی

اس لیے نہ تو آنکھیں بند کر کے یہ مان سکتے ہیں کہ وہ تمام پہیلیاں، کہ مکریاں، ڈھکوسلے وغیرہ جو جواہر خسروی میں درج ہیں خسرو کی تصانیف ہیں اور نہ ایک سرے سے ان سب کو جعلی فرض کرلینے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے - کسی مسلسل روایت کو جو صدیوں سے چلی آتی ہو اور جس کی صحت کے متعلق پرانے لوگوں کو یقین رہا ہو بغیر کسی خاص مخالف شہادت کے غیر معتبر نہیں سمجھنا چاہیے - خسرو تمام عمر دہلی میں رہے اور دہلی میں ان کا جو کلام زبان‌زد خاص و عام رہا ہے اس میں تصرف اور تحریف کا ہونا ممکن ہے لیکن اس کا یکسر باطل اور بے بنیاد ہونا ممکن نہیں ہے -

——: o :——

ب - خسرو بحیثیت استاد موسیقی

خسرو کی علم موسیقی میں مہارت کے متعلق کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے خود اس کا دعویٰ بہت صاف الفاظ میں کیا ہے اور ان کی یہ عادت نہ تھی کہ اپنے متعلق باطل دعوے کیا کرتے ؛ چنانچہ اس سلسلے میں ان کا یہ قطعہ جو " اربعہ عناصر دواوین خسرو " مطبوعۂ نولکشور پریس میں موجود ہے، دلچسپی سے خالی نہیں :—

حسن اخلاق از خردمندان توان کردن طلب
خر بود آن‌کو ادب جستن بسوی خر بود

بیخرد را عیب نتوان کرد در ترک ادب
عیب نبود مور بر تخت سلیمان گر بود

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنج سخن
علم موسیقی ز گنج نظم نیکو تر بود

زانکه این علمیست کز دقت نیاید بر قلم
و آن نه دشوار است کاندر کاغذ و دفتر بود

پاسخش گفتم که من در هر دو معنی کاملم
هر دو را سنجیده بر وزنی که آن بهتر بود

فرق می گویم میان هر دو معقول و درست
تا دهد انصاف آن کز هر دو دانشور بود

نظم را علمی تصور کن بنفس خود تمام
کو نه محتاج سماع و صوت خنیاگر بود

گر کسی بی زیر و بم نظمم فرو خواند رواست
نی بمعنی هیچ نقصان، نی بلفظ اندر بود

ور کند مطرب بسی هان هان و هون هون در سرود
چون سخن نبود همه معنی او ابتر بود

نای زن را بین که صورت دارد و گفتار نی
لا جرم در قول محتاج کسی دیگر بود

پس درین صورت ضرورت صاحب صوت و سماع
از برای شعر محتاج سخن پرور بود

نظم را حاصل عروسی دان و نغمه زیورش
نیست عیبی گر عروس خوب بی‌زیور بود

من کسی را آدمی دانم که داند این قدر
ور نداند پرسد از من ورنه نپرسد خر بود (۱)

اس قطعے میں ایک شعر موجود نہیں ہے جو بعض قلمی نسخوں میں ہے اور جو بجائے خود کافی اہمیت رکھتا ہے - یعنی

---

(۱) اربعۂ عناصر دواوین خسرو - ص ٢٥٦ ، ٢٥٧ -

(پاسخش گفتم الخ کے بعد) :—

نظام را کردم سہ دفتر ور بہ تحریر آمدی

علم موسیقی سہ دیگر بود ار باور بود

اس قطعے سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ اگرچہ خسرو نے موسیقی میں کوئی مستقل تصنیف نہیں کی ' انھیں اس علم میں بہت دسترس حاصل تھی ' خسرو کے اس بیان کی تصدیق اور روایتوں سے بھی ہوتی ہے اور جہاں ان کے متعلق بعض اور باتیں نسلاً بعد نسل مشہور چلی آتی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ انھوں نے موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ انھیں نایک کا لقب ملا تھا - پرانے لوگوں نے موسیقی دانوں کو ان کے کمال اور دسترس کے مطابق مختلف ناموں سے تعبیر کیا ہے ' سب سے چھوٹا درجہ 'گائن کا ہے ' اس کے بعد گندرب ' گنی اور پنڈت کا رتبہ ہے اور سب سے بڑا درجہ نایک کا ہے ' شبلی نعمانی نے اس سلسلے میں ایک قدیم سنسکرت کتاب سانک سوم کے فارسی ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے ایک روایت لکھی ہے ' جس کا مفہوم یہ ہے کہ خسرو نے اپنے زمانے کے ایک جگت استاد نایک گوپال کو نیچا دکھا کر نایک کا لقب حاصل کیا تھا - یہ فارسی ترجمہ عالمگیر کے عہد میں ایک امیر فقیراللہ نامی نے کیا تھا اور اس کا نام راگ درپن رکھا تھا - راگ درپن کی روایت جو شبلی نے " بیان خسرو " میں دی ہے یوں ہے :

" ان کے زمانے کا جگت استاد ' جو تمام ہندوستان کا استاد تھا ' نایک گوپال تھا اور اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لے کر چلتے تھے ' سلطان علاءالدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا

تو دربار میں بلایا - امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھتا ہوں ' نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے ' نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا - ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے ' گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا - اُن سے گانے کی فرمائش کی ' امیر صاحب نے کہا میں مغل (کذا) ہوں ہندوستانی گانا کچھ یونہی سا جانتا ہوں ' آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا ' گوپال نے گانا شروع کیا ' امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں ' پھر خود اس کو ادا کیا ' گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا امیر صاحب نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں ' غرض گوپال جو راگ راگنی اور سر ادا کرتا تھا امیر صاحب اس کو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے ' بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں ' اس پر جو گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا - " (۱)

راگ درپن کی یہ روایت ظاہر ہے کہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوسکتی بلکہ کسی کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے - روایت کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ امیر خسرو کسی راگ یا راگنی کو محض ایک دفعہ سن کر یاد کرلیتے تھے اور پھر اسے دوھرا سکتے تھے ' لیکن اس سے سوائے اس کے کہ ان کی قوت حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھی اور کوئی خاص بات قابل تعریف

---

(۱) بیان خسرو - صفحہ ۲۷ -

نہیں نکلتی ، بادشاہ کے تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھنا اور وہ بھی تنہا نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کے همراہ ، ایک عجیب مضحکہ خیز چیز معلوم ہوتی ہے ، علاوہ ازیں خسرو کے زمانے کے کسی مورخ نے یا خود اُنھوں نے اس واقعے کا کہیں ذکر نہیں کیا اور نہ ان کے زمانے کے کسی بڑے موسیقی‌دان کا نام نایک گوپال کہیں مذکور ہے ، برخلاف اس کے اکبر کے عہد میں اس نام کے ایک استاد کا پتہ چلتا ہے - (۱) اور کچھ عجب نہیں کہ مانک سوہل یا راگ درپن میں غلطی سے اسی نایک گوپال کو خسرو کا ہم‌عصر فرض کر لیا گیا ہو - اگرچہ خسرو کی اپنی تصانیف سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقابلے ان کے زمانے میں عام طور پر ہوا کرتے تھے اور اکثر یہ ہوتا تھا کے ایران یا خراسان وغیرہ سے جو بڑے بڑے موسیقی‌دان آتے تھے ان کا ہندوستان کے استادوں سے سامنا ہونے پر دونوں طرف سے اپنے اپنے ہنر کے جوہر دکھائے جاتے تھے اور بظاہر میدان ہندوستانی استادوں ہی کے ہاتھ رہتا - مثلاً اعجاز خسروی میں ایک جگہ خسرو نے خراسان سے کچھ موسیقی‌دانوں کے ہندوستان وارد ہونے کا ذکر کیا ہے اور ہندوستانی ماہران‌فن کو دعوت دی ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں آئیں تاکہ قمریان بالا کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ بہار ہندوستان میں پرند کیسے ہیں :—

که تا درست شود قمریان بالا را

که مرغ چون بود اندر بہار ہندوستان (۲)

---

(۱) دیکھیے ، Notices on Persian Poets (XXII)

(۲) اعجاز خسروی رسالہ دوم ص ۱۸۰ -

اس دعوت‌نامے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو خود بھی اس قسم کے مقابلوں میں دلچسپی لیتے تھے اور شریک ہوتے تھے -

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ خسرو کو ایرانی اور ہندوستانی دونوں اصولوں میں مہارت حاصل تھی، فارسی راگ راگنیوں کے نام بکثرت ان کی تصانیف میں موجود ہیں اور متعدد جگہ ہندی راگوں مثلاً الاون، دھرپد وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، یہ بات بھی غیر اغلب نہیں کہ اس فن میں اُنھوں نے اس قدر کمال حاصل کر لیا ہو کہ انھیں نایک کا قابل فخر لقب ملا ہو کیونکہ یہ روایت پرانی چلی آتی ہے اور بعض ایسے قابل اعتماد ناقدان فن مثلاً بادشاہ اودھ واجد علی شاہ نے بھی اس روایت کو معتبر تسلیم کیا ہے - چنانچہ اُنھوں نے اپنی تصنیف 'صوت المبارک' میں خسرو کا ذکر کرتے ہوئے ان کا نایک ہونا تسلیم کیا ہے - اگرچہ ان کے بیان کے مطابق خسرو صرف نایک خیال تھے، نایک دھرپد نہ تھے - (۱) اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں کس حد تک تصرف کیا اور کیا نئی چیزیں ایجاد کیں - بدقسمتی سے اس کے متعلق زیادہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا - ان کی ایجاد پسند طبیعت کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ جدھر بھی اپنی عنان توجہ کو موڑتے کوئی نہ کوئی نئی بات، کوئی انوکھی طرز ضرور پیدا کرتے، عام روایت تو یہ چلی آتی ہے کہ مشہور و معروف ہندوستانی ساز ستار کے موجد وہی تھے - اور یہ روایت اس لحاظ سے قرین قیاس بھی معلوم ہوتی

(۱) صوت المبارک : ص ۲۲ و ما بعد -
نیز دیکھیے آئین اکبری ج ۲ ص ۱۲۸-۱۲۹

ہے کہ خسرو کا زمانہ ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کے باھمی اختلاط اور آمیزش کا دور تھا - تعجب نہیں کہ ستار کی ایجاد جو وینا یا بین اور عود یا طنبور کے اصول اور ساخت کی ترکیب سے بنا ہے اسی زمانے میں ہوئی ہے اور اس ایجاد کا سہرا امیر خسرو ہی کے سر ہو ' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روایت باوجود اپنی قدامت کے اس بنا پر کمزور سمجھی جا سکتی ہے کہ امیر خسرو نے کہیں کسی اس نام کے ساز کا تذکرہ نہیں دیا حالانکہ اپنی مثنویوں ' مثلاً قران السعدین اور نہ سپہر وغیرہ میں اُنھوں نے بہت سے آلات موسیقی کے جو ان کے زمانے میں رائج ہے نام دیے ہیں اور ان کی ساخت اور وضع قطع کو بھی بیان کیا ہے - بہر حال ستار کی ایجاد بھی خالق باری کی تصنیف کی طرح مشتبہ ہے اور رہے گی ' اس لیے کہ ہمارے پاس قدیم روایت کی تصدیق یا تردید کے لیے کوئی صریح اور قطعی دلیل موجود نہیں ہے - لیکن اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی کہ امیر خسرو کسی نئے ساز کے موجد تھے تو یہ چیز تقریباً یقینی ہے کہ اُنھوں نے ہندوستانی راگ میں بہت کچھ تصرفات کئے تھے اور اس میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک نئے مسلک اور طریقے کے بانی سمجھے جاتے ہیں اور ہندوستان میں ان کے اس طریقے کے پیرو نہ صرف ان کے اپنے زمانے میں تھے بلکہ اب تک بھی موجود ہیں - چنانچہ صوت المبارک میں ' جس کا ابھی حوالہ دیا جا چکا ہے ' واجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ خسرو نے اپنی جدتوں سے ان قاعدوں اور ان سازوں کو جو ہزاروں برس سے رائج چلے آتے تھے تباہ و برباد کر دیا اور ان کے چلنے بہت بیباکی اور دیدہ دلیری

سے کلاونتوں کے منہ آنے لگے جو مہادیو کے زمانے سے پرانے اصول موسیقی کے استاد سمجھے جاتے تھے - گویا واجد علی شاہ کے خیال میں خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں ایک بڑا تغیر پیدا کر کے ایک نئے "اسکول" کی بنا قائم کی، اگرچہ ان کے خیال میں یہ انقلاب کچھ مفید یا قابل استحسان نہ تھا - اصول اور قوانین موسیقی کے متعلق کسی ایسے شخص کو رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ جو اس فن کی باریکیوں سے پوری واقفیت نہ رکھتا ہو - اسی لیے واجد علی شاہ کے اس بیان پر رائےزنی کا میں اپنے کو ہرگز اہل نہیں سمجھتا، لیکن ایک بات ہر اس شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی جس نے ہندوستانی علوم اور فنون کی ابتدا اور ارتقا کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا ہو اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر ایک علم اور ہنر ایک خاص حد کو پہنچ کر آیندہ ترقی سے محروم رہ گیا اس کا سبب ہندوستان کی سیاسی حالت ہو یا یہاں کی کوتاہ نظر قدامت پسندی، مادۂ ایجاد کی کمی یا مذہب سے غیر معمولی لگاؤ جو یہاں کے باشندوں کو ہر ایک علم اور ہنر کو مذہبی رنگ دے دینے پر مجبور کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کے تصرف یا جدت کو مذہب میں مداخلت کا مرادف قرار دیتا ہے، کچھ بھی ہو، واقعہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور علم موسیقی کو بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا - علم موسیقی کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ ہزاروں برس پہلے وہ نشو و نما پاکر کمال کو پہنچ گیا تھا اور اس میں کسی اصلاح یا رد و بدل کی گنجائش نہیں رہی، یقیناً تنگ نظری پر مبنی

ہے ۔ اس لیے بادی النظر میں اگر خسرو نے موسیقی کے پرانے اور فرسودہ اصول میں ترمیم اور اصلاح کی کوشش کی تو وہ اس کے لیے تحسین و آفرین کے مستحق ہیں ۔ انہوں کم از کم یہ خیال تو آیا کہ لکیر کے فقیر بن کر انہی مردہ تانوں اور انہی زنگ آلودہ تاروں کے لیے اپنی آواز اور اپنی انگلیوں کو وقف نہ کر دیں جو مہادیو کے زمانے سے جوں کے توں چلے آتے تھے بلکہ نئے نغموں اور صیقل شدہ تاروں سے فضائے ہندوستان میں ایک نیا بم و زیر ' ایک نیا ترنم پیدا کردیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی اور کہاں تک نا کام ' اس کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جو نہ صرف علوم موسیقی سے اچھی طرح آشنا ہوں بلکہ اس تنگ نظری اور ہٹ دھرمی سے بھی بالاتر ہوں جو اکثر ہمارے ہموطنوں میں پائی جاتی ہے ۔

راگ درپن میں کچھ تفصیل خسرو کی ایجادوں کی دی گئی ہے ' جسے شبلی نے بیان خسرو میں نقل کر دیا ہے ۔ اسی تفصیل کو میں بھی یہاں درج کرتا ہوں ' اگرچہ راگ درپن کے بیان کی صحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض چیزیں مثلاً قول ' ترانہ وغیرہ غالباً خسرو کی طرف صحیح طور پر منسوب کی جاتی ہیں ۔ جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اب تک بھی قوال عام طور پر خسرو کو اپنا استاد مانتے ہیں اور ان کی خاص طور پر عزت و تکریم کرتے ہیں :—

۱ ۔ مجیر : یہ راگ غارا اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے ۔

۲ - سازگری ' پوربی ' گورا ' کنگلی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ھے -

۳ - ایمن : ھنڈول اور نیریز سے مل کر بنا ھے -

۴ - عشاق : سارنگ اور بسنت اور نوا -

۵ - موافق : توڑی ' مالوی (کذا) ' دودگاہ و حسینی -

۶ - غنم : پوربی میں کچھ تغیر سے بنا ھے -

۷ - زیلف : کھٹ راگ میں شہناز کو ملایا ھے -

۸ - فرغنہ : کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ھے -

۹ - سرپردہ : سارنگ ' بلاول ' اور راست سے مرکب ھے -

۱۰ - باخرز : دیسکار میں ایک فارسی راگ ملایا ھے -

۱۱ - فردوست : کانہڑا ' گوری ' پوربی اور ایک فارسی راگ -

۱۲ - منم (منعم ؟) کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ھے -

اُن کے علاوہ قول ' ترانہ ' خیال ' نقش ' نگار ' بسیط ' تلانہ ' سوھلہ بھی ' بقول مصنف راگ درپن ' امیر خسرو کی ایجاد ھیں - مصنف نے یہ بھی لکھا ھے کہ ان راگوں میں سازگری ' باخرز ' عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ھے ' باقی راگوں میں کچھ یونہی ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ھے ' (۱)

---

(۱) صوت المبارک کی رو سے خسرو کے ایجاد کردہ راگ یہ تھے : ترانہ ' چھند ' پربند ' گیت ' قول ' قلبانہ ' نقش اور گل - اس سلسلے میں ملاحظہ کیجیے ' آئین اکبری ج ۲ ص ۱۳۸ - ۱۳۹ -

فہرست کتب

[یعنی ان کتابوں کے نام اور سن طباعت وغیرہ جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے یا جن کا اس میں حوالہ دیا گیا ہے -]

۱ - آب حیات : محمد حسین آزاد - دہلی سنہ ۱۸۹۶ع

۲ - افضل الفوائد : خسرو - دہلی سنہ ۱۸۸۷ع

۳ - آئینۂ اسکندری : خسرو - انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۹

۴ - آئین اکبری : متن - بلوخمان (Blochmann)

۵ - اخبار الاخیار : عبدالحق - دہلی سنہ ۱۳۰۹ھ

۶ - الاصطخری : مرتبۂ De Geoje

۷ - آتش کدہ : لطف علی آذر - بمبئی سنہ ۱۱۷۵ھ

۸ - ابن بطوطہ : مرتبہ Defremery - جلد سیوم

۹ - اعجاز خسروی : نولکشور سنہ ۱۸۷۶ع

۱۰ - انشاے امیر خسرو : انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۲۲۱

۱۱ - بابر نامہ : انگریزی ترجمہ اے - ایس بیوریج سنہ ۱۹۲۱ع

۱۲ - باغ و بہار : میر امن ، ترجمہ Forbes

۱۳ - بقیہ نقیہ : خسرو ، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷

۱۴ - بہارستان : جامی مرتبۂ Henri Masse سنہ ۱۹۲۵ع

۱۵ - تاریخ علائی یا خزائن الفتوح : برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر ۱۶۸۳۸ و لکھنؤ یونیورسٹی مخطوطہ

۱۶ - تاریخ فیروز شاہی : ضیاءالدین برنی -
(Bib. Indica text)

۱۷ - تذکرۃ الشعرا : دولت شاہ (مرتبۂ پروفیسر براؤن)

۱۸ - تحفۃ الصغر : خسرو ، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷

۱۹ - تاریخ رشیدی : مرزا حیدر دوغلات ، مرتبۂ
Ross & Elias

۲۰ - جواہر خسروی : علی گڑھ

۲۱ - حاجی خلیفہ (کشف الظنون) - Flugel

۲۲ - حیات خسرو : احمد سعید مارہروی

۲۳ - خسرو کی ہندی کویتا : بنارس سنہ ۱۹۲۱ع

۲۴ - دیوان حسن : برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر ۲۴۹۵۲ و انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۲۲۳ ، و مطبوعہ نسخہ حیدرآباد

۲۵ - راگ درپن : فقیراللہ ، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۲۰۱۷ و مخطوطہ لائبریری ندوۃ العلما بحوالۂ شبلی

۲۶ - سفینۃ الاولیا : دارا شکوہ ، آگرہ سنہ ۱۸۵۳ع

۲۷ - سیر الاولیا : میر خورد ، دہلی سنہ ۱۳۰۲ھ

۲۸ - شعر العجم : خسرو ، ج ۲ سنہ ۱۳۳۹ھ و بیان خسرو مطبوعۂ دہلی سنہ ؟ (افضل المطابع)

۲۹ - شیرین و خسرو : انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷ و علی گڑھ ایڈیشن

۳۰ - صوت المبارک : واجد علی شاہ ، لکھنؤ سنہ ۱۸۵۳ع

۳۱ - طبقات ناصری : مرتبۂ میجر ریورٹی (متن)

۳۲ - ظفر نامہ : یزدی -

۳۳ - عشیقہ یا خضر خان و دول رانی : خسرو ' انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۲۱۵ و ۱۱۸۹ و علی گڑہ ایڈیشن
۳۴ - غرۃالکمال : خسرو ' متعدد مخطوطات
۳۵ - فوائدالفواد : امیر حسن ' برٹش میوزیم مخطوطہ وغیرہ
۳۶ - قصیدۂ امیر خسرو : انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۹۵
۳۷ - قران السعدین : خسرو ' نولکشور سنہ ۱۸۸۵ع و علی گڑہ
۳۸ - قصۂ چہار درویش (فارسی) : برٹش میوزیم مخطوطہ ۸۹۱۷
۳۹ - کلیات خسرو ' نولکشور سنہ ۱۲۸۸ھ و متعدد مخطوطات
۴۰ - کلیات خاقانی : لکھنؤ ۱۸۹۸ع
۴۱ - لب الالباب : محمد عوفی ' مرتبہ پروفیسر براؤن
۴۲ - مجالس النفایس : نوائی ' ترجمہ
(M. Belin in Journal Asiatique)
۴۳ - مجالس العشاق : سلطان حسین مرزا ' لکھنؤ سنہ ۱۳۱۴ھ
۴۴ - مجنون و لیلی : خسرو ' لکھنؤ سنہ ۱۸۸۰ع و علی گڑہ ایڈیشن
۴۵ - مطلع الانوار : خسرو ' لکھنؤ سنہ ۱۸۸۴ع و علی گڑہ ایڈیشن
۴۶ - منتخب التواریخ : بدایونی ' متن (Bib. Indica)
۴۷ - نفحات الانس : جامی ' کلکتہ سنہ ۱۸۵۹ع
۴۸ - نہایۃالکمال : خسرو ' برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر ۲۵۸۰۷
۴۹ - نہ سپہر : خسرو ' انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷ و ۱۲۱۸ ' نیز پنجاب یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ
۵۰ - وسطالحیات : خسرو ' انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷ وغیرہ -
۵۱ - ہفت آسمان : (Bib. Indica)

۵۲ - هفت اقلیم : محمد امین رازی ، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۷۲۴

۵۳ - هشت بهشت : خسرو ، نولکشور سنه ۱۸۷۳ء و علی گڑھ ایڈیشن

۵۴ - تغلق نامه : خسرو ، حیدرآباد سنه ۱۹۳۳ء

۵۵ - خزانۂ عامرہ : غلام علی آزاد ، کانپور سنه ۱۹۰۰ء

۵۶ - خمسۂ نظامی : بمبئی ، ۱۲۶۵ھ ،

۵۷ - چهار مقاله : مع حواشی مرزا محمد

۵۸ - A Guide to Nizamuddin : Zafar Hasan

۵۹ - تاریخ فرشته : لکهنئو سنه ۱۸۶۴ء

۶۰ - اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز : نولکشور سنه ۱۸۷۶ء

۶۱ - Memoirs of Jahangir

(Or. Tr. Fund ترک)

۶۲ - Notices on Persian Poets Sir Gore Ousley ' 1846

۶۳ - The Chronicles of the Pathan Kings of Delhi : Thomas : 1871

۶۴ - Prolegomena to the Collected works of Khusrau : Nawab Ishaq Khan

۶۵ - براؤن :—

" Persian Literature under the Tartars

۶۶ - Life & Works of Amir Khusrau Calcutta, 1935